بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

مشرق کا موتی حُوروں کا مسکن

۱۴ مختلف مضامین کا گلدستہ

جس کی خوشبو آپ ضرور محسوس کریں گے

مصنف

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

اس کتاب کا کوئی بھی حوالہ یا حصہ، مصنف کی اجازت کے بغیر
الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں شائع نہیں کیا جاسکتا

قانونی مشیر: **محمد طاہر سعید رامے**

(ایم اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : مشرق کا موتی حوروں کا مسکن

مصنف : ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

کمپوزنگ : اے اقبال (M.Phil (Physics

ٹائٹل ڈیزائن: نوشین عثمان فاروق، شہیر عثمان فاروق
(لندن، اونٹاریو، کینیڈا)

پروف ریڈنگ: رضیہ ادریس. MLTS + B.Ed

خاص شکریہ: محمد سالار الٰہی

اشاعت : ستمبر 2021ء

تزئین واہتمام: حسن محمود

مطبع : حاجی منیر پرنٹرز، لاہور

تعداد : 1000

قیمت : -/ Rs. 1000

بیرون ملک: 50 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات: F-3 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0331-4489310

E-mail: ***nastalique786@gmail.com***

انتساب

میری اہلیہ محترمہ

اور

میرے پیارے بچوں کے نام

مزید

اظہار تشکر میں لکھی گئی

تمام شخصیات

کے نام

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

فہرست ابواب

✧	عرضِ مصنف	ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب	9
✧	تأثرات سیّد جواد حسین	سیّد جواد حسین	10
✧	تہذیب کتاب	پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف	17
✧	فنِ مصنف......میری نظر میں	پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور	20
✧	اظہارِ تشکر	ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب	24
پہلا باب	مشرق کا موتی۔حُوروں کا مسکن (ایک فقیر منش کی داستانِ مُلکِ شام)		29
دوسرا باب	دجلہ کی پری (ایک غریب الوطن کی کتھا)		55
تیسرا باب	دلی میں وہ سترہ دن (بھارتی دارالحکومت میں سترہ دن بسر کرنے والے پاکستانی کی کہانی)		99
چوتھا باب	قبر سے فریاد (ایک بدنصیب خاتون کی داستاں)		117
پانچواں باب	تم دیکھنا یہ کُتّے کی موت مرے گا (انسانی فطرت کے مختلف پہلو آشکار کرتی ایک بصیرت آموز کہانی)		145
چھٹا باب	اور۔۔۔بِن گو (Bingo) مر گیا (ایک کُتّے کی کہانی جس کا واسطہ کسی انسان سے پڑ گیا تھا)		159

ساتواں باب	تاریخِ تمباکو اور تمباکو سے علاج	169
	(تمباکو۔۔۔دوست بھی دشمن بھی)	
آٹھواں باب	گوشت، گدھے اور قصاب	179
	(گوشت خوروں کے لیے ایک دلچسپ اور جدید تحقیق)	
نواں باب	چائے کہانی	191
	(فوائد و نقصانات)	
دسواں باب	کالی ماتا کے پجاری	209
	(چرس اور نشہ۔۔۔ایک افسوسناک حقیقت)	
گیارھواں باب	ایک سفاک قاتل	231
	(سگریٹ نوش ہوش فرمائیں)	
بارھواں باب	جو ہم پر گزری	243
	(زندگی اور موت میں فیصلہ کن گھڑیاں)	
تیرھواں باب	میرے اعزازات	255
	(فیصلہ قارئینِ کرام خود کریں)	
چودھواں باب	پروازیِ بُغض	273
	(کذابیت پر ایمان رکھنے والے انسان کا رویہ)	
	کتابیات	296
	مصنف کی دیگر تصانیف اور زیرِ طبع تصانیف	298
	تعارف کتب	299

عرضِ مصنف

مشرق کا موتی خوروں کا مسکن نامی یہ کتاب میں نے اپنی بیماری سے قبل مکمل کر کے اس کا مسودہ سید جواد حسین (ریٹائرڈ) ڈائریکٹر Trade Development Authority of Pakistan ملتان اور پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف ڈین آف فیکلٹی آف لینگویجز، گورنمنٹ کالج آف سائنس، وحدت روڈ لاہور کو برائے معائنہ بھجوادیا تھا جس پر دونوں احباب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار اس کتاب میں شامل تحریروں کی شکل میں کیا تھا۔ پھر میں کرونا گزیدہ ہو کر سول ہسپتال بہاولپور میں زیر علاج رہا جو کہ ایک الگ داستان ہے۔ ہسپتال سے خروج کے بعد اپنے ہی گھر میں خصوصی قیدی نمبر 1 کی حیثیت سے یعنی کہ Self-Isolution میں تھا کہ دل کے معاملات نے سکون نہ لینے دیا۔ کبھی رات کے تین بجے باہم گلے مل کر چاروں شانے چت کر دیتا اور کبھی سر شام ہی اپنی فرعونیت اور طاقت دکھاتے ہوئے مجھے بیہوش کر دیتا وہ تو اللہ بھلا کرے میری اہلیہ محترمہ اور میرے بچوں کا جنہوں نے اپنی ہمت اور صبر سے بڑھ کر بہت بہادری سے میری تیمارداری کی۔ یہاں تک کہ کرونا کی دہشت بھی ان کے آگے ریت کا ڈھیر ثابت ہوئی۔ اللہ سُبحان وتعالیٰ ان سب کی عمر دراز کرے اور اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین! اس طویل عرصے کے دوران سید جواد حسین اور پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون! دونوں اُردو دانوں کے تبصرے میرے پاس امانت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کو مَن وعَن شاملِ تصنیف کیا جارہا ہے۔

یہ پے درپے جان لیوا دل کے معاملات کیونکر وارد ہوئے جبکہ میں نے تو کبھی نہ دل میلا کیا نہ ہی اپنے پاس رکھا نہ ہی کبھی دل کو سلگایا اور نہ ہی کبھی اس کو مدہوش کیا۔ واللہ عالم بالصواب!

اس کتاب میں شامل ہر مضمون اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور انشاء اللہ میرے پڑھنے والوں کے لیے بہت دلچسپ ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب
eenets@yahoo.com
11 جون 2021 بروز جمعۃ المبارک

تاثرات سید جواد حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غالباً ۲۰۱۲ء میں مجھے ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی کتاب ''فرشتے کی ایف آئی آر'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ اُن کی ۱۹۸۱ء تک کی سوانح عمری ہے۔ڈاکٹر صاحب سے میری شناسائی ۱۹۹۶ء سے ہے لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ ادریس آفتاب صاحب ایک اچھے لکھاری بھی ہیں۔اس کتاب نے اُن کی شخصیت کے نئے پہلوا جاگر کئے۔ زیرِ نظر کتاب ''مشرق کا موتی ۔۔۔حوروں کا مسکن'' اِن کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے جنھیں تین categories میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔سفر نامے: مشرق کا موتی حوروں کا مسکن، دجلہ کی پری، دلی میں وہ سترہ دن

۲۔صحتِ عامہ کے مسائل: چائے کہانی، کالی ماتا کے پجاری، گوشت گدھے اور قصاب، ایک سفاک قاتل، تاریخ تمبا کو اور تمبا کو سے علاج

۳۔متفرق مضامین: میرے اعزازات، اور بِن گو Bingo مر گیا، تم دیکھنا یہ کتے کی موت مرے گا، قبر سے فریاد، پروازی بغض۔ جو ہم پر گزری

''مشرق کا موتی......حوروں کا مسکن'' کے عنوان کے بارے میں اگر کہا جائے کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ حُسن وسچائی کا حسین امتزاج ہے۔ کیٹس (Keats) نے کہا تھا:

Beauty is truth, Truth is beauty; That is all we know on earth, and all ye need to know.

حُسنِ ازل نے خود حوروں کو یاقوت و مرجان کہا ہے یا پھر انھیں لولوء المکنون یعنی چھپے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دی ہے۔ حورانِ جنت کی ارضی شکلیں سرزمینِ شام میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ دمشق تو اس علاقے کا اہم ترین مرکزی مقام ہے۔اس کے اِردگرد کے علاقے کبھی شامات کہلاتے تھے۔ یہ سب

دولتِ حسن سے مالا مال ہیں۔ مصنف یہاں کے نسوانی حسن سے اتنا متاثر ہے کہ مضمون کا آغاز اور اختتام حسن کے بیان پر ہے۔ حسن بالخصوص نسوانی حسن کی تعریف مذہبی رجحانات رکھنے والے لوگوں پر گراں گزرتی ہے۔ اس لیے مصنف نے کئی مقامات پر ستائش حسن کے معاملے میں مدافعانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی بھرپور احساس ہے کہ وہ دنیا کے جس خطے میں وارد ہوا ہے اسے سرزمینِ انبیاء کہا جاتا ہے۔ افزائشِ نسل انسانی کی ابتداء اسی سرزمین سے ہوئی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہابیلؑ اور قابیلؑ دمشق میں قیام پذیر تھے۔ یہیں پہلا قتل ہوا اور یہیں ہابیلؑ کا مدفن ہے۔

شام تاریخِ انسانی کے تسلسل کا آئینہ دار ہے۔ مزارات اور قدیم عمارتوں کی شکل میں گزشتہ تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انبیاء علیہ السلام اور دیگر مشاہیر کے آثارات نے اس تاریخی ورثے کو محفوظ کر لیا ہے۔ مصنف نے تفصیل سے سب کا ذکر کیا ہے۔ مضمون کا صحیح لطف وہ شخص اُٹھا سکتا ہے جو مشرقِ وسطیٰ اور بحیرہ روم کے علاقوں کی تاریخ سے واقف ہو یا کم از کم وہاں کی سیر کی ہو۔ اس میں رومن، یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کا تذکرہ ہے جسے تاریخی شعور رکھنے والا قاری بہتر سمجھ سکتا ہے۔ لیکن یہاں کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے Asthetic sense چاہیے۔

''دجلہ کی پری'' کے نام سے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ایک طلسماتی کہانی ہے لیکن یہ تو حسن و شباب کی خوبصورت داستان ہے۔ مصنف کی ذاتی زندگی سے ناواقف شخص اسے محض ایک افسانوی سفرنامہ سمجھے گا جس میں تخیل اور حقیقت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ایسا ہی تاثر بجا طور پر مصنف کی آپ بیتی ''فرشتے کی ایف آئی آر'' کے مطالعے سے قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہ ایک ایسی سچی اور حقیقی سرگزشت ہے جس پر ہزار افسانے قربان ہوں۔ آپ بیتی میں بہت سے حسین اتفاقات ہیں۔ اس کے بیشتر کردار بقید حیات ہیں اور کسی نے ان کی تردید نہیں کی۔ یہ مصنف کی سچائی کا بین ثبوت ہے۔ 'دجلہ کی پری' ایک انتہائی خوبصورت اتفاقیہ ملاقات کا نتیجہ ہے۔ اس پر بھی افسانوی گمان ہے۔

James Hilton کے ایک خوبصورت ناولٹ Goodbye Mr. Chips اور دجلہ کی پری میں بیک وقت مماثلت بھی ہے اور اختلاف بھی۔ دونوں میں داستانِ محبت کا نقطہ آغاز ایک اتفاقیہ ملاقات یعنی Sudden encounter ہے۔ ناولٹ میں ایک بوڑھے استاد Mr. Chips کی ایک نوجوان، باصلاحیت اور خوبصورت خاتون Katherine سے ملاقات شادی پر منتج ہوئی۔ شادی کے بعد

کی مختصر رفاقت نہایت رنگین، دلچسپ اور حسین تھی۔ مگر جلد ہی کیتھرین مسٹر چپس کو داغِ مفارقت دے گئی۔ چپس کے پاس یادوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ دجلہ کی پری میں بھی مصنف کی اتفاقیہ ملاقات ایک ایسی قربت میں تبدیل ہوئی جسے مصنف آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ لبنیٰ کریم بھی کیتھرین کی طرح بہت جلد راہی ملکِ عدم ہوئی اور مصنف حسرت و یاس کے ساتھ اسے یاد کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں واقعات میں ایک striking contrast ہے۔ ایک داستان تخیلاتی ناولٹ ہے جبکہ دوسری حقیقت پر مبنی اور دو جیتے جاگتے، گوشت پوست کے، زندگی سے بھر پور کرداروں کی سرگزشت ہے۔ اول الذکر میں youth and age کا حسین ملاپ ہے جبکہ مؤخر الذکر میں دونوں شباب کی مستی میں مست ہیں۔

ان حقیقی واقعات کو مصنف نے جذبے کی سچائی اور حسنِ بے مثال کی سرمستی میں ڈوب کر رقم کیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ لیکن افسوس کہ انجام سوائے حسرت اور یادوں کے کچھ نہیں۔ گُر دحسینہ لبنیٰ کریم کی موت کی خبر مصنف کے لیے ایک سانحے سے کم نہ تھی۔ یہ ایک ذاتی نوعیت کی ایسی وارداتِ قلبی ہے جسے کوئی بھی شریف النفس اور حسن کا شیدائی بھلا نہیں سکتا۔ کہانی کے صرف دو مرکزی کردار ہیں، لبنیٰ کریم اور مصنف۔ یہ ایک ایسی داستانِ سفر ہے جسے ان دو کی قربت نے رنگین بنا دیا۔ اس سفر میں جب لبنیٰ کریم کچھ دیر کے لیے منظر سے غائب ہوتی ہے تو نہ صرف مصنف اپنے آپ کو تنہا اور مایوس محسوس کرتا ہے بلکہ قاری کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے جیسے بجلی چمکنے کے بعد مسافر صحرا میں بھٹکتا پھرتا ہے۔

''دلی میں وہ سترہ دن'' ایک روایتی قسم کی بے مزہ رودادِ سفر ہے جسے سفرنامہ کہنے میں تردد ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے دلی کا ذکر بے دلی سے کیا ہے۔ حقائق کا بیان پھیکا اور سپاٹ ہے۔ واقعات کے بیان میں مصنف کی جو ذاتی وابستگی اور جوش و جذبہ ہونا چاہیے تھا وہ مفقود ہے۔ شاید اس کی وجہ بھارتی عمال کا ناروا طرزِ عمل ہے جس سے بدمزگی پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ سفر کا اصل مقصد اپنے آباؤ اجداد کے شہر ہردوخان پور ضلع ہوشیار پور کو دیکھنا تھا۔ افسوس یہ خواہش تشنۂ تکمیل رہی۔

''چائے کہانی'' ایک مفصل اور مدلل مضمون ہے۔ چائے کی تاریخ اور اس کے فوائد اور نقصانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مضمون کے آخر میں مصنف نے لکھا ہے کہ ''چائے ایک ہربل میڈیسن ہے، اس کو بطور میڈیسن ہی استعمال کیا جانا چاہئے نہ کہ بطور خوراک''۔ میں اس بات سے کلی طور پر متفق ہوں۔ ارسطو نے Golden mean کا تصور پیش کیا جس کا مطلب افراط و تفریط سے اجتناب ہے۔ **خیر الامور اوسطھا** کا

اصول زندگی کے ہر میدان میں پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ چائے دنیا میں سب سے زیادہ پیا جانے والا مشروب ہے۔ اس پر بھی اس کا اطلاق از بس ضروری ہے۔

''**کالی ماتا کے پجاری**'' چائے کہانی کی نسبت یہ مضمون زیادہ فکر انگیز ہے کیونکہ اول الذکر میں چائے کے طبی فوائد ونقصانات کا ذکر ہے جبکہ کالی ماتا تو سراسر زہر ہے۔ یہ نہ صرف مضرِ صحت ہے بلکہ اس کے نشے کا عادی یعنی چرسی معاشرے کا ناسور ہے۔ چائے تو دنیا کے بیشتر ممالک کے معاشروں کا مقبولِ عام مشروب ہے اور تواضع کا ایک مستند استعارہ بن چکی ہے۔ لیکن کالی ماتا معاشرے کی تباہی کا باعث ہے۔ ہزاروں لاکھوں خاندان اس کی وجہ سے تباہ ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ مصنف نے انتہائی دلسوزی کے ساتھ چرس اور افیون کے نہ صرف مضرِ صحت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے بلکہ اپنے ناخوشگوار ذاتی تجربے اور عمومی مشاہدے کی بنیاد پر اس کے تباہ کن معاشرتی مضمرات بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مضمون کے آخر میں نوجوان نسل سے نشہ سے اجتناب کرنے کی دردمندانہ اپیل کی گئی ہے جو مصنف کے گہرے معاشرتی شعور کی عکاس ہے۔

''**گوشت، گدھے اور قصاب**'' میں پاکستانی معاشرے کے ایک بھیانک چہرے کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ من حیث القوم یہ ہماری بے حسی، لالچ اور سفلہ پن کی دردناک مثال ہے۔ کہنے کو ہم مسلمان ہیں لیکن اپنے مسلمان بھائیوں کو گدھے کا گوشت، مردہ گوشت، بیمار اور لاغر جانوروں کا گوشت، پانی ملا گوشت کھلا رہے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد گوشت کھانے کو دل نہیں کرتا۔ قرآن میں حلال اور طیب غذا کھانے کی تاکید کی گئی ہے۔ مگر ہمارے ہاں حلال اور حرام کی تمیز ہی ختم ہوگئی ہے۔ یہ مضمون حکومتی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مقامی، صوبائی اور مرکزی حکومت کو صحتِ عامہ کے مسائل کی پرواتک نہیں ہے۔ وہ ادارے جو pure food کو یقینی بنانے کے ذمے دار ہیں انتہائی کرپٹ ہیں۔ گدھے کا گوشت اور مردہ گوشت فروخت کرنے والے بے شمار لوگ گرفتار کیے گئے مگر کسی ایک کو سزا ملنے کی خبر نہیں پڑھی۔

''ایک سفاک قاتل (سگریٹ)'' اور ''تاریخ تمباکو اور تمباکو سے علاج''

ان دو مضامین کا موضوع تمباکو ہے۔ تمباکو کی تاریخ، تمباکو کے اجزاء کا سائنسی انداز سے تجزیہ اور اس کے کچھ فوائد پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن اس کے نقصانات نہایت مہلک ہیں۔ عجب ستم ظریفی ہے کہ prostitution قدیم ترین پیشہ ہے اور تمباکو نوشی قدیم ترین نشہ ہے۔ ایک اخلاقی طور پر بے حد

ناپسندیدہ ہے اور دوسرا انسانی صحت کے لیے زہر، قاتل ہے۔ لیکن پھر بھی حضرتِ انسان کسی بھی عہد میں ان کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔

''میرے اعزازات'' یہ مضمون مصنف کی بلند پایہ شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں تمام دوسرے کردار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مصنف کا ذاتی، معاشرتی رویہ، دوستوں سے دوستی نبھانے کی لگن اور انسانی ہمدردی کا زندہ ثبوت ہیں۔ میرے نزدیک قریب المرگ دوست کی یہ وصیت کہ اس کی میت قبرستان لے جانے سے پہلے ادریس کے گھر لے جائیں اور وہ عورت جس کی انہوں نے بجلی کے کرنٹ سے جان بچائی تھی۔ اُس کا شادی کے بعد یہ کہنا کہ وہ سسرال جانے سے پہلے اپنے روحانی باپ سے ملے گی. بہت بڑے اعزازات ہیں۔ اس میں یقیناً مصنف کی بے لوث خدمت اور محبت کارفرما ہے۔ مگر میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس طرح کے کام کئے ہیں لیکن اس نوعیت کی appreciation بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ بلکہ اکثریت کو تو ناشکرے پن کی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ادریس صاحب کے بارے میں قرآن پاک کی یہ آیت درج کر رہا ہوں، فیصلہ قاری خود کرلے۔

وَ تُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَاءُ

''اور۔۔۔بِن گو Bingo مر گیا'' اس مضمون میں دو نکات قابلِ ذکر ہیں۔ اول ایک animal lover نے عملی طور پر ایک مردہ کتے کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کی اور اسے بچانے میں کامیاب ہوا۔ مصنف کو نہ صرف انسانوں سے ہمدردی ہے بلکہ انہوں نے جانور سے محبت کا ایک شاہکار کارنامہ سرانجام دیا۔ دوم اس مضمون میں Bingo کے سابقہ مالک کی بیمار کتے سے عدم دلچسپی اور بے حسی کو بے نقاب کیا گیا ہے بلکہ اس کی لالچ، خودغرضی اور ناشکرگزاری کو بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔ مصنف نے سات ماہ کتے کو اپنے پاس رکھا۔ کتا اُن سے بے حد مانوس ہو گیا۔ جب سابقہ مالک کو اس کے صحت یاب ہونے کی خبر ملی تو وہ اسے مصنف سے واپس لے گیا کیونکہ وہ اب اسے ایک معقول قیمت پر بیچنا چاہتا تھا۔ اُس نے مصنف کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ البتہ مصنف نے پیشن گوئی کی کہ کتا وہاں زندہ نہیں رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔ نہ جانے مصنف کے نصیب میں کتنی حسرتیں اور لکھی ہیں۔

''تم دیکھنا یہ کتے کی موت مرے گا'' اور **''قبر سے فریاد''** ان دو مضامین میں ایک بدبخت مرد اور ایک بدنصیب عورت کی زندگی کے حالات مرقوم ہیں۔ دونوں کے والد نہایت متقی، پرہیزگار اور شریف النفس

انسان تھے۔ مگر یہ دونوں انسانی پیکر میں مجسم شیطان ہیں۔ دونوں دھوکے باز، مقدمہ باز، پولیس کے ایجنٹ، منشیات اور اغوا کی کاروائیوں میں ملوث رہے۔ دونوں میں اخلاقی اقدار نام کی کوئی شے نہیں۔ دونوں کا انجام نہایت برا ہوا۔ عبدالمالک میٹرک کرنے کے بعد پولیس کی مدد سے منشیات اور ناجائز مقدمہ بازی کے دھندے میں ملوث رہا۔ اس دوران اسے لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھی غیر قانونی طریقے سے دولت کمائی۔ کچھ عرصے کے لیے اپنی دولت کی نمود و نمائش کے لیے بائی روڈ پاکستان آیا۔ لوگوں کو لندن لے جانے کا جھانسہ دے کر بہت سی رقم بٹوری۔ واپس لندن جا رہا تھا کہ راستے میں ایران سے گزرتے ہوئے منشیات کے جرم میں دھر لیا گیا۔ ایرانی عدالت سزائے موت سنانا چاہتی تھی لیکن معجزانہ طور پر ایک اعلیٰ شخصیت کی سفارش پر ایرانی حکومت نے اسے ملک بدر کر کے پاکستان دھکیل دیا۔ یہاں آ کر پھر وہی کرتوت حتیٰ کہ جعلی دستاویزات کے ذریعے اپنے والد اور بھائیوں کی زمین جائداد اپنے نام منتقل کرا لی۔ بھائیوں نے مقدمہ کر کے جائداد واپس لے لی۔ لیکن اس نے اپنے بوڑھے عبادت گزار باپ کو الیکٹرک شاک لگانے کی دھمکی دے کر جائداد اپنے نام کرانے کے لیے زبردستی کاغذات پر دستخط کرا لئے۔ باپ نے بددعا دی کہ ’’دیکھنا یہ کتے کی موت مرے گا‘‘۔ تھوڑے عرصے بعد ہی زمین کے تنازعہ میں مخالف پارٹی نے اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش روڑی یعنی گندگی کے ڈھیر پر پھینک دی جسے رات بھر کتے نوچتے رہے۔ والد کی بددعا قبول ہوئی۔

خالدہ ایک بدنامِ زمانہ عورت تھی۔ اہلِ محلّہ اس سے خوفزدہ تھے۔ اس کی ایک شادی کی طلاق ہوئی۔ دوسری شادی ایک ڈاکٹر سے کی۔ اُس سے بچے بھی ہوئے لیکن اس سے بھی طلاق لے لی۔ کیونکہ اس اثناء میں اس نے بہاولپور کے امیر کبیر زرگر عبدالشکور سے شادی کر لی۔ جو اس کے عشق میں والہانہ طور پر گرفتار ہوا۔ زرگر نے اپنی بیوی کو جس سے بچے بھی تھے طلاق دی۔ خالدہ نے ڈاکٹر سے طلاق لے کر زرگر سے شادی کر لی۔ تین چار بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ شادی انجام کار زرگر کی اخلاقی اور مالی تباہی کا باعث بنی۔ مالدار زرگر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ خالدہ کے بیٹوں نے اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ بالآخر زرگر نے بھی اسے طلاق دے دی۔ اس کی زندگی کے آخری ایام انتہائی تنگدستی اور اور ذلت میں گزرے۔ اُس کی وفات کے وقت اس کا کوئی بیٹا اس کے پاس نہ تھا۔ مصنف سے چونکہ اس کی پرانی جان پہچان تھی۔ اس لیے اس کی منت سماجت اور وصیت پر اس کے مرنے کے بعد مصنف نے اس کی تجہیز و تکفین

کا بندوبست کیا۔عبدالمالک اور خالدہ کی داستان عبرت ناک ہے۔جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔آخرت میں جو ہونا ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ بسا اوقات اللہ تعالیٰ ایک بدکردار اور بدقماش انسان کو اس دنیا میں بھی نشانِ عبرت بنا دیتا ہے۔

''پروازیِ بغض'' مضمون کے آخر میں راقم کا تبصرہ پہلے سے موجود ہے۔اس پر مزید لکھنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھتا۔البتہ پروفیسر صاحب کی ذاتی زندگی کے جو احوال سامنے آئے ہیں اُن پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں یہ بازی گر دھوکہ کھلا

ڈاکٹر ادریس صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ نہ صرف بصیرت افروز ہے بلکہ دلچسپ بھی ہے اور یہی ادب کی مسلمہ تعریف ہے کہ

It teaches while it pleases

ڈاکٹر صاحب نے کہیں بھی didactic ہونے کی شعوری کوشش نہیں کی لیکن ایک سمجھ دار قاری کے لیے اس میں بہت سا فکر انگیز مواد موجود ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مضامین کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

سید جواد حسین
ڈائریکٹر (ریٹائرڈ)
TDAP، ملتان

تہذیب کتاب

میری تاریخ پیدائش تو 14 مارچ 1946 اور جائے پیدائش دہلی ہے، لیکن پاکستان بنتے ہی میرا گھرانا بہاول پور منتقل ہو گیا تھا۔ دو سال کی عمر، یعنی 1948 سے تا حال گویا بچپن سے بڑھاپے تک، تمام مراحلِ حیات یہیں طے ہوئے۔ مختلف اوقات میں صرف چند برس چھوڑ کر تمام تر تعلیم و تربیت بہاول پور کے ہی معروف تعلیمی اداروں میں ہوئی۔ پھر ملازمت، درس و تدریس کے لیے میں بہاول پور ہی کے قدیم کالجوں اور یہاں کی یونیورسٹی سے منسلک رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تیرہ چودہ برس پرائیوٹ تعلیمی اداروں سے وابستہ رہا۔ یہ شہر اب میرا وطن ہی نہیں بلکہ جنم بھومی کی طرح پیارا ہے۔ تعلیم و تدریس سے منسلک ہونے کے سبب یہاں کے ادب، ادیبوں اور ادبی تنظیموں سے گہرا تعلق رہا۔ ایسے میں میرے ایک عزیز دوست صادق پبلک سکول کے اردو کے استاد جناب قدرت اللہ شہزاد نے بہاولپور کے ایک ادیب کی خودنوشت سوانح عمری کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بڑی تعریف کی۔ کتابیں تو میرا عشق ہیں، تعجب ہوا کہ یہ کتاب میری نظر سے کیوں نہیں گزری۔ قدرت اللہ شہزاد کی محبت اور سعادت مندی کہ دوسرے ہی روز وہ کتاب پڑھنے کو دے بھی گئے۔

کتاب: "فرشتے کی ایف آئی آر"۔

مصنف: ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب۔

نام جانا پہچانا سا لگا۔ کتاب پڑھنی شروع کی۔ بڑا سادہ اور دلکش اندازِ بیان کیونکہ حقیقت افسانے سے زیادہ پرکشش ہوتی ہے۔ ایک تو بیان کی سادگی اور دوسرے افسانوں کی طرح کے حقائق گویا تحریر دو آتشہ ہو گئی۔ چار سو صفحات سے زیادہ ضخامت کی یہ کتاب دن رات میرے ہاتھ سے نہ چھوٹی جب تک پوری طرح نہ پڑھ لی۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ میرے ہم شہر ہی نہیں، پرانے شہر بہاول پور کے ہم محلّہ اور چھوٹے بھائی کے کلاس فیلو ہونے کے باوجود میرے تقریباً ہم عمر ہیں۔ عام قاری کے لیے تو یہ کتاب دلچسپ اور سبق

آموز ہے کہ ان کے حالات پڑھ کر نامساعد حالات میں جرات و ہمت کا درس اور آگے ہی آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے اور جن افراد کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر کو میں بھی بخوبی جانتا ہوں، یوں، گویا اس کتاب کے بیان کردہ حقائق کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس آپ بیتی کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اُن کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کی جلائی ہوئی ناروا آگ کی بھٹی میں جل کر راکھ کا ڈھیر بننے کی بجائے کندن بن گئے اور ان کے بھائی کے منفی رویوں نے جہاں ان میں انسانی شیطانیت سے نفرت پیدا کی۔ وہاں اعلیٰ اقدار سے محبت بھی رگ رگ میں بھر دی۔ پیش نظر مضامین بھی انہی اعلیٰ انسانی اوصاف کے عکاس ہیں۔

اپنے ابتدائی دو مضامین میں وہ بطور سیاح ابھرتے ہیں۔ فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر تک جغرافیے کے جن باکمال استاد پروفیسر سید اشرف علی مرحوم سے یہ مضمون میں نے پڑھے ان کا فیضان ہے صرف چوبیس ہزار میل قطر کے اس مختصر کرّہِ ارض بر اعظم دو برفانی اور تین گرم سمندروں کی تفصیلات اور ان کے شہر میرے سامنے ایسے ہی ہیں جیسے میرے ہاتھ کی لکیریں! مصنف نے شام، عراق اور ایران کی سیاحت کے ذکر میں انسانی حسن کا تذکرہ کیا ہے واقعی پوری دنیا میں انسانی خصوصاً نسوانی حسن میں مشرقِ وسطیٰ کے یہ مما لک بے مثال ہیں۔ ویسے تو اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں حسن بکھرا پڑا ہے۔ لیکن انبیائے کرام کی سرزمیں ملک شام کو دنیا میں حسن و جمال کا مرکز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مصنف نے اسے جہاں دیکھا سراہا ہے۔ لیکن اس جمال پرستی کے ساتھ وہ انبیائے کرام کے مزارات کی حُرمت اور دیگر نامور مقدس ہستیوں کے عشق و محبت کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ لہٰذا ان مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ حسن و جمال کی تفصیل میں انہوں نے تقدس کے پیشِ نظر محتاط روِش اختیار کی ہے۔ لیکن بغداد میں دجلہ کی پری کے تذکرہ میں رومانویت قدرے بے باک نظر آتی ہے۔ بندر عباس سے اپنے حسین و جمیل گائیڈ کے ساتھ 1966ء کی دہائی میں مچھیروں کی قدیم بستی "دوبئ" کا سمندری سفر بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ البتہ انڈیا میں اپنے آبائی شہر ہوشیار پور دیکھنے کے شوق میں دہلی کا سفر اختیار کیا تو ہندو بنیا ذہنیت سے وہ اتنے بددل نظر آتے ہیں کہ وہاں کی بیشتر تاریخی عمارات کی تفصیل خود بیان کرنے کی بجائے قارئین کو سرسید کی تصنیف "آثار الصنادید" پڑھنے کا مشورہ دے کر بات ختم کر دیتے ہیں اور بوجہ ہوشیار پور کا بھی پروگرام منسوخ کر کے اپنے وطن پاکستان میں آکر سکون کا سانس لیتے ہیں۔

ادریس صاحب کو انسانیت سے پیار ہے۔ نوجوان نسل کو بگڑتا دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں۔ جبکہ

طبِ قدیم اور طبِ جدید کی روشنی میں منشیات کے مضمرات پر کئی قیمتی مضامین اسی جذبے کے تحت تحریر کیے ہیں کہ شاید براہ راست یا بالواسطہ ان نوجوانوں تک یہ باتیں پہنچیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی راہ راست پر آ جائے تو ان کی کاوشیں ان کے لیے اجرِ عظیم کا سبب بن جائیں۔ ان کے موجودہ مضامین کا سب سے زیادہ موثر حصہ وہ ہے جس میں ایک بدقماش عورت کا انجام دکھایا ہے جو اسی شہر کے گلی کوچوں سے متعلق ہے۔ اسی طرح ماں باپ اور خاندان کا ایک لالچی نوجوان کس طرح ان کی بربادی کا سبب بنا اور خود بھی نیک ماں باپ کی بددعاؤں کے زیر اثر کتے کی موت مرا۔ عبرت کی ان سچی داستانوں کی حقیقت نے مجھے بھی رُلا رُلا دیا۔ "بِن گو" ان کی جانوروں سے محبت کا ایک انمول واقعہ ہے۔ ان کے مضمون میرے اعزازات میں بہت سی حکایات ایسی ہیں کہ ان کی شخصیت اس شعر کے مصداق نظر آتی ہے:

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

ان کی سوانح عمری اور موجودہ تحریروں کو پڑھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی کہ وہ مسلکوں کے تعصب سے پاک سچے عاشقِ رسول ﷺ ہیں۔ ان کا یہ عشق اس بناء پر ہے کہ وہ ہستیٔ عظیم زندگی کی اعلیٰ اقدار اور ارفع انسانی اوصاف کا مرقع ہے۔ گویا مصنف کی سیرت کی خوبیاں اسی نور سے منور ہیں جو ان کی تحریروں میں جھلک رہی ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ان کی یہ تحریریں بھی بصد شوق پڑھی جائیں گی اور معاشرے کی ظلمتوں میں اجالا بن کر چمکیں گی۔

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف
سابق صدر شعبہ اردو
گورنمنٹ ایس۔ای کالج بہاولپور

فنِ مصنف۔۔۔میری نظر میں!

زندگی ایک کینوس کی مانند ہے جبکہ احساسات و خیالات سے کشید کئے گئے تجربات اس کینوس میں قوسِ قزح کے سبھی رنگ بھرنے کے لیے ہوا کرتے ہیں۔کسی بھی شخص کو زندگی کی جس قدر مختلف جہات میں کام اور اہتمام کا تجربہ حاصل ہوگا اُسی قدر اُس مصور کی بنائی گئی تصویر سے رنگ اور آہنگ کشید کرنے کے بہتر اور وافر مواقع بھی موجود ہوں گے۔بعین ہی ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی زندگی بھی بچپن سے آج تلک جہدِ مسلسل اور تلخ و شیریں نت نئے تجربات کے خروش سے شاد و آباد چلی آ رہی ہے۔

ادریس احمد آفتاب نے زندگی کے ہر موڑ پر زندہ دلی کو ساتھ رکھا اور اسی زندہ دلی کے ساتھ انھوں نے حیاتی کی کڑی دھوپ میں ''سن سٹروک'' سے بچاؤ جبکہ دوسرے ہی لمحے ''سنو فالنگ'' سے ٹھٹھرنے اور منجمد ہونے کی بجائے اپنی جندڑی کو گرمئی شوق سے لیل و نہار کیے رکھا۔ویسے بھی تو یہ زندگی دانش کدوں سے لے کر فقراء کے تکیوں، عاشق کی سسکیوں جبکہ محبوب کی دلربائیوں اور محبت کی آشنائیوں سے ہوتی قرطاس و قلم، علم و حکمت کے آبداروں کے دور اُفق تلک پھیلی دامن کشادہ بکھری پڑی ہے۔جو لوگ قلم کے ذریعے زندگی کے پیرہن کو دل آویز نقش و نگار میں دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں وہی لوگ ہر لمحہ زندگی اور اہلِ زندگی کے دامن خوشیوں سے لبریز دیکھنا چاہتے ہیں۔

ادریس احمد آفتاب کو درحقیقت زندگی کو زندہ رکھنے کا ہنر آتا ہے۔آپ کی تقریر، تحریر، تصویر سے لے کر خواب بُننے اور ان کی تعبیر، اوڑھنے بچھونے، میل ملاپ اور برتاؤ تک میں ایک خاص ترتیب، نفاست، نظم و ضبط کا رنگ واضح طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔یہ سب کچھ حُسن نہیں تو اور کیا ہے؟ اُن کی تحریر اگر سبق آموز ہے تو اُن کی باتوں سے خوشبوئیں کشید کی جا سکتی ہیں۔زندگی میں ہر طرح کے نشیب و فراز، اونچ نیچ اور طور طریقوں سے واقف لکھاری جو کچھ بھی دیکھے گا اور جب بھی اُسے ضبطِ تحریر میں لائے گا تو وہ تب بھی ''مشرق

کا موتی خُوروں کا مسکن''نہیں لکھ پائے گا کیونکہ اُسے دجلہ کی پری، چائے کہانی، دلی میں وہ سترہ دن، کالی ماتا کے پجاری، گوشت گدھے اور قصاب، ایک سفاک قاتل (سگریٹ)، تمبا کو کہانی، میرے اعزازات، قبر سے فریاد، پروازی بغض کے روح پرور تجربات سے بہرہ مند ہونے کے لیے کئی جنم درکار ہوں گے۔ سات جنموں کی کہانی کسی کے اپنے بس کا روگ تو ہوا نہیں کرتی!

سفر شرط ہے زندگی کے لیے! یہ کس قدر عجب ماجرا ہے کہ زندگی تو ہم سب ہی گزارتے ہیں اور کم وبیش سفر بھی ہر شخص کے حصے میں آتا ہے لیکن زندگی کو گزار دینا اور بھرپور طور پر لمحہ بہ لمحہ چائے کی دور کہیں کسیلی میٹھی لب سوزیاں ہر ایک کے مقدر میں نہیں ہوا کرتیں۔ ادریس احمد آفتاب زندگی کے اس سفر میں جذبات کے ڈھیروں رنگ بکھیرنے کے عمیق تجربات سے آشنا ہو کر بھی تھک کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بجائے حسین یادوں کے جھرمٹ میں ہمیں بھی رقص وسرور کی دعوت دیتے نظر آئے۔

سفر وسیلہ ظفر ہوا کرتا ہے اور طرفہ تماشا دیکھئے کہ مصنف سفر کے ہر موڑ پر ایسا ظفر مند ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ دجلہ کی پری کی ہم رکابی میسر آتی ہے اور اس رفاقت میں مصنف کے اسلوب کو داد دینا پڑتی ہے کہ وہ اپنی نظروں کے تیر، لبوں کی مٹھاس اور پیار کی آس و پیاس کے نازک مواقعوں پر قاری کو بھی ان رومانوی، طلسمی بھول بھلیوں سے خوب لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کرتا ہے۔ مصنف کے ہاں سچ پیار میں ڈھل کر جب رقص کرتا ہے تو زندگی کے تمام عکس جھومتے رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ادریس احمد آفتاب کے ہاں سچ اور جھوٹ میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عمومی زندگی میں بھی ''ہاں'' سے مراد جی ہاں ہی ہے جبکہ ''نا'' سے مراد قطعی انکار ہوتا ہے۔ آپ اثبات میں ایسے ہیں جیسے کھجور اپنے پیڑ پر پک کر نرمی اور مٹھاس کے سبب ٹپک پڑے جبکہ انکار کے موقع پر آپ سرتاپا بکائین اور کوڑ ھ تمہ بن جاتے ہیں۔ حالانکہ رومانوی دنیا کے باسی اس قدر کڑوے کسیلے نہیں ہوا کرتے لیکن ادریس احمد آفتاب حقیقی دنیا کے اُس رومانوی کردار کی نسل کے فرد ہیں جو جنگ اور محبت میں بھی مکمل SOPs(Standard operating procedures) کا خیال رکھتے ہیں۔ حق کی تلاش اور حق گوئی ہر عہد میں مشکل ہی رہی ہے۔ لیکن ان کے ہاں ایسا نہیں ہے۔

آپ کی تحریر میں سب سے زیادہ پرکشش ونمایاں چیز اندازِ تحریر، اسلوبِ بیاں اور جملوں کی بُنت ہے۔

آپ کے تمام مضامین میں ایک اچھوتا پن نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ نے زندگی کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپ کی تحریر اور تقریر کے ہر جملے میں کم و کاست نیا پہلو سامنے آتا ہے جو بڑا سچا، کھرا، نرالا اور محترم ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے وطن، وسیب شہر، بازاروں اور یہاں کے بسنے والوں کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھنا اور اُن سے برتاؤ کرنے کا ہنر، سلیقہ اور طریقہ خوب آتا ہے۔ ان کے بعض جملے پرندوں کی چہکار اور شاخِ گل کی مہکار ایسے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے ہاں ابہام نگاری نہیں بلکہ جس بھی شے کا ذکر کرتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ آپ کو پڑھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہی چلے جائیں۔ جس کردار کو موضوع بناتے ہیں اُس کی فیچر نگاری میں سچائی کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ادریس احمد آفتاب لکھاری کے منصب اور دائرہ فکر و جمال کی تمام جغرافیائی حدود (لائن آف ڈیمارکیشن) متعین کرتے ہوئے پیش قدمی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ادریس احمد آفتاب رواں دواں قلم کے دھنی ہیں۔ اُن کو پڑھتے ہوئے آپ انہیں اپنے آس پاس مختلف خوشبوئیں لگائے گھومتا جھومتا محسوس کریں گے۔ یہ اُن کی تحریر میں موجود دھنک رنگوں کا کمال ہے کہ ان کا ہر ایک مضمون مسکراتا اور جی کو لبھاتا نظر آتا ہے۔

مطالعہ کتب، سیاحت اور فلم بینی، علوم و فنون کی اصل سے واقفیت کے بنیادی اجزاء شمار ہوتے ہیں۔ کتاب آپ مستعار لے کر یا کسی کتب خانے میں بیٹھ کر پڑھ آتے ہیں۔ فلم بھی آج با آسانی ہماری دسترس میں ہے تاہم سیاحت روز بروز ہماری مُٹھی سے پھسلتی جا رہی ہے لیکن ادریس احمد آفتاب نے شوقِ آوارگی اور فلم بینی اُس مہنگے ترین دور میں کیں جب یہ سب کچھ خاصا دشوار گزار ہوا کرتا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو اپنی زندگی کو ایک فلم اور خود کو ایک فلمی کردار بنا کر اپنے ہی سٹوڈیوز میں فلما کر وہ سب کچھ دیکھا، پرکھا اور بڑی بہادری سے اس فلم کو ہمارے سامنے کتاب کی شکل میں براڈ کاسٹ بھی کر دیا۔

اس بے باکی میں اُن کی تمام جمالیاتی حسوں کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ جس دلکش اسلوب اور دلآویز پیرائے میں انھوں نے یہ سب کچھ ہمارے سامنے ''ڈسپلے'' کیا مجال ہے کہ اس میں کوئی جھول یا عدم توازن نظر آئے! اس لیے کہ وہ خود بھی دل پذیر اداؤں اور پر کشش شخصیت کے حامل گوشت پوست کے انسان ہیں۔ اکہرا ابلاغ ان کے حسن کا پہلا تیر ہے۔ اُن کی آنکھیں بولتی ہیں۔ لب جھپکتے ہیں اور جی مچلتا ہے۔

ادریس احمد آفتاب کی تحریروں میں چاشنی زندگی کی تلخیوں سے کشید کی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریر میں جمال بھی اپنے جاہ وجلال کے ساتھ کمال کی بلندیوں پر متمکن نظر آتا ہے۔یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ پریوں کا ہم رکاب ہونے کے لیے کتنے بڑے بڑے دیوؤں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہےاور یہ کہ پری اگر دجلہ کی ہواور سیف صحرائے چولستان کا واسی تو ایسے میں عشق ومستی کے اس سفر میں صعوبتیں بھی اپنی تمام ترافتادوں کے جلو میں ساتھ آتی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا

ایسوسی ایٹ پروفیسر۔شعبہ میڈیا سٹڈیز

ڈائریکٹر کمیونٹی براڈ کاسٹ ریڈیو، ٹی وی اینڈ فلم

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

اظہارِ تشکر

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ جل وشانہ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کا شکریہ ادا نہیں کرسکتے تو پھر میرے شکرگزار بھی نہیں ہوسکتے۔ میں ہر اُس شخصیت کا فرداً فرداً مشکور، ممنون اور احسان مند ہوں جس نے ایک لمحے کے لیے بھی میری دیکھ بھال وعیادت اور دلجوئی کی! جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

① سب سے پہلے میری اہلیہ محترمہ جو میری بیماری کی وجہ سے غم زدہ ہونے کے باوجود گھر گرہستی کے فرائض بخوبی سرانجام دینے کے ساتھ میری دلجوئی بھی کرتی رہیں۔ حالانکہ فکرانگیز اندیشوں نے اس معصوم خاتون کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس صابر خاتون کی دعائیں قبول فرما کر مجھے شفا عطا فرمائی۔ شکر الحمدُ للہ رب العالمین۔

② میری بڑی دختر آنسہ اور ان کے شوہر ڈاکٹر اصغر ہاشمی ہر وقت میرے ساتھ ساتھ ہسپتالوں میں ایمرجنسی میں مختلف کلینکل ٹسٹ کرانے میں اور دیگر دیکھی ان دیکھی مشکلات پر قابو پانے میں میرے سامنے حاضر وناظر رہے۔ آنسہ بیٹی میرے قریب ہوتی تھی پریشانی کا اظہار تو نہ کرتی تھی لیکن اس کے چہرے سے اس کے اندر کی کیفیت صاف عیاں تھی۔ وائرس کے خطرے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آنسہ (جس کو ہم سب پیار سے باجی کہتے ہیں) نے اپنے باپ کی عیادت اور خدمت جاری رکھی۔ نتیجتاً باجی کو بھی کرونا گزیدہ ہوکر اپنے گھر میں Isolate ہونا پڑا۔

③ میرے بیٹا نوید کاشف، جو اپنے فرائض کے سلسلے میں ملک سے باہر ہے میرے لیے بہت دعائیں کیں اور میری بیماری کا تمام خرچ برداشت کیا۔ میں آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ میرا بیٹا مجھے کروڑوں روپے کی مالی سپورٹ باقاعدگی کے ساتھ فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہر کسی کو نوید کاشف جیسے بہادر، دریا دل اور ماں باپ کا احترام واحساس کرنے والے بیٹے عطا فرمائے۔ آمین!

میں اپنے پوتے ادریس خاقان کاشف کی معصوم دعائیں جو کہ میں نے اپنی بیماری کے دوران ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کی طرح محسوس کیں کا بے حد ممنون ہوں۔

④ میرے دیگر بیٹے اے اقبال، علی ضیاء کاشف، علی دانیال آصف، محمد سالا رالٰہی جو کہ ایک ٹیم کی شکل میرے اردگرد ہسپتال میں، گھر میں فرشتوں کی طرح مجھے اپنے گھیرے میں لیے رکھتے تھے۔ صبح وشام میری ادویات، B.P، شوگر، آکسیجن سیچوریشن چیک کرنا اور چارٹ بنانا، ادویات لانا اور عین وقت پر کھلانا۔ رات کو اٹھ کر مجھے سوئے ہوئے کو چیک کرنا، اے اقبال کی ہر طرح سے کوشش ہوتی ہے کہ ادویات اور میری ضرورت کی دیگر اشیاء وہ اپنی جیب سے لائے۔ اسی طرح دیگر بیٹے علی ضیاء کاشف اور علی دانیال آصف اور محمد سالا رالٰہی کی بےلوث خدمات انمول ہیں اور صرف اور صرف خوش قسمت آدمی کو ہی میسر آسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے تمام بچوں کو سلامت رکھے اور علمی، ادبی، مالی اور ہر طرح کی ترقی عطا فرمائے آمین۔

⑤ میرے بچے اور بچیاں رضیہ ادریس، عالیہ عمر فاروق، رضوان عمر فاروق، احمد رضوان فاروق، نوشین عثمان فاروق، عثمان فاروق، شہیر فاروق، واصف فاروق، صائمہ فیصل خان، فیصل مسعود خان، ریشا فیصل خان، سوہا فیصل خان گھر اور ہسپتال میں دامے درمے سخنے میرے بہت قریب رہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہر ایک بچہ اور میری اہلیہ محترمہ ہر حالت میں میرے دل و دماغ پر چھائے رہے تو غلط نہ ہو گا۔ جہاں پر سب بچے گھر میں میرے لیے دعا گو رہتے وہاں پر فیصل مسعود خان اور ڈاکٹر اصغر ہاشمی ہسپتال میں میرے بیڈ کے آس پاس رہتے۔ آنسہ باجی کی دونوں بیٹیاں شہر سے باہر تھیں، بڑی بیٹی مناہل ہاشمی امریکہ میں زیرِ تعلیم ہے اور وہاں پر یونیورسٹی میں ٹاپ کر کے پاکستان کا وقار بلند کر رہی ہے۔ چھوٹی بیٹی مازنہ اصغر لاہور میں MBBS کے تیسرے سال میں زیرِ تعلیم ہے، اس کا مستقبل بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے روشن ہے۔ ان بچوں نے فون پر فون کر کے نانا کی خیریت دریافت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اللہ سبحان وتعالیٰ ان سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے آمین!

⑥ میرے دوست، میرے مسیحا، ڈاکٹر عزیز الرحمن، ڈاکٹر محمد اصغر چوہدری، ڈاکٹر شوکت مامون، ڈاکٹر فخر عباس، ڈاکٹر حور العین، بیٹی یوشہ رحمان، رمشہ عزیز مندرجہ بالا ڈاکٹر ز گھر، ہسپتال دن رات چوبیس گھنٹے حاضر و ناظر بےلوث کمال درجے کی خدمات دینے پر میں ان سب کا بے حد شکر گزار ہوں،

احسان مند ہوں اور دعا گو ہوں۔

⑦ ڈاکٹر شاہد فراز، ڈاکٹر مظہر فیض عالم ان کے ٹیلی فونک مشورے اور اخلاقی مدد، حوصلہ تسلی اور دعاؤں نے مجھے بہت ہمت اور حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر شاہد فراز میرے گھر عیادت کے لیے بھی تشریف لائے۔ ان کا وزٹ بے حد پُر تکلف تھا۔ میں دونوں برادران کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو رہوں گا۔

⑧ میں اپنے دوست عزیزی محمد طاہر سعید رامے اور محمد عتیق نظامی (ایڈووکیٹس) کا بے حد مشکور اور ممنون ہوں جو مجھے تکلیف کی حالت میں رات کے وقت کارڈیالوجسٹ کے پاس لے کر گئے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا اور دریادل بھی رہے۔

⑨ میں اپنی بھابھی محترمہ جنابہ مسز ڈاکٹر عزیز الرحمٰن کا بے حد احسان مند ہوں جو مجھے ہسپتال میں حوصلہ عطا کرنے تشریف لائیں، میرے لیے دعا گو رہیں اور ہر اخلاقی مدد فراہم کی۔

⑩ میں ڈاکٹر سرور خالد کارڈیالوجسٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود مجھے تکلیف کی حالت میں دوبار وزٹ کیا اور میرا علاج کیا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو صحت اور لمبی عمر عطا کرے اور ہاں انہوں نے پیشگی جمع کرائی گئی وزٹنگ فیس بھی مجھے واپس کر دی۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

⑪ ڈاکٹر محمد عرفان کارڈیالوجسٹ جب تک اللہ تعالیٰ مجھے زندگی عطا فرمائیں گے، میں آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ کے بعد آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے کمال مہربانی سے میرا علاج کیا، میری انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کی۔ پہلے دو سٹنٹ ڈالے، پھر ایک ہفتے کے بعد مجھے دوبارہ ہسپتال داخل کیا اور تیسرا سٹنٹ ڈالا جو کہ میرے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا۔ آپ نے بے حد محنت کی اور دو گھنٹے تک مجھے اللہ تعالیٰ سے زندگی دلوانے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحم کی وجہ سے آپ کامیاب و کامران ہوئے۔ میں ہر وقت آپ کے لیے دعا گو رہتا ہوں اور تازندگی انشااللہ آپ کے لیے دعا کرتا رہوں گا۔

⑫ مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) فرخ محمود ملک کی پُر تکلف دعاؤں، نیک خواہشات اور ان کا یہ کہنا کہ ادریس میں بہاولپور کو آپ کے بغیر نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ الفاظ میری بقایا زندگی کا سرمایہ حیات ہیں، بہت بہت اور بہت شکریہ ملک صاحب۔

۱۳ محترمہ جنابہ بھابھی تسنیم صاحبہ آپ نے پوری بیماری کے دوران بے شمار فون کیے، دعائیں دیں، غم زدہ ہوئیں، بہاولپور آنے کی ضد کی لیکن کمبخت کرونا نے اس کی اجازت نہ دی، غم آپ کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ اللہ سبحان وتعالیٰ نے آپ کی اور متذکرہ بالا تمام شخصیات کی دعائیں قبول فرما کر مجھے زندگی عطا کر دی۔ پھر محترمہ بھابھی صاحبہ اور ان کے بیٹے فرید رحمان نے میری خیریت معلوم کرنے کو ایک معمول بنا لیا۔ دراصل بھابھی صاحبہ خود بے حد احساس کرنے والی، رحم دل اور جاذب نظر شخصیت ہیں۔ نرم خوئی، نرم دلی، مہمان نوازی ان کی خاصیتیں ہیں۔ میں فرداً فرداً ہر شخصیت کا مشکور وممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو لمبی عمر، بہترین صحت، دائمی خوشیاں اور حفظ وامان عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

۱۴ ڈاکٹر عمر محمود (ڈینٹل سرجن) نے عیادت کے لیے فون کیا، میری صحت کے لیے دعائیں کیں، فکر مندی کا اظہار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب مجھے آپ سے بہت اہم مشورے کرنے ہیں۔ آپ پلیز جلدی صحت مند ہو جائیں۔ یہ ان کی شخصیت کی صاف گوئی اور مجھ سے محبت اور عقیدت کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود بہاولپور کے بہترین ڈینٹل سرجن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے۔ آمین!

۱۵ ڈاکٹر سلمان طاہر (وائس چانسلر) خواجہ فرید یونیورسٹی رحیم یار خان دو مرتبہ اپنے دیگر افسران کے ہمراہ بہت ہی پُرتکلف عیادت کے لیے تشریف لائے، میں تہہ دل سے ان کا مشکور ہوں۔ وہ جب تشریف لائے، علمی وادبی، سیر حاصل گفتگو ان کا خاصہ رہا۔ اس لیے وہ اپنے علم کے خزانہ میں سے کچھ نہ کچھ دان کر کے ہی گئے۔

شکریہ سلمان طاہر صاحب اللہ سبحان وتعالیٰ آپ کی اور آپ کے ہمراہیوں کی عمر دراز کرے۔ آمین یا رب العالمین!

۱۶ خواجہ صابر حسین (ریٹائرڈ) ریجنل ڈائریکٹر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ہنستے کھیلتے مسکراتے مع پھولوں کے میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں ان کا بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اسی طرح ہنستا، کھیلتا، مسکراتا اور صحت مند رکھے۔ آمین!

۱۷ میرا بہت ہی پیارا بھتیجا فاروق حسن ہسپتال و گھر پر کئی بار میری عیادت کے لیے تشریف لایا۔ اللہ تعالیٰ

میرے اس بچے کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

⑱ محترمہ بھابھی صاحبہ (مسز حسن احمد) عرصہ 20 سال کے بعد اچانک ہی میری عیادت کے لیے مع اپنے فرزند شہروز حسن اور مسز شہروز حسن کے ساتھ تشریف لائیں۔ پیار محبت اور احترام کا اظہار کیا۔ میری صحت کے لیے انہیں بہت فکر دامن گیر تھا جس کا اظہار انہوں نے متعدد بار کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس تردد کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

⑲ دورانِ بیماری کرنل (ریٹائرڈ) ولائیت حسین اعوان اور محترمہ بھابھی صاحبہ نے متعدد بار فون کر کے میری عیادت کی اور دعائیں دیں۔ کرنل صاحب اور محترمہ بھابھی صاحبہ سادہ اور پرخلوص شخصیات ہیں اور میرے بچوں میں بہت مقبول ہیں۔

اُن کی دعائیں اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر مجھے صحت و زندگی عطا فرمائی۔

مسجدیں ہیں نمازیوں کے لیے
اپنے دل میں کہیں خدا رکھنا

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ متذکرہ بالا شخصیات خوفِ خدا سے لبریز ہیں۔ سب کے لیے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

جزاک اللہ خیر احسن الجزا

پہلا باب

مشرق کا موتی - حُوروں کا مسکن

(ایک فقیر منش کی داستانِ مُلکِ شام)

اردو نام: شام۔۔۔انگلش نام: Syria۔۔۔عربی نام: السوریہ

شام پر اسلامی افواج کی یلغار حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔دمشق کا محاصرہ یزید بن ابوسفیان کی قیادت میں کیا گیا۔حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت ابو عبیدہ کی قیادت میں 14 ہجری کو دمشق فتح ہوا۔

دسمبر 1979ء کی ایک رات دمشق کی طرف پرواز کرتے ہوئے ایک ان دیکھی سرزمین کے متعلق جہاں میرے دل و دماغ میں بے شمار سوالات تھے وہاں انجانی سی خوشی بھی تھی۔دمشق نبیوں اور پیغمروں کی سرزمین ہے وہاں جانا بھی ایک اعزاز سے کم نہیں ہے۔دمشق میں ایک زیارت نہیں بلکہ بے شمار زیارتیں ہیں۔"سبحان اللہ "اللہ تعالیٰ سب کو جانا نصیب کرے۔آمین! دماغی گرد وغبار سے روشنی کی لہر اٹھی تو کچھ یاد کرنے کے قابل ہوا ورنہ اب تک تو شامی ائیر ہوسٹوں کی نقلی مسکراہٹوں اور اصلی اداؤں سے ہی فرصت نہ ملی تھی۔خوبصورت خدوخال اور اس پر جوانی کے نشے میں مخمور غزالی آنکھیں ایک جھماکے کی طرح نازل ہوتیں۔بجلی کی طرح چمکتیں۔گھنگھور گھٹاؤں کی طرح ٹھنڈک کا احساس دلاتیں اور اپنے حسن کی تپش میں انسانی جسم میں موجود فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی خاصیتوں اور حسرتوں کو جلا بخش کر ادائے دلربائی سے آس دلاتیں دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔روشنی کی لہر دماغ میں بھری آلودگی و کثافت کو صاف کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی اور دماغ میں ایک فلم چلنی شروع ہوگئی کہ ملک شام کی سرزمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں جبرائیلؑ نے نزول نہ کیا ہو۔ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے زیادہ تر سرزمین شام سے ہی اٹھے۔شام نبیوں، پیغمبروں، آل رسولؐ، انبیاء کرام، اولیا عظام، صحابہ کبار، رضوان اللہ علیم اجمعین، اللہ کے ولیوں اور فاتح بیت المقدس کی سرزمین ہے۔کیسی عظیم یہ امانت دار زمین ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت نشینوں کے اجسام مبارکہ کو اپنی حفاظت میں لیا ہوا ہے (سبحان اللہ)۔ان ہی گنج ہائے اسلام کی وجہ سے سرزمینِ شام کی عظمت اور اسکی علمی وسعت کو چار چاند لگے۔

ابھی میری ذہنی پرواز اور سوچ مقدس مقامات کا احاطہ کر رہی تھی کہ حُور نما غزالی لہراتی بل کھاتی اپنی

ٹرالی سمیت آموجود ہوئی ۔ایک بہت ہی مدہم لیکن سریلی آواز آئی سر آپ کون سا ڈرنک لینا پسند کریں گے؟ میں نے ایک شکستہ سی آواز میں اس قاتلہ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کیا چوائس ہے؟ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جھٹکا کھایا اور گل ریز ہونٹوں کو کھول کر اپنے بے عیب دودھیا عقیق جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے تمام برانڈ کی ام الخبائیثات کے نام گنوانا شروع کر دیئے۔ جب وہ گردان کرتے ہوئے سانس لینے کیلئے ذرا سی رکی تو میں نے چٹکی لینے کی خاطر کہا بس اور کچھ نہیں؟ وہ حیرانی سے بولی آپ کس برانڈ کو پسند کرتے ہیں۔ میں نے اسے اپنا برانڈ کچھ اسطرح بتایا کے میں صرف Soft Drink یا فروٹ جوس لینا پسند کرتا ہوں۔ وہ بہت حیرانی سے بولی بس فروٹ جوس۔۔۔۔۔؟ میں نے دوسری چٹکی لینے کی خاطر اسکو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر سافٹ ڈرنک یا فروٹ جوس آپ جیسی حسینہ کے خوبصورت ہاتھوں سے لیا جائے اور ان خوبصورت آنکھوں میں ڈوب کر پیا جائے تو وہ سہ آتشہ نشہ لاتا ہے۔ جسکے مقابلے میں یہ خوبصورت بوتلوں میں قید کئے گئے رنگ برنگے مشروب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ نشہ قدرت کا پیدا کیا ہوا ہے جس پر کائنات کی بنیاد ہے اور انسان کی افزائش نسل کیلئے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت اماں حوا سلام اللہ علیھا کو جنت سے اس دنیا میں بھیجا گیا۔ یہ بوتلوں کا نشہ حضرت انسان کا اپنا بنایا ہوا ہے جو صرف بربادی ہی بربادی ہے۔ اس نے فوراً ہی فروٹ جوس کا ایک ٹن کھولا اور گلاس میں انڈیل کر میری سامنے والی ٹیبل کو کھولتے ہوئے اس پر جما دیا۔ جب وہ گلاس رکھتے ہوئے کورنش بجالانے کے انداز میں جھکی تو معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت ہی نہیں بلکہ خوبصورت ترین خاتون ہے۔ میں نے سر کو یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ

رازِ اُلفت عیاں نہ ہو جائے
بے زبانی بیاں نہ ہو جائے

اور پھر تالپور کا یہ شعر ذہن میں جگہ پا گیا:

ہم تو زخمی ہی ہوئے خیر ہوئی
عاشقی میں تو جان چلی جاتی ہے

دو تین لائنیں چھوڑ کر میری پشت کی طرف بیٹھے چند لاہوری لڑکے جو اسلام آباد سے کوپن ہیگن کیلئے جہاز میں سوار ہوئے تھے بڑی بے صبری سے پنجابی میں بولے (باؤ جی ایس پری نوں ہن ساڈے ول وی

آن دیو) باؤ صاحب اس پری کو اب ہماری طرف بھی آنے دیں۔ میں خاموش رہا اور اپنی مسکراہٹوں کو اپنے چہرے پر سجائے جوس سے شغل کرتا رہا۔نظری دیدبانی بھی جاری وساری رہی۔پنسل ہیل کی ٹھک ٹھک ٹھک دل کو تیز کرتی رہی۔ نہ جانے کب اپنے گھر اپنے بچوں کے تصور میں کھو گیا۔میری اہلیہ محترمہ، میری بیٹی ثمینہ، میرا بیٹا نوید، میرا بلا، عالیہ،نوشی، انکی شرارتیں توتلی زبان میں فرمائشیں، اندر ہی اندر ان بچوں سے دوری مجھے کاٹ رہی تھی۔ٹائم گذرتے پتہ ہی نہ چلا اور جہاز دمشق کے ہوائی اڈے پر لینڈ کر گیا۔ مقامی وقت کے مطابق رات کے دو بجے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور جو کافی باتونی معلوم ہو رہا تھا اور مسلسل کچھ نہ کچھ بولے جا رہا تھا اسکی باتوں سے پتہ چلا کے صبح یہاں عید الضحیٰ ہے اسلئے ہوٹلوں میں رش بہت ہے۔ کیونکہ دمشق کے گردونواح کے لوگ عیدین کی نمازیں مسجد بنوامیہ میں ادا کرتے ہیں اور اسکے بعد زیارتیں کرتے ہیں۔ اکا دکا لوگوں کے علاوہ قافلوں کی صورت میں بھی لوگ آتے ہیں۔ بیروت، ایران،عراق، ترکی کے زائرین بھی آتے ہیں۔ اسلئے غیر معمولی رش ہے۔ آخر مجھے ایک تین ستارہ ہوٹل بنوامیہ میں کمرہ مل ہی گیا۔اس وقت صبح کے چار بج چکے تھے۔ ہوٹل کاؤنٹر سے فارغ ہو کر اس ٹیکسی والے سے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ کیونکہ وہ اپنے میٹر کے کرایہ سے تین گناہ زیادہ مانگ رہا تھا۔ کمرے تک پہنچتے اذان کی آواز آنی شروع ہوگئی۔ گرم بستر، تھکا ہوا بے آرام مسافر، لیٹتے ہی ہوش نہ رہا۔صبح 10 بجے تک سوتا رہا۔

آج میرا دمشق میں پہلا دن تھا۔ میں نے ہوٹل کے کاونٹر سے ٹورازم والوں کا ایک پمفلٹ اٹھا لیا تھا جو میں ٹیکسی میں بیٹھا پڑھتا رہا۔ ہوٹل کاؤنٹر سے بھی میں نے جان کاری لینے کی کوشش کی لیکن استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی بدصورت سی لڑکی صرف المحافظ روڈ کی تکرار ہی کرتی رہی۔ عربی میں نہ جانے اور کون سی زبان شامل تھی مجھے المحافظ روڈ کے علاوہ کچھ سمجھ نہ آیا۔ لہذا میں نے ٹیکسی والے کو المحافظ روڈ کا ہی کہہ دیا۔ پانچ منٹ کے بعد ہی میں شاہراہ المحافظ پر تھا۔ یہ ایک بہت پر رونق جگہ تھی۔ مجھے سب سے پہلے جو نیون سائن نظر آیا وہ PIA کا تھا۔ اب میں دائیں بائیں دیکھتا ہوا بڑے محتاط انداز میں چلتا ایک بارونق جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ یہ حمید یہ مارکیٹ تھی جسے چھتا بازار بھی کہتے ہیں۔ بازار کے نکڑ پر کچھ نوجوان لڑکے ڈھولکی اور طبلہ نما کوئی چیز بجا کر عربی میں گا کر فروخت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ منچلے راہ گیر رقص کرنے کی کوشش میں بھی مصروف تھے۔ میں بھی تماشائیوں میں موجود تھا کہ اچانک ایک خوبصورت سوٹیڈ بوٹیڈ نوجوان نے میرے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے مخاطب کیا۔ برادر آپ کس ملک سے تشریف لائے ہیں میں نے نرمی سے جواب دیا پاکستان ۔اس پر تین بار جھک کر اس نے مجھے سلام کیا اور کئی بار گلے لگایا۔ اپنا تعارف کرایا اور بولا پاکستان برادر ملک ہے۔عرب اسرائیل جنگ میں ہماری بہت مدد کی تھی۔ پھر بولا برادر ملک سوریہ میں آپ مہمان نہیں ہیں بلکہ یہ آپ کا اپنا ملک ہے۔ آؤ بیٹھ کر قہوہ پیتے ہیں۔حمید یہ مارکیٹ کے کونے پر ہی ایک ہینڈی کرافٹ کی دکان تھی۔ ہم اسکی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔قہوہ آ گیا جیسے ہی قہوہ ختم ہوا وہ بولا یہ سامنے مسجد بنوامیہ ہے آؤ تمہیں زیارت کروالاؤں اور ہاں اگر آپ نے مارکیٹ سے خریداری کرنی ہو تو بہت احتیاط سے یہ لوگ سیاحوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ بلکہ آپ مجھے حکم کرنا میں آپ کو 50% سستی خریداری کراؤ نگا۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا اور چلتا بنا کیونکہ مجھے علم تھا کہ یہ یہاں کے دکانداروں کا ایجنٹ ہے۔ اپنی ہفت کلامی سے اجنبی سیاحوں کو پھنسا کر 100 شامی پونڈ کی چیز تین سو میں دلوا کر اپنی کمیشن کھری کرتے ہیں۔حمید یہ مارکیٹ ایک تاریخی بازار ہے۔ کئی بار نذرِ آتش ہوا اور پھر سے آباد کیا گیا تاہم اسکی قدیم تاریخی حیثیت برقرار ہے۔ یہ ایک لمبا بازار ہے جس میں ہر قسم کی خریداری کرنے کے لئے دکانیں موجود ہیں۔ بہت رش ہوتا ہے۔ایک دکان میں رش زیادہ تھا۔ دکان میں ایک مشین لگائی گئی تھی جس میں دودھ چاول ڈال کر کھیر بنائی جاتی اور دوسری طرف سے برف توڑ کر ڈالی جارہی تھی۔ پکی پکائی ٹھنڈی کھیر کے پیالے برآمد ہو رہے تھے اور لوگ مزے لے کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے بھی ایک پیالہ خریدا۔کھیر واقعی مزیدار تھی۔کھیر کا نام اسکو میں نے دیا ہے یہ لوگ نہ جانے اسکو کیا کہتے تھے۔ میں حمید یہ مارکیٹ میں چلتا گیا۔آخر کار مسجد بنوامیہ کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

مسجد کے تین باب ہیں جنکے نام بالترتیب باب برید، باب امراء اور باب جیرون ہیں۔اسکو یہاں کے لوگ جامع امویہ کہتے ہیں۔آٹھویں صدی عیسوی میں ولید اول نے جامع امویہ بنوائی۔ یہ مسجد اپنی قدامت اور عظمت کے لحاظ سے دنیا کے مشہور ترین عمارات میں شمار ہوتی ہے۔ بارہ ہزار کاریگروں نے آٹھ برس کی مدت میں کروڑوں روپے کی لاگت سے یہ مسجد مکمل کی تھی۔اس مسجد کے تین مینار ہیں۔مشرقی مینار ہمیشہ بند رہتا ہے۔سفید مینار" جو بند پڑا ہے اور ایک حدیث مبارکہ کے مطابق قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے ظہور یہاں ہوگا۔کسی بھی عالمِ دین نے آج تک اسکی نفی نہیں کی۔ ’’دلہن مینار‘‘ (Brides Minarets) دمشق کے عجائب گھر میں رکھے ایک کتبہ کے مطابق شاہ ابوالفتح کی دلہن سے

منسوب یہ مینار آج تک دلہن مینار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اور فرمایا آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ نے ''ینزل عیسیٰ ابن مریم عندالمنارالمشرق دمشق''

مسجد کے مغربی مینار میں مدتوں حضرت امام غزالیؒ زہد وریاضت میں مشغول رہے۔1893 میں مسجد آگ لگنے سے جل گئی تو عثمانی حکمران سلطان عبدالحمید نے اس مسجد کو پھر سے بحال کیا۔مسجد میں زائرین کا بہت رش تھا۔لوگ خوبصورت ،چاق وچوبند، خوش اخلاق اور مہمان نواز کیوں نہ ہوں ۔حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اہلِ شام کیلئے خصوصی دعا فرمائی تھی کہ "اے اللہ ملک شام میں برکت عطا فرما"

دراصل مسجد بنوامیہ کی جگہ ایک بہت بڑا گرجا گھر ہوا کرتا تھا جو جنگوں کی وجہ سے نذرِ آتش ہو گیا تھا۔ صرف اسکی بنیادیں ہی باقی بچی تھیں۔خلیفہ ولید بن عبدالمالک نے 705ء میں ان ہی بنیادوں پر مسجد کی تعمیر شروع کی جو آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔اسلئے عیسائی بھی اس مسجد کو قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اب میری حسرتوں کے پھول کھلنے شروع ہوئے۔میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں۔بس دل چاہتا تھا کہ آج ہی تمام زیارتوں کی زیارت سے سرفراز ہو جاؤں۔مگر یہ ممکن ہی نہ تھا۔ ملک شام کے متعلق میرے ذہن میں بہت کچھ محفوظ تھا۔جو کتابوں میں پڑھا تھا وہ سب مجھے ازبر تھا۔میں صرف سوچ رہا تھا کہ شروعات کہاں سے کی جائے۔اس سوچ بچار میں حمیدیہ مارکیٹ (چھتا بازار) جا پہنچا۔یہ دمشق کا مشہور ترین تاریخی بازار ہے۔یہ ممکن ہی نہیں کہ دمشق کا ذکر آئے اور حمیدیہ بازار کا ذکر نہ آئے۔دمشق اور حمیدیہ بازار دونوں لازم وملزوم ہیں۔ایسا ہی ایک بازار استنبول (ترکی) میں بھی ہے جسکو کیپلا کارسی کہتے ہیں۔تاریخ دانوں کے مطابق یہ بازار ایک ہزار سال قبل مسیح سے زیادہ پرانا ہے۔شروع میں تو لوگ زمین پر بیٹھ کر اپنا سودا فروخت کیا کرتے تھے۔اسکے سامنے ہی حداد کا ہیکل تھا جہاں دیوی اوٹی گیس کی پوجا کی جاتی تھی۔مندر کے مشرقی جانب روایتی انداز کا ایک بازار بن گیا۔

جب رومن حملہ آور اقتدار پر قابض ہوئے تو انہوں نے یہاں جوپیٹر کا مندر تعمیر کروایا۔جسکی وجہ سے یہاں دکانیں تعمیر ہونے لگیں۔وقت گزرتا گیا اور یہاں گرجا تعمیر کر دیا گیا۔جسکی وجہ سے زیادہ رونق ہو گئی اور یہ جگہ ایک مکمل بازار کی شکل اختیار کر گئی۔اس کے بعد 89ھ میں جب مسجد تعمیر ہوئی تو یہ بازار ایک کاروباری مارکیٹ بن کر تمام عالم میں مشہور ہو گیا۔متعدد بار یہاں آگ لگ چکی ہے مگر ہر بار اسکی تعمیرِ نو کر دی گئی۔یہاں آپکو دنیا کا ہر باشندہ نظر آئیگا۔یہ بازار تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے۔پہلے ایک مین بازار

تھا۔اب اردگرد کی گلیوں میں سے ہر ایک گلی بازار کی شکل اختیار کرگئی ہیں ۔انہیں گلیوں میں ایک گلی میں حضرت ابو ہریرہؓ جن کا اصل نام عبدالشمس تھا آرام فرمارہے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابو ہریرہؓ علم کا ظرف ہے۔آپ نے کم وبیش پانچ ہزار احادیث بیان فرمائی ہیں۔امیر معاویہؓ کے دور میں آپ دمشق تشریف لے آئے تھے۔آپ نے 78 سال کی عمر میں وفات پائی۔

ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی اپنی مایہ ناز تصنیف کے صفحہ نمبر 398 پر مورخ کے حوالے سے مصدقہ طور پر فرماتے ہیں کہ جامع مسجد دمشق آج جس مقام پر واقع ہے یہاں ایک ہزار سال قبل مسیح میں ایک زبردست عبادت گاہ تھی۔جبکہ ملک شام میں (Aramaen) قوم آباد تھی۔دمشق ایک بڑا شہر تھا۔یہاں Hazail نامی بادشاہ کی حکومت تھی۔اسی بادشاہ نے یہاں عبادت گاہ تعمیر کروائی۔جو Temple of Hadad کے نام سے مشہور ہوئی۔Hadad دیوتا تھا اور اسکی بیوی اتارگٹیس دیوی تھی۔حداد دیوتا کو طوفان اور بارش جبکہ اتارگٹیس کو افزائش نسل کی دیوی کی حیثیت سے پوجا جاتا تھا۔(Aramaen) قوم کے نزدیک اتارگٹیس رومنز کی دیوی (Venus) کے برابر تھی۔اس مندر کے متعلق بے پناہ روائتیں مشہور ہیں۔ سولہویں صدی کی کھدائی کے دوران ایک مجسمہ (King Hazail) کا بھی برامد ہوا جو آج بھی دمشق کے میوزیم میں موجود ہے اور راقم الحروف نے بھی اسکو دیکھا ہے۔تین سو سال قبل مسیح اسی مقام پر جوپیٹر کا مندر تھا جو حداد دیوتا کی عبادت گاہ کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا جسکا نام (Noas) تھا۔اسکے ستون آج بھی دمشق کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔بازنطینی عہد حکومت 379ء میں جوپیٹر کے مندر کو گرجا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔نامور محققین میں سے Wattzinger کی رائے کچھ یوں ہے کہ مندر کی دیواریں ویسے ہی قائم رہیں جبکہ Dussad کہتا ہے کہ ان دیواروں کے ساتھ عبادت کیلئے نئے کمرے تعمیر کئے گئے۔مندر میں روایتی تبدیلیاں کی گئیں۔حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بڑے بڑے بت چبوترے پر ہال میں رکھے گئے ۔جہاں پادری کھڑا ہو کر درس دیتا اور مقدس بائیبل عوام کو سناتا تھا۔اسکے ساتھ ہی باقاعدہ بازار تعمیر کیا گیا۔جہاں سے لوگ تحفہ جات،تبرکات،کھانے پینے کی اشیاء اور روزمرہ کے استعمال کا سامان خرید کرتے۔عبادت گاہ کی وجہ سے دور دراز سے لوگ آتے۔مقامی لوگ بھی آتے۔اسلئے رش زیادہ ہوتا تھا۔آہستہ آہستہ یہ بازار ایک بڑی کاروباری جگہ اور مشہور ترین بازار بن گیا۔اب یہی بازار دنیا کا مشہور ترین حمیدیہ بازار ہے۔

14 ہجری 636 کے لگ بھگ دمشق میں خالد بن ولید باب شرقی سے، حضرت ابن العاص باب قومہ سے، اور یزید بن سفیان باب المضیر سے اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح صحابی رسولؐ باب الجیمع سے ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ اسلام کے ان نامور جرنیلوں نے مسقلات کے قریب آپس میں ملاقات کی تو سب سے پہلے نماز کی جگہ کا تعین کیا گیا اور باہم مشورے سے گرجا گھر کے صحن میں قبلہ کا رخ متعین کر کے محراب بنا دی گئی۔

(Wattzinger) کے مطابق گرجا گھر کی جائے عبادت اور مسجد کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔ ولید بن عبدالمالک کے دور حکومت تک گرجا گھر کی حیثیت برقرار تھی۔ 705ء میں جب ولید بن عبدالمالک خلیفہ بنا تو اس کے بعد مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ 75 سال تک گرجا گھر کی حیثیت بحال رہی اور کسی کو بھی مسجد بنانے کا خیال نہ آیا۔ ولید نے دمشق کے عیسائیوں کے مشورے کے ساتھ مسجد کے تعمیر شروع کروائی اور اسکی وفات کے بعد اسکے بھائی سیلمان بن عبدالمالک نے اسکی تعمیر 717ء میں مکمل کروائی۔ کبھی اس مسجد کو آگ نے نقصان پہنچایا تو کبھی زلزلوں نے اور کبھی فاطمیوں اور عیسائیوں کی خانہ جنگیوں نے۔ 858ء میں ایک خوفناک زلزلہ آیا جس نے دمشق کو تباہ و برباد کر دیا۔ زلزلہ کی وجہ سے مسجد اموی کا ایک مینار مسجد کی چھت پر گر گیا جس سے مسجد کی چھت شق ہوگئی اور چھت کو بہت نقصان پہنچا۔ اسکو سلطان صلاح دین ایوبی نے دوبارہ تعمیر کروایا۔ 1893ء میں یہ مسجد بے حد خوفناک آگ کی زد میں آ گئی۔ یہ آگ متواتر چار روز تک لگی رہی۔ مسجد کی دیواریں تک پھٹ گئیں۔ ارد گرد کا سارا علاقہ جل کر خاک ہوگیا جسکو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ مورخین اور سیاح مسجد کی خوبصورتی کے بارے میں رطب اللسان ہیں۔ مختلف ادوار میں سب کی رائے کچھ یوں تھی۔

1۔ "ابراہیم الکتابی" مسجد اموی ایک معجزہ ہے۔ بنو امیہ نے ایسی مسجد بنائی جو تا قیامت بے مثال رہے گی۔

2۔ "مہلب" لکھتا ہے کہ مسجد اموی میں مکمل قران پاک جلی حروف میں سنہری قلم سے دیواروں اور محرابوں پر لکھا ہوا ہے جسکے اطراف میں سونے کی پٹیاں ہیں۔

3۔ "ابن الفقیہ اور الشریف ذہبی" مسجد کی دیواریں سنگ مرمر کی چھت میں استر کاری سیسے (Lead) کی تھی۔ سونے کا آرائشی کام تھا جس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ستونوں اور محرابوں پر

سنہری حروف میں قرآنی آیات ہر طرف نظر آتی تھیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

4۔ "ابن ہوکل" مسجد کی دیواروں پر سنگِ مرمر کی استر کاری ہے۔ اوپر کے حصے میں قرآن پاک کی آیات ہر طرف بہار دیتی ہیں۔ نیچے والے حصے میں حاشیے اور گُل کاری ہے۔ محراب میں سونے کے پتھر جڑے ہوئے ہیں اور ان پر جواہرات سے قرآنی آیات اور اسمائے حسنہ نگاہوں کو چکا چوند کرتی ہیں۔ پانی کا نظام بہت اچھا ہے۔ مسجد کے ہر کونے میں پانی میسر تھا۔

5۔ "المقدسی" لکھتا ہے کہ مسجد کی دیواروں پر ایک قرآن پاک مکمل ہو جاتا ہے۔ سونے کی سلوں پر کندہ قرآن پاک کی آیات دیواروں پر جڑ دی گئیں ہیں۔ مسجد کی بالکنیاں اس قدر دراز ہیں کہ ان میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ستونوں پر سونے کے پتھروں کے حاشیے لگائے گئے ہیں۔

6۔ "ابن جبار" لکھتا ہے کے ایسی پر شکوہ مسجد میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ مسجد کے صحن میں ہزاروں کبوتر پھر رہے تھے۔ نہ لوگ انہیں کچھ کہتے ہیں اور نہ ہی کبوتر لوگوں سے خوف کھاتے ہیں۔ اسی صحن کے ایک کمرے میں حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک دفن ہے۔ روایت ہے کہ یہ کبوتر تمام دن نواسہ رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور شام کو آپکا سلام لیکر آپ کے نانا حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں مدینہ طیبہ کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔ سحری کے وقت وہاں پہنچ کر سلام عرض کرتے ہیں۔ جب سر مبارک یہاں آیا تھا تو کبوتر پہلی بار یہاں سے مدینہ طیبہ گئے تھے اور انکی نسل مدینہ طیبہ میں مسجد نبویؐ میں پھیلتی گئی۔

مسجد اموی کے باب البرید سے اگر آپ مسجد میں داخل ہوں تو باب البرید کے ستون کی سامنے والی طرف ایک پتھر لگا ہوا ہے جس پر عربی میں لکھا ہے "خلیفہ المومنین الولید بن عبدالمالک نے اس مسجد کی بنیاد 705 عیسوی میں رکھی"۔ مسجد کے چھ بڑے داخلی دروازے ہیں۔ اذان ہوتے ہی مرد و خواتین برابر نماز میں شریک ہوتے ہیں۔ خواتین جس لباس میں بھی ہوں مسجد میں آنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ مسجد کا کل رقبہ ایک لاکھ پینتیس ہزار مربع فٹ ہے۔

جس میں نماز پڑھنے کا ایوان، راہداریاں، حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک والا کمرہ جسے "راس مبارک" کہا جاتا ہے، حسین ہال، عمر ہال، ابوبکر ہال، عثمان ہال مسجد کے صحن میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مزار

ہے۔آپ کے زمانے میں ہیرووس نامی بادشاہ حکمران تھا۔یہودی رومی ہیرووس بادشاہ کے مرنے کے بعد اسکا بیٹا ہیرود بادشاہ بنا۔اس نے اپنے ہی بھائی کی بیوی کو داشتہ بنالیا۔اسکی پہلے سے ایک بیٹی بھی تھی جو رقاصہ تھی۔بادشاہ اسکو بھی دل دے بیٹھا۔اصلاح معاشرہ کی خاطر آپؑ نے بادشاہ کو بتایا کے یہ گناہ ہے کہ ماں اور بیٹی سے تعلقات رکھے جائیں۔بادشاہ نے آپکو جیل میں ڈال دیا۔لیکن آپؑ نے یہ فرمایا کے تم ایک گناہِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہو۔جب رقاصہ کو پتہ چلا تو وہ بادشاہ سے ناراض رہنے لگی اور آپ علیہ السلام سے بغض اور عناد رکھنے لگی۔آخر بادشاہ نے اپنی داشتہ کو خوش کرنے کی خاطر آپکو قتل کروا کر آپکا سر مبارک طشتری میں رکھ کر رقاصہ کو بھجوا دیا۔

حضرت یحیٰؑ اپنے والد بزرگوار حضرت زکریاؑ کی خصوصی دعا کا ثمر ہیں۔حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ سبحان تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ

''اے میرے رب مجھے اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے"۔

جب حضرت زکریا علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے آپکو حضرت یحیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی اور کہا کہ تیرا بیٹا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق کرے گا۔اس پر حضرت زکریاؑ نے کہا۔ترجمہ!"اے اللہ میرے کیسے بچہ ہوسکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے''۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اللہ جو چاہے کرسکتا ہے۔تورات میں ہے کہ یہودیوں نے ان کا قتل کر دیا تھا۔حضرت زکریاؑ کا مزار مبارک شام کے دوسرے بڑے شہر حلب میں ہے۔

اس مسجد میں عثمان ہال بھی موجود ہے جہاں امام غزالیؒ نے اعتکاف کیا تھا اسلیئے اسکو مقام غزالیؒ کہا جاتا ہے۔حضرت ہودؑ کی قبر بھی مسجد اموی میں ہے۔وہ حضرت نوحؑ کے بعد نبی معبوث ہو کر دنیا میں تشریف لائے۔انہوں نے قومِ عاد کی اصلاح کرنے کیلیئے انہیں ہر قسم کی برائیوں سے روکنا چاہا تو قومِ عاد نے ان کا مذاق اڑایا۔بت پرستی کو جاری رکھا اور ہر طرح سے نافرمانی کی۔آپ نے ان کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ اگر تم لوگوں نے اللہ کی نافرمانی نہ چھوڑی تو تم پر اللہ تعالی کا شدید عذاب نازل ہوگا۔قومِ عاد نے جواب دیا کہ جا اپنے اللہ سے کہہ دے کہ ہم پر عذاب نازل کرنے میں ذرا سی دیر نہ کرے۔اللہ تعالی کے حکم سے ایک بادل نمودار ہوا جس نے بعد میں ایک خوفناک صورت اختیار کر لی اور قومِ عاد کے تمام مشرکین لوگ اس عذاب کی نذر ہو گئے۔

مسجد اموی میں ہی ایک کمرہ ہے جہاں اہلِ بیت کو کوفہ سے لا کر رکھا گیا تھا۔قریب ہی امام زین العابدینؒ کا مصلّیٰ بھی بنا ہوا ہے۔ساتھ ہی یزید کے دربار والی جگہ ہے۔ایک الماری میں نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک موجود ہیں۔مسجد میں ایک کنواں بھی ہے جسے حضرت خضرؑ نے کھدوایا تھا۔اِن تمام مبارک جگہوں پر دونفل نماز ادا کرنے کے بعد میں مسجد کی غربی جانب چلا گیا۔یہاں اسلام کے بہت بڑے سلطان اور مجاہد غازی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا مزار ہے۔مزار پر سلطانؒ کی تصویر بھی رکھی ہوئی تھی۔سلطان ایک نیک اور پارسا مردِ مجاہد تھے۔صلیبی جنگوں کے فاتح، بیت المقدس کے فاتح اور کنگ رچرڈ،شاہِ انگلستان کو شکست دینے والے اس شیر دل کا نام دشمن بھی بہت احترام سے لیتے ہیں۔آج تک انگریز مورخ ان کو ایک شریف النفس انسان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔جنگ کے دنوں میں کنگ رچرڈ کا گھوڑا مر گیا تو سلطان نے ازراہِ مروت اپنا گھوڑا بھیج دیا۔جو عیسائی اپنا جزیہ ادا کرنے کے قابل نہ تھے،ان کا جزیہ سلطان نے اپنی جیب سے ادا کر دیا۔سلطان کا مزار سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔

عماد الدین زنگیؒ کا مزار بھی اسی قُبہ میں ہے۔سلطان عماد الدین زنگیؒ اسلامی سلطنت کو عیسائی حملوں سے بچانے والے مردِ مجاہد ہیں۔جبکہ اسلامی حکومتیں آپس میں دست و گریبان تھیں اور عیسائی حملہ آور پے در پے حملے کر رہے تھے تا کہ اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے۔اس چھوٹی سے جگہ میں تین ترک لوگوں کی قبریں بھی ہیں جو 1914ء میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ان کے نام کی سنگِ مرمر کی سلیں بھی لگی ہوئی تھی۔

قریب ہی صلا بن محمد جمال الدینؒ کا مزار ہے۔جس نے یزید کو حضرت امام حسینؓ کے دندان مبارکہ پر چھڑی مارنے سے روکا تھا جب امامؓ کا سر مبارک طشتری میں رکھ کر یزید کو پیش کیا گیا تھا۔اسی جرم کی پاداش میں صلاؒ کا سر تلوار کے ایک ہی وار سے قلم کر دیا گیا۔آپؒ عیسائی سے مسلمان ہوئے تھے۔بڑے بڑے پتھروں کی نشانیاں لگا کر مندرجہ ذیل مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱- امام زین العابدینؒ کے چالیس روز نماز پڑھنے کی جگہ۔
۲- حضرت امام حسینؓ کا کٹا ہوا سر مبارک رکھنے کی جگہ۔
۳- بازارِ شام جہاں سے اسیرانِ کربلا کو گزارا گیا تھا۔

مسجد بنوامیہ کے قریب ہی یزید کے محلات کے کھنڈرات ہیں جو ہر چشم کے لیے عبرت آموز ہیں۔

ایک وحشت ہے جوان کھنڈرات سے ٹپکتی ہے۔

اب میں بلا ناغہ ہوٹل سے سیدھا مسجد بنوامیہ پیدل ہی پہنچ جاتا۔تمام دن مسجد اور گردونواح کی مختلف زیارتوں میں صرف کرتا۔جب تک مسجد بنوامیہ میں داخل نہ ہو جاتا طبعیت میں بے چینی رہتی۔مسجد میں داخل ہوتے ہی سکون مل جاتا۔ایک روز حضرت یحییٰ کے مزار مبارک کے پاؤں کی طرف آنکھیں بند کیے تصور میں غرق تھا کہ ایک ہلکی سی آواز آئی ''السلام علیکم یا سیّدی یا حبیبی''۔میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو اپنے قریب پایا جو اب دوزانوں ہو کر بیٹھ چکا تھا۔عربی لہجے کی انگلش میں اس نے پوچھا کہ کیا آپ انڈین ہیں؟ میں نے کہا No الحمدللہ میں پاکستانی ہوں۔وہ چونک گیا اور بولا میں طلال ہوں اور فلسطین کا رہنے والا ہوں۔دمشق میں زیرِ تعلیم ہوں۔میرا بڑا بھائی خالد پاکستان کے میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔میں نے اس کو بتایا کہ پاکستان میں بہت سے میڈیکل کالج ہیں۔وہ کس شہر کے کون سے کالج میں زیرِ تعلیم ہے؟ وہ بولا بہاولپور کے قائداعظم میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہنستے ہوئے کہا کہ میں بہاولپور کا ہی رہنے والا ہوں اور میڈیکل کالج کی کمپاؤنڈ وال کے قریب ہی میرا گھر ہے۔وہ بہت حیران ہوا اور خوشی کا اظہار کرنے لگا۔پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک ڈائری نکالی اور مجھے ایک ایڈریس اور فون نمبر دکھانے لگا۔میں ایڈریس دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ یہ ایڈریس اور فون نمبر بیگم حمیدہ غوری کے گھر کا تھا۔میں نے اس کو بیگم حمیدہ غوری کے بارے میں بتایا کہ یہ ہمارے شہر کی بہت مشہور سیاسی شخصیت ہیں اور یہ کہ بیگم صاحبہ نہ صرف میری دوست بلکہ فیملی فرینڈ بھی ہیں۔پھر اس نے اپنا پرس نکال کر اس میں سے ایک تصویر نکالی جو اس کے بھائی خالد، بیگم حمیدہ غوری، ڈاکٹر بلقیس نواز و دیگر خواتین اور میڈیکل سٹوڈنٹس کی تھی۔میں نے اس کو تصویر پر انگلی رکھ کر نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ آپ کا بھائی خالد ہے۔اس کے دائیں طرف بیگم حمیدہ غوری اور بائیں طرف ڈاکٹر بلقیس اور دیگر میڈیکل سٹوڈنٹس ہیں۔وہ بولا آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہے۔میں نے اس کو بہت تفصیل سے بتایا کہ میں آپ کے بھائی خالد سے متعدد بار مل چکا ہوں کیونکہ یہ میرے دوستوں کا گروپ ہے۔اکثر شام کو ہم بیگم صاحبہ کے گھر اکھٹے ہوتے ہیں۔کبھی باربی کیو، کبھی موسیقی، کبھی چائے کافی، کچھ نہ کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔طلال کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔اب وہ بہت پر جوش تھا۔وہ بولا بیگم حمیدہ غوری بہت اچھی خاتون ہیں۔میرا بھائی ان کو آنٹی کہتا ہے۔ایک بار وہ بیمار ہو گیا تھا تو آنٹی نے اس کی

بہت دیکھ بھال کی۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس کو بہاولپور کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ بولا میں روزانہ اپنی کتابیں لے کر یہاں آجاتا ہوں۔ یہ پرسکون جگہ ہے۔ مجھے اپنے امتحان کی تیاری کرنی ہوتی ہے۔ میں گزشتہ کئی دنوں سے آپ کو دیکھ رہا تھا کہ آپ روز آتے ہیں۔ کبھی ایک زیارت کے پاس کبھی دوسری زیارت کے پاس بے چینی سے گھومتے ہیں۔ آج مجھ سے نہیں رہا گیا تو میں آپ سے ملنے آ گیا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے بُرا محسوس نہیں کیا ہوگا۔ میں ہنستا رہا۔ وہ بولا لنچ کا ٹائم ہو گیا ہے، آپ لنچ میرے ساتھ کریں گے۔ میرے تکلف کرنے پر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اصرار کرتا ہوا مجھے ساتھ لے گیا۔ یہ ایک نہایت صاف ستھرا فلسطینی ہوٹل تھا۔ رش زیادہ تھا۔ ایک بڑی میز پر چند لڑکے اور لڑکیاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ طلال کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکے۔ باری باری سب نے اسے گلے لگایا۔ اس کے رخساروں پر بوسے دیے۔ میں ایک طرف اجنبی کی حیثیت سے خاموش کھڑا رہا۔ ایک لڑکے نے میری طرف اشارہ کر کے طلال سے کچھ کہا تو طلال نے اپنی عربی نما انگلش میں میرا تعارف کروایا۔ سب لڑکے لڑکیوں نے مجھ سے ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا کیا۔ ایک لڑکی نے طلال سے کچھ پوچھا اور معنی خیز نظروں سے میری طرف اشارہ بھی کیا۔ میرے پوچھنے پر طلال نے بتایا کہ میری کلاس فیلو پوچھ رہی ہے کہ یہ ایک پاکستانی مسلمان دوست ہے تو اس نے ٹائی کیوں لگا رکھی ہے۔ میں نے فوراً اپنی ٹائی اتار کر دور رکھے ایک ڈسٹ بن میں ڈال دی۔ تمام شریکِ محفل لڑکے لڑکوں نے ہلکی آواز میں تالیاں بجائیں بلکہ ساتھ والی ٹیبل کے لوگ بھی شریکِ تالیاں تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے ملک میں ٹائی لگانے کا رواج عام ہے۔ کھانا پرتکلف اور مزیدار تھا۔ نمازِ عصر کا ٹائم ہوا تو ہم سب مسجد بنوامیہ واپس آ گئے۔ سب نے نمازِ عصر ادا کی۔ نماز کے بعد زیارتوں پر سلام و درود کا سلسلہ خشوع و خضوع سے مغرب تک جاری رہا۔ نمازِ مغرب کے بعد طلال مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آیا اور بولا برادر ادریس کل جمعہ ہے۔ یونیورسٹی سے میری چھٹی ہے۔ میں صبح آٹھ بجے آپ کے پاس ہوٹل واپس آ جاؤں گا۔ دمشق کے گردونواح میں جتنی بھی زیارتیں ہیں میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔ میں نے اس کی یہ پیشکش خوشدلی سے قبول کی اور اس کو پابند کیا کہ وہ ناشتہ میرے ساتھ کرے گا۔ کچھ تکلف کے بعد وہ مان گیا۔

طلال صبح اپنے وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی آ گیا۔ تمام ضروری امور سے فارغ ہو کر ہم دونوں پہلے

حضرت زینبؓ بنتِ علیؑ کے مزار کی طرف روانہ ہوئے جو دمشق سے 15 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ حضرت زینبؓ اسیرانِ اہلِ بیتؑ کے قافلے میں شامل تھیں۔ کوفہ میں ابن زیاد اور دمشق میں یزید کے سامنے جس حق گوئی اور جرأتِ ایمانی سے باتیں کیں وہ ایک لازوال مثال ہے۔ اس کے بعد ہم ایک بہت بڑے اور پرانے قبرستان جا پہنچے جس کا نام باب الصغیر ہے۔ اس قبرستان میں جنت البقیع اور جنت المعلیٰ کے بعد سب سے زیادہ صحابہ اکرام دفن ہیں۔ یہاں فاتحِ شام حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کا مزار ہے۔ تاریخِ اسلام کے مطابق آپ کی جنگی فتوحات اور خدمات قابلِ تعریف ہیں۔ حضرت بلالؓ حبشی کے قبہ میں داخل ہو کر مزار تک جانے کے لیے چند سیڑھیاں زمین کے اندر اترتی ہیں۔ قبر پر سبز غلاف اور غلاف کے اوپر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ ایک برجی پر سبز عمامہ رکھا ہوا ہے۔ سید بلالؓ ایک غلام تھے اور حبشہ کے رہنے والے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپؓ کو خرید کر آزاد کیا۔ صحابہؓ میں آپ کا رتبہ بلند ہے۔ آپؓ موذنِ رسولؐ تھے۔ حضرت بلالؓ کے پاؤں کی طرف حضرت عبداللہ جعفر بن طیار کی قبر ہے۔ آپ نے شاہِ نجاشی کے دربار میں اسلام کی خوبیوں کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا تھا۔ اسی جگہ پر حضر سعدؓ بن خالدؓ بن ولید کا مزار بھی ہے۔

باب الصغیر شاہراہ پر ہی بائیں جانب قبرستان میں ایک شکستہ سی قبر ہے جہاں حضرت امیر معاویہؓ بن ابو سفیان کی قبر ہے۔ آپ فتحِ مکہ کے وقت مسلمان ہوئے اور بعد میں کاتبِ وحی مقرر ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ دمشق کی فتح کے بعد آپ کو حضرت عمرؓ نے دمشق کا گورنر مقرر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں آپ کو پورے ملک شام کا والی مقرر کر دیا گیا۔ لیکن جب حضرت علیؑ خلیفہ بنے تو انہوں نے امیر معاویہؓ کو شام کی گورنری سے معزول کر دیا۔ مگر امیر معاویہؓ نے حکم ماننے سے انکار کر دیا جس پر جنگِ صفین شروع ہوگئی اور امیر معاویہؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؑ جانشین مقرر ہوئے لیکن امیر معاویہؓ نے عراق پر حملہ کر دیا۔ حضرت امام حسنؑ خلافت سے دستبردار ہو گئے تا کہ مسلمانوں میں خون ریزی نہ ہو۔ اس طرح امیر معاویہؓ تمام عالمِ اسلام کے خلیفہ مقرر ہو گئے۔ امیر معاویہؓ کی فاش ترین غلطی یزید کو اپنا جانشین بنانا تھی جس کی وجہ سے پہلی بار عالمِ اسلام میں ملوکیت کی بنیاد رکھی گئی۔ واقعہ کربلا اسی غلطی اور اقربا پروری کی ایک

ہولناک و افسوسناک اور بدترین مثال ہے۔ آج ان کا مزار ایک عبرت گاہ ہے۔ یہاں پر دیگر مزارات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ سیّدنا حفیظہ بنتِ سیّدنا ابوبکر صدیقؓ

۲۔ زیان بن عثمان

۳۔ فضّہ کنیز سیّدنا حضرت الزھرا رضی اللہ عنہا

۴۔ حضرت عبداللہ بن امام زین العابدین

۵ سیّدنا فاطمہ الصغرا بنت حضرت امام حسینؓ

۶۔ سیّدنا سکینہ بنت حضرت امام حسینؓ

۷۔ حضرت عبداللہ ابن اُم کلثوم صحابی رسولؐ جن کے متعلق قرآنِ کریم میں مندرجہ ذیل آیت بھی نازل ہوئی تھی: ''عبس وتولی ان جلوہ الاعمیٰ''

۸۔ حضرت اوس بن اوس الشقفی

۹۔ حضرت ذوالنون مصری

۱۰۔ ایک روایت کے مطابق یزید بھی اسی قبرستان کے ایک کنارے کی طرف دفن تھا۔ جہاں لوگ اکثر خشت باری کیا کرتے تھے۔ آخرکار ایک شامی نے اسی جگہ کانچ گلانے کی بھٹی لگا لی۔ ہمارے وزٹ کے دوران وہاں درختوں کے بڑے بڑے تنے پڑے تھے۔

۱۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود۔ ان سے احادیث مروی ہیں۔

۱۲۔ حضرت ابی ابنِ کعب انصاری

۱۳۔ مقداد بن اسود

۱۴۔ حضرت زوارؓ بن ازور۔ یہ بہت بہادر جنگجو تھے۔ حضرت سیف اللہ کے ساتھ بڑے معرکوں میں شریک رہے۔

۱۵۔ حضرت خولہؓ، حضرت زوارؓ کی بہن تھیں۔ وہ ایک بہادر خاتون تھیں۔ ایک موقع پر رومیوں کی یلغار روکنے کے لیے خیموں کی چوبوں سے ہی رومیوں کے منہ موڑ دیے تھے۔ ان کا مزار قبرستان باغ موما میں ہے۔

۱۶۔ شیخ ارسلان دمشقی اوران کے شیخ کا مزار بھی یہیں ہے۔

۱۷۔مشہور مورخ شیخ اکبرمحیؒ الدین العربی۔آپ کا مزار محلّہ صالحبہ جبل تا سیون میں واقع ہے۔ کچھ فلاسفر حضرات کا خیال ہے کہ اقبالؒ نے مختلف سیارگان کا جو سفر لکھا ہے اس کا تخیل انہوں نے ابنِ عربی سے ہی لیا تھا۔

۱۸۔ حضرت عبدالصفینا بلسیؒ ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔قبر کے تعویز کے مطابق آپ کا انتقال 1307ء میں ہوا تھا۔آپ کا مزار بھی قریب ہی ہے۔

۱۹۔شیخ محمد المعروف بابا کردی۔ایک روایت کے مطابق ان کا مزار آٹھ سو سال پرانا ہے۔

۲۰۔ غزوۂ بدر کے مشہور صحابی حضرت مقداد ابن اسود کندی،علمدار سرورِ کائنات ﷺ کا مزار قریب ہی ہے۔

۲۱۔ حضرت عباس بن بردوس۔صحابی رسول ﷺ اور خلافت عمرؓ میں دمشق کے قاضی تھے۔

۲۲۔ سلمیٰ سیّدنا ابودردا

۲۳۔ علامہ ابن قیم جوزی۔حافظ،احادیث۔

۲۴۔ شیخ ابراہیم بن سلیمان

۲۵۔ حضرت وحیتہ الکلبیؓ ۔صحابی رسول ﷺ تھے۔حضرت جبرائیلؑ اکثر ان کی شکل میں نازل ہو کر وحی لایا کرتے تھے۔ان کا مزار دمشق کے مغربی جانب دو میل کی دوری پر واقع ہے۔

۲۶۔ حضرت ابومسلم خولانیؒ۔آپ کا مزار دارالکبریٰ میں ہے۔ہود بن عسی کذاب نے انہیں آگ میں ڈال دیا تھا۔مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔اس کے بعد آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ حضرت عمرؓ آپ سے بغلگیر ہوئے اور فرمایا کہ آج میں ایک ایسے شخص سے مل رہا ہوں جس کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ جیسا سلوک کیا گیا۔

اتنا گھومنے پھرنے اور ہر جگہ دو دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد ہم اتنا تھک گئے کہ ہر چیز گھومتی نظر آ رہی تھی۔طلال نے مجھے ہوٹل چھوڑا اور اگلی صبح آنے کا وعدہ کیا۔میں نے کہا کہ آپ کو یونیورسٹی جانا ہو گا۔وہ بولا No Problem. I will manage۔اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ دوسرے روز حسبِ سابق ہم نے ناشتہ اکٹھے کیا۔دراصل ہم دونوں میں برادرانہ محبت،اخوت اور احترام کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔میرے شوق کو محسوس کرتے ہوئے اب اس کی شدید خواہش تھی کہ

تمام زیارتیں میں اسی کے توسط سے کروں۔ اس لئے وہ نئی informations لے کر آتا اور ہم زیارتوں پر نکل کھڑے ہوتے۔ آج ہم نے مندرجہ ذیل زیارتیں کیں۔

۲۷۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کا مزار دمشق سے 15 میل کے فاصلے پر ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ آپ کا شمار اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔

۲۸۔ اصحابِ کہف کا غار جبل صالحیہ پر واقع ہے۔ یہ جگہ منارۃ الدم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ غار ایک خاص مقام پر جا کر بند ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کے متعلق ایک سورۃ پندرھویں سپارے میں ہے۔

۲۹۔ یہاں سے تین میل کے فاصلے پر پہاڑ کی ایک اور چوٹی پر مقامِ ہابیل قابیل ہے جہاں قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا۔ جس کا ذکر قرآنِ پاک کے پارہ نمبر ۶، سورہ المائدہ، رکوع نمبر ۷ میں موجود ہے۔

۳۰۔ چالیس پیغمبروں کی زیارت گاہ۔

۳۱۔ مقامِ اربعین۔ مقامی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے چاند، سورج اور ستاروں کے طلوع و غروب کے منظر کو دیکھ کر توحید کا سبق حاصل کیا تھا اور فرمایا تھا کہ یہ رب نہیں ہو سکتے۔ قریب ہی ولادتِ ابراہیمؑ کی جگہ ہے اور حضرت نوحؑ کی عبادت کی جگہ ہے۔ وہاں کے مجاور لوگوں سے رقوم بٹورنے کے لیے بعید از قیاس حکایات اور روایات سناتے ہیں۔

۳۲۔ حضرت ابی بن کعبؓ۔ ان کے بارے میں حضور پاک ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری امت میں سب سے بڑا قاری ابی بن کعب ہے۔

۳۳۔ حضرت شرجیل بن حسنہؓ۔ آپ نے حضور پاک ﷺ کے حکم پر پہلی ہجرتِ حبشہ میں شرکت فرمائی۔

۳۴۔ حضرت معاذ بن جبلؓ۔ آپ وہ بلند ہستی تھے جو سترہ انصارِ مدینہ کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لائے اور حضور پاک ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ آپ غزوات میں حضور پاک ﷺ کے شانہ بشانہ رہے۔ آپ بھی حضرت بلالؓ کے قریب ہی دفن ہیں۔

۳۵۔ حضرت سہیل بن عمروؓ۔ آپ حضور پاک ﷺ کے ساتھ غزوۂ اُحد، غزوۂ خندق و دیگر غزوات میں

شامل رہے۔آپ کا مدفن بھی دمشق میں ہے۔

۳۶۔ حجرت فقالہ بن عبیدؓ۔آپ جنگِ احد، جنگِ خندق اور جنگِ حنین میں حضور پاک ﷺ کے شانہ بشانہ تھے۔آپ دمشق کے قاضی بھی رہے۔حضرت بلالؓ کے بائیں طرف مشرقی سمت میں آپ کی قبر ہے۔

۳۷۔ حضرت عمرو بن عبیدؓ۔آپ سرکارِ دو عالم ﷺ کے دستِ مبارک پر مسلمان ہوئے تھے۔آپ نے غزوات میں بھی حصہ لیا اور بہت سی احادیث بھی ان سے مروی ہیں۔آپ کا مدفن بھی اسی جگہ ہے۔

۳۸۔ حضرت حارثؓ بن حشام۔آپ فتح مکہ والے دن مسلمان ہوئے۔جنگِ حنین میں شریک ہوئے۔آپ کا مدفن بھی عمرو بن عبیدؓ کے پہلو میں ہے۔

۳۹۔ حضرت واثلہ بن اسقع۔حضور پاک ﷺ کے ہاتھوں مسلمان ہوئے۔آپ بہت سی احادیث کے راوی بھی ہیں۔آپ کی قبر مبارک بھی باب الصغیر کے قریب ہے۔

۴۰۔ حافظ ابن قیمؒ۔آپ کی قبر مبارکہ حضرت واثلہؓ کے دائیں طرف ہے۔

۴۱۔ حضرت امام ابن قیمؒ۔آپ کا مدفن جامعہ صدفیہ میں ہے۔آپ بہت ساری کتابوں کے مصنف تھے آپ کی تمام تصانیف مدرسہ الجوزیہ میں محفوظ ہیں۔دمشق کے علماء آپ کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔آپ کی قبر صرف ایک کتبے کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

۴۲۔ حضرت فضل بن عباسؓ۔آپ حضرت عباسؓ کے بڑے بیٹے تھے۔آپ نے حضور پاک ﷺ کے ساتھ جنگِ حنین میں شرکت کی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضور پاک ﷺ آپؓ کو اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا تھا۔آپؓ حضور پاک ﷺ کو غسل دینے والوں میں شامل تھے (سبحان اللہ)۔آپؓ کا مقبرہ حضرت امام ابن قیمؒ کے دائیں طرف ہے۔

۴۳۔ حضرت رقیہؓ بنتِ حضرت امام حسینؓ۔آپ کا مزار ایک تنگ سی گلی میں واقع ہے۔زیادہ تر ایرانی لوگ مزار کو گھیرے ہوئے تھے۔مرد حضرات نے جُبے پہن رکھے تھے۔بوڑھی اور ادھیڑ عمر خواتین چادروں میں تھیں جبکہ نوجوان لڑکیاں جینز اور بلاؤز میں تھیں۔مزار کی حرمت کے پیشِ نظر لڑکیوں کا سراپا اور خوبصورتی وغیرہ پر تبصرہ نہیں کروں گا۔مزار کی انتظامیہ نے مزار کے گیٹ

پر سیاہ چوغے رکھے ہوئے تھے تا کہ سب لوگ خاص طور پر جین میں سجی لڑکیاں باادب ہو کر مزار کے اندر داخل ہوں۔ موجودہ مزار اور قید خانہ اہلِ بیتؑ کی خوبصورت انداز میں تعمیر ایرانی حکومت نے کی۔

۴۴۔ حضرت صفیہؓ زوجہ محترمہ حضور پاک ﷺ۔ آپؓ کا روضہ مبارک بابِ الصغیر یا قبرستان اہلِ بیت میں ایک چھوٹی کوٹھڑی میں تھا۔ قبر مبارکہ زمین سے کافی اونچی اور غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نام مبارکہ کا تعویز بھی لگا ہوا تھا۔

۴۵۔ حضرت سلمیٰؓ اور حضرت اُمِ حبیبہؓ، ازواجِ حضور پاک ﷺ بھی اسی قبرستان میں دفن ہیں۔ روضہ مبارک پر دونوں ازواج کے نام کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔

۴۶۔ ان دونوں قبور مبارکہ کے بالکل سامنے سڑک کے پار انسانی سر نما کئی قبریں ہیں۔ یہاں شہدائے کربلا کے سر مبارک دفن ہیں۔ شہداء کے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔

۴۷۔ حضرت زین العابدینؓ کے فرزند سید محمد سلیم رضا مرتضیٰؒ کا مزار بھی موجود ہے۔ اب طلال سے بے تکلفی اور دوستی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے پاس جتنا بھی فالتو وقت ہوتا وہ مجھے لے کر پھرتا رہتا۔ جن جگہوں کا مجھے علم بھی نہیں تھا اور شاید میں اکیلا جا بھی نہ سکتا، وہ مجھے وہاں لے کر گیا۔ شکریہ طلال میں آج تک تمھارے لئے دعا گو ہوں اور تاحیات رہوں گا ''انشاءاللہ''۔

دو ہزار سال پرانے کلچر اور بود و باش کے لوگ

یہ لوگ سب سے پرانی آرمیک زبان بولتے ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت اب بھی غاروں میں رہتی ہے اور دو ہزار سال پرانا کلچر اپنائے ہوئے ہیں۔ دمشق سے 60 کلومیٹر مالوہ نامی ایک گاؤں ہے۔ جس کے بائیں طرف لبنان کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ اگر مالوہ گاؤں سے 78 کلومیٹر آگے چلے جائیں تو گولان کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں جو کبھی شام کی ملکیت تھیں۔ مگر اب اسرائیل کے غاصبانہ قبضے میں ہیں۔ مقامی طور پر ان پہاڑیوں کو لوگ کئی نام دیتے ہیں جو کچھ اس طرح سے ہیں: جبل الشیخ، آل ہرامون، آل قالمون۔ اس گاؤں کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ جب رومیوں نے شام کو فتح کیا تو یہ لوگ ظالم رومیوں کے خوف سے پہاڑوں کے غاروں میں چھپ گئے اور آج تک انہی غاروں میں رہتے ہیں۔ ان کا دو ہزار سال

پرانا رہن سہن انسان کو دو ہزار سال پیچھے لے جاتا ہے۔

صوبائی دارالحکومت حمص کے ایک طرف حلب، دوسری طرف دمشق، تیسری طرف بحیرہ روم اور چوتھی طرف صحرا ہے۔ یہاں کے لوگ پڑھے لکھے، خوبصورت، نرم خو اور حلیم طبع ہیں۔ یہاں ایک زرعی یونیورسٹی بھی ہے۔اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ دنیائے اسلام کے بہت بڑے جنرل خالد بن ولیدؓ کا مزار مبارک یہاں ہیں جن کو حضور پاک ﷺ نے سیف اللہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ مورخ بیان کرتا ہے کہ ''سیف اللہ دنیا کی وہ پہلی اور آخری ہستی ہیں جنہوں نے ختم المرسلین ﷺ کے عساکرِ مقدسہ میں اپنی تلوار سے تہلکہ ڈال دیا تھا۔'' آپؓ نے تمام جھوٹے نبیوں اور ان کے اماموں کے سر کاٹ کر دربارِ خلافت کی سیڑھیوں پر پھینک دیے تھے۔ آپ کا مزار حمص شہر کی ایک بڑی اور خوبصورت شاہراہ کے درمیان میں واقع ہے۔ باغیچہ بھی خوبصورت ہے۔ باغیچے سے گزر کر مسجد میں داخل ہو کر دائیں طرف آپ کا مزار ہے۔ مقبرے کے باہر ایک بورڈ پر آپ کے نام کے ساتھ عاشقِ نبی ﷺ اور دو بند کا شعر بھی عربی میں لکھا ہوا تھا۔ مقبرے کے گنبد کا رنگ سبز ہے جس پر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ سپہ سالاری سے آج تک یہ جھنڈا اُن کی پہچان ہے۔

اسی مسجد کے ایک کونے میں عبداللہ بن عمر الخطابؓ کی قبر بھی ہے۔ مزار کے باغیچے میں ایک مینار پر آپ کی وصیت تحریر ہے کہ ''میں نے ایک سو سے زائد جنگیں لڑیں۔ میرے جسم پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تیروں کے نشان نہ ہوں۔ اس کے باوجود میں اپنے گھر چار پائی پر بزدلوں کی موت مر رہا ہوں''۔

حضرت زکریاؑ نبی اللہ کا مزار حلب میں واقع ہے۔ یہ مزار سلیمان بن عبدالمالک کی تعمیر کردہ مسجد امیہ کے دائیں جانب ہے۔ مزار کی حالت اچھی نہ تھی۔ مسجد کے قریب ہی ایک مدرسہ تھا جسے مقامی لوگوں کے مطابق سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی بہو حلینا نے تعمیر کروایا تھا۔ پرانے حلب میں ماقم گیٹ کے قریب مسجد فردوس ہے۔ یہ مسجد بھی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی ایک اور بہو دانیعیہ خاتون نے تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد بہت عالی شان ہے۔ اس سے ملحق ایک مدرسہ ہے اور ساتھ ہی امام نقشبندی کا مزار ہے۔

حلب حمص سے تقریباً 215 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر تین ہزار سال سے زیادہ پرانا ہے۔ شہر کے درمیان میں حلب کا مشہور تاریخی قلعہ واقع ہے جسے ظاہر غازی بن سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بارھویں صدی میں تعمیر کروایا تھا۔ ترکی کی سرحد یہاں سے 50 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حلب شہر میں

خوبصورت لوگ، ماڈرن ہوٹل، مارکیٹیں، نائٹ کلب سب زمانے کی رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ رات دو بجے تک ہم دمشق واپس لوٹ آئے۔ آرام کرنے اور ایک نئے جذبے اور جنون کے ساتھ دوبارہ محوِ سفر ہونے کے لیے شکریہ طلال۔ ''جزاک اللہ''۔ اگلے دو روز تک طلال یونیورسٹی میں مصروف تھا۔ میں اکیلا ہی دمشق کے رنگ ڈھنگ دیکھتا رہا۔

دمشق شہر کے وسط میں سلطان عبدالحمید ثانی کا مزار ہے۔ یہ مزار شاہراہِ عام سے کافی نشیب میں ہے۔ اگر آپ کو مزار کے صحن میں جانا ہو تو کم از کم 35/40 سیڑھیاں نیچے زمین کے اندر اترنی پڑتی ہیں۔ ایک روز میں مزار کے صحن میں گھوم رہا تھا کہ مجھے سیڑھیاں نیچے اترتے ہوئے ایک نابینا حضرت مع ایک نوجوان لڑکے کے نظر آئے۔ میں انہیں بغور دیکھتا سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔ جیسے جیسے وہ میرے قریب آتے گئے ان کے بولنے کی آواز واضح ہوتی گئی۔ کیونکہ وہ بہت ہی فصیح و بلیغ اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ میرے تجسس میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں انہیں پہچاننے کی دماغی طور پر کوشش کرتا رہا۔ جب وہ میرے قریب آ گئے تو میں اٹھ کھڑا ہوا اور اونچی آواز میں السلام علیکم کہا۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاۃ۔ سپاٹ دار آواز میں جواب ملا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے بھی بہت احترام سے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ ہاتھ ملانے کے بعد میرا ایک ہاتھ انھوں نے مضبوطی سے تھام لیا۔ اب میں ان کو پہچان چکا تھا۔ یہ حضرت وحیدؒ تھے۔ حضرت وحیدؒ کون تھے اور میرا ان سے کیا تعلق تھا۔ قارئین کرام کی دلچسپی اور معلومات کے لیے لکھے دیتا ہوں۔

حضرت وحیدؒ میری قوم اور قبیلے سے تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ کو ہم پھوپھی ریاض کہتے تھے۔ وہ محلّہ ونگری گراں بہاول پور میں میرے والدِ محترم کے گھر (جس کو عرفِ عام میں کوتوال صاحب کی حویلی کہا جاتا تھا) کے ساتھ والے گھر کی اوپر والی منزل میں رہتی تھیں۔ اُس گھر کے نیچے والے حصے میں محمد حسین صاحب رہتے تھے جو مہذب، پڑھے لکھے، خوش لباس، خوش گفتار اور بابائے قوم محمد علی جناح کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ محمد حسین صاحب کی اہلیہ پھوپھی رقیہ صاحبہ اور پھوپھی ریاض صاحبہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ میں نے حضرت وحیدؒ کو پہلی بار دیکھا تو انہوں نے سوٹ یعنی کوٹ پینٹ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں بوبھی لگائی ہوئی تھی۔ پائپ منہ میں دبایا ہوا تھا۔ ماڈرن تھے اور روانی کے ساتھ انگلش بولتے تھے۔ زیادہ قیام لاہور میں تھا لیکن کبھی کبھار اپنی والدہ سے ملنے بہاول پور آیا کرتے تھے۔ لاہور میں ایک نائٹ کلب کے مالک تھے جو

اس وقت کی ماڈرن ترین آبادی گلبرگ میں تھا۔ ناؤ نوش اور رقص وسرور کے دلدادہ تھے۔ نظروں سے اور جام وسبو سے بے حساب پیتے تھے۔ کئی سال وہ انگور کی بیٹی اور خوبصورت حسیناؤں کے اسیر رہے۔ نہ جانے اللہ تعالیٰ کو اُن کی کون سی ادا بھا گئی کہ اپنی رحمت اور ہدایت کے دروازے حضرت وحیدؒ پر کھول دیے۔ انھوں نے اپنا کلب بند کر دیا۔ جام و مینا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہاں تک کے کلب کا فرنیچر بھی لوگوں میں تقسیم کر دیا اور تنِ تنہا کہیں گم ہو گئے۔ کئی سال بعد کسی عزیز نے دیکھا کہ ایک شخص سادہ سے کرتے پاجامے میں ملبوس، چہرے پر داڑھی، شکل نورانی، ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ لوگوں کو نماز روزے کی ترغیب دیتا ہے اور رو رو کر اللہ سے معافی مانگتا ہے۔ مستقل رونے سے آنکھوں کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ ہر وقت وجد کی کیفیت میں رہتا ہے۔

آخر حضرت وحیدؒ کی دعائیں قبول ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنے گھر مکہ معظّمہ بلا لیا۔ وہ پھر کبھی پاکستان لوٹ کر نہیں آئے۔ سالہا سال خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر عبادت کرنے والا یہ شخص حضرت وحیدؒ تھا۔ سعودی حکومت نے بھی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ شخص ولائیت کے عہدے پر فائز ہے، ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور خانہ کعبہ میں اُن کے لیے ایک جگہ مختص کر دی جہاں وہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے۔ انہوں نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ شام، عراق اور ترکی میں موجود زیارتوں پر حاضری دینا چاہتے ہیں۔ سعودی حکومت نے اُن کے سفری کاغذات، اخراجات اور ایک خادم کی سہولت فراہم کی تاکہ حضرت زیارات سے مستفید ہو سکیں۔ کیونکہ سالہا سال سے راتوں کو رو رو کر عبادت کرنے سے آنکھوں کی بینائی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔

میں نے انہیں آج 20 سال کے بعد دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ وحید صاحب ہیں؟ انہوں نے کہا جی آپ نے صحیح پہچانا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے ہنستے ہوئے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ تو آپ بتائیں گے کہ میں کون ہوں۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جھرجھری سی لی۔ پھر بولے ادریس! تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ آہستہ سے بولے ماموں اقبال صاحب کا کیا حال ہے؟ وہ میرے والدِ محترم کو ماموں کہا کرتے تھے۔ ان کے استفسار پر میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں زیارتیں کرنے آیا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور بولے کہ چلو میرے ساتھ کھانا اکھٹے کھائیں گے۔ میں انکار کرتا رہا۔ وہ بصد اصرار مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ المحافظ روڈ سے گزرتے ہوئے سیرین

عرب ائیر لائن کے دفتر پر نظر پڑی تو میں نے ان سے کہا کہ ایک منٹ اجازت دیں میں اپنی واپسی کی ٹکٹ کنفرمیشن کے بارے معلوم کرلوں۔ وہ بولے ٹھیک ہے۔ میں ائیر لائن کے آفس میں چلا گیا لیکن اُس وقت لنچ ٹائم تھا۔ میں انہی قدموں پر واپس آفس سے باہر نکل آیا۔ مگر ان چند سیکنڈوں میں نہ وہاں حضرت وحید تھے نہ انکا خادم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی وہ ملے ہی نہیں تھے۔ میں نے دائیں بائیں ہر طرف ان کو بہت بے چینی سے تلاش کیا مگر ناکامی ہوئی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے آپ سے کہا کہ ایک اللہ کے ولی کا ایک دنیا دار سے کیا کام۔ اور سر جھٹک کر ایک ہارے ہوئے شخص کی طرح پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

جب خانہ کعبہ پر حملہ آواروں نے یلغار کی اور قبضہ کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں کشت وخون ہوا۔ حضرت وحیدؒ جو اپنی جگہ پر موجود عبادت میں مشغول تھے زد میں آ گئے اور موقع پر ہی شہید ہو کر کربلائے معلیٰ میں دفن ہوئے۔

دو روز بعد میں اور طلال پھر دمشق سے 50 کلومیٹر دور حجر بن عدیؓ کے مزار کی طرف جا رہے تھے۔ حجر بن عدیؓ صحابی رسولؐ تھے۔ آپ کوفہ کے رہنے والے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فدائی تھے۔ امیر معاویہؓ نے اقتدار میں آتے ہی حضرت علیؓ پر سب وشتم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جب گورنر کوفہ زیاد ممبرِ رسول پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر سب وشتم جاری کرتے تو حجر بن عدیؓ ان پر کنکر پھینکتے تھے۔ کوفہ میں جب عمرو بن الحرسیث قائم مقام گورنر تھا تو اس کے حضرت علیؓ پر سب وشتم جاری رکھنے پر آپؓ نے اس کو بھی کنکریاں ماریں۔ عمرو نے انہیں گرفتار کر کے امیر معاویہ کے پاس دمشق بھجوا دیا اور لکھا کہ یہ شخص فتنہ فساد کی بنیاد ہے۔ امیر معاویہؓ نے چند شہادتیں لیں اور حجر بن عدیؓ کو قتل کروا دیا۔ جب ان کی گرفتاری کی اطلاع حضرت عائشہ صدیقہؓ تک پہنچی تو انہوں نے امیر معاویہؓ تک قاصد بھجوائے مگر قاصدوں تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں قتل کیا جا چکا تھا۔ آپؓ بلند مرتبہ صحابی تھے۔ اگلے سال جب امیر معاویہؓ حج کرنے گئے تو حضرت عائشہؓ کے ہاں حاضر ہوئے۔ آپؓ نے امیر معاویہ سے پوچھا ''معاویہؓ تمہیں بن عدی کے قتل پر اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں آیا''۔ امیر معاویہ نے جواب دیا ''انہیں ان لوگوں نے قتل کیا ہے جنہوں نے ان کے خلاف شہادتیں دیں''۔ حجر بن عدیؓ کا مزار ایک گاؤں کی مسجد میں واقع ہے۔

سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد ہم شام کو واپس دمشق آ گئے۔ واپسی پر قبرستان اہلِ بیت کے پاس

سے گزرتے ہوئے سڑک کے کنارے ہی حضرت اویس قرنیؓ کے مزار پر نظر پڑی تو ہم فوراً رک گئے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد مزار کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ صفائی کا انتظام بہت ناقص ہے۔ مجھے یہ تو زعم نہیں کہ میں نے ملک شام کی تمام زیارتیں کر لی ہیں مگر کوشش ضرور کی ہے۔طلال اگر نہ ملتا تو یقیناً بہت کمی رہ جاتی۔

شام خوبصورت لوگوں کی سرزمین ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خون کی آمیزش والی نسل اب تک موجود ہے۔ اتنے خوبصورت لوگ ہیں کہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اصل عیسائی لوگ بھی یہاں موجود ہیں جو بے انتہا خوبصورت ہیں۔ کیونکہ میں ایک مقدس شہر میں مقدس مقصد کی خاطر موجود تھا اس لیے حُسن سے متاثر ہونے والی رگ کو پھڑ کنے نہیں دیا اور اس کو صرف ہوائی جہاز کے اندر تک پابند رکھا۔ جہاں وہ شام کی فضائی حدود میں داخل ہونے سے پہلے تک خوب پھڑکی تھی۔سرزمین شام پہنچتے ہی میں نے اپنے دل اور دماغ سے حُسن والوں کو دیکھنا بند کر دیا تھا ورنہ لکھنے کو بہت کچھ تھا۔میری واپسی کی سیٹ کنفرمیشن کا سن کر طلال اداس ہو گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا بھی دل بہت اداس تھا مگر وقت اور حالات کے آگے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔

۔دمشق جس کو Damascus بھی کہتے ہیں۔
۔دمشق جس کو مشرق کا موتی بھی کہتے ہیں۔
۔دمشق جو الغتاح کے خوبصورت نخلستان میں واقع ہے۔
۔دمشق جو دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔
۔دمشق جس کی بنیاد تین ہزار سال قبل مسیح رکھی گئی۔
۔دمشق جہاں سے سینکڑوں سال پہلے میرے آباؤاجداد آئے تھے۔
۔دمشق جہاں اسلام کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوا۔
۔دمشق جہاں دنیا کا سب سے پہلا قتل ہوا۔

دمشق کی زہرہ جمالوں کی خدمت میں میرا نذرانہ عقیدت اور خراج:

دمشق خوبصورت خواتین کا مسکن ہے جن کا للکارتا ہوا جسم، کھنکتی آواز، حُسن و رعنائی کا نمونہ ہے۔ جن کے پاس سے گزرتے ہوئے بادِ بہاری کا احساس شدت سے محسوس ہوتا ہے۔

خِرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خُرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

کشیدہ قامت ونوخیز کلیاں جن کو دیکھ کر موسمِ بہار کا احساس ہوتا ہے کہ اہلِ دل اور اہلِ عشق کا دیوانگی سے بے قابو ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ مجھ جیسے غریب الوطن فقیر منش کا دیوانہ اور مدہوش ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ میں طلسم ہوش ربا کی داستانیں بچپن سے ہی پڑھتا آ رہا تھا اور اُن کے زیرِ اثر بھی تھا لیکن وہ صرف داستانیں تھیں اور اُن کی ساحراؤں کا وجود فرضی تھا۔ لیکن یہ زندہ جاوید چلتی پھرتی ساحرائیں حُسنِ بے حجاب و بے نقاب، شیشے کی صراحی میں سے نکلتی کھنکھناتی ہوئی شراب کی مانند نشے میں سہ آتشہ حُسن ورعنائی کا نمونہ وزرقون کی مانند دھمکتی ہوئی رنگت، نشیلی آنکھیں، دلکش نقوش، گلابی ہونٹ، پرکشش جسم۔ اگر پلیٹ میں رکھے ہوئے ہیرے گرنے کی آواز آئے تو سمجھ لیں کہ یہ پری زاد ہنس رہی ہے۔ مزید یہ کہ رنگ وروپ، حُسن و جمال، جسمانی لطافت، مسکراہٹ کی شادابی وشگفتگی، تازگی جیسے کِھلا ہوا گلاب۔ اگر قسمت ساتھ دے اور کوئی پری جمال مخاطب ہو تو نبض رُکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کی آواز اتنی اثر انگیز جیسے سحر پھونک دیا گیا ہو۔ کیونکہ ہوش وحواس پر بجلیاں کڑکنی شروع ہو جاتی ہیں۔

دراصل حُسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ اگر وہ انسان ہو تو۔ اگر وہ بے حِس ہو تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ لکھنے کو اور بہت کچھ ہے مگر اس خوف سے کہ قارئین کی طبیعت اُکتا نہ جائے اور میرے زخم ہرے ہو کر ناسور نہ بن جائیں۔ میں اس عنوان کو یہاں ہی ختم کرتا ہوں۔ حرفِ آخر کے طور پر تسلیم کرتا ہوں کہ ”دمشق ایک ایسا اہم شہر ہے جہاں مجھے دوبارہ جانے کی حسرت ہی رہی، جو آج بھی ہے“۔

قیامت خیز ہے افسانہ پر دردِغم میرا
نہ کھلواؤ زباں میری نہ اٹھواؤ قلم میرا

دوسرا باب

دجلہ کی پری

(ایک غریب الوطن کی کتھا)

19 جون 1966ء کو بہاولپور سے لندن کے لئے سکوٹر پر اپنا سفر شروع کرنے والے نوجوان کی داستان آپ کے لئے خاص طور پر لکھ رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں اپنے سکوٹر پر سفر کرتا ہوا ایران کے دارالخلافہ تہران پہنچ گیا۔ میں نے اپنے سکوٹر کے آگے ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف ایران کا جھنڈا لگایا ہوا تھا۔ دونوں جھنڈوں کے درمیان پاک ایران دوستی زندہ باد بھی لکھا ہوا تھا۔ میں جہاں سے بھی گزرتا لوگ ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کا وِرد کرتے۔ اگر پٹرول لینے کسی پٹرول پمپ پر رکتا تو لوگ آ کر ہاتھ ملاتے اور سلام دعا کرتے۔ کئی لوگ خرید کی گئی اشیاء کی قیمت لینے سے انکار کر دیتے، قہوہ آفر کرتے اور اگر کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دیتے۔ زادِراہ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کرنسی دینے کی پیشکش کرتے۔

زاہدان سے تہران تک کا فاصلہ، درمیانی شہروں میں رکتے ہوئے میں نے 42 روز میں طے کیا۔ راستے میں بم، قم، اصفہان، شیراز، کرمان شاہ اور نہ جانے کون کون سے شہر آئے۔ آج آدھی صدی گزر جانے کے بعد مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ کون سا شہر پہلے اور کون سا بعد میں آیا مجھے بس اتنا یاد ہے کہ بہت اچھے لوگ تھے اور انہوں نے بہت پیار دیا۔ سب لوگوں نے تحفے دیئے، ساتھ کھڑے ہو کر تصاویر بھی کھنچوائیں جو اگلے روز کے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع بھی کی جاتیں۔ تہران اس وقت بہت ماڈرن شہر تھا۔ شہنشاہ ایران کا تہران دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ایک سیاح کا ذاتی خیال اور محسوسات ہیں کسی کی بھی دل آزاری مقصد نہیں ہے اور نہ ہی آپ کا مجھ سے متفق ہونا ضروری ہے۔

میں ایک بے باک قسم کا انسان ہوں۔ خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوتا ہوں۔ پودے، درخت، ماحول، چرند پرند، بچہ، بوڑھا، خاتون غرض یہ کہ قدرت نے جس کو بھی حُسن عطا کیا ہے میں اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا سا بھی عار نہیں ہے کہ شہنشاہ کا ایران اپنی بھرپور جوانی اور شباب پر

تھا۔خواتین کی اکثریت منی سکرٹ، بلاؤز اور پنسل ہیل والے جوتے استعمال کرتی تھیں۔ ہاتھ میں پرس لٹکائے قیامت کی چال چلتی تھیں۔ حُسن بے حجاب کی مالک تو تھیں ہی اس پر خوبصورت آنکھوں، اداؤں اور کالے ناگ جیسی تیزی بھی تھی۔ خواتین کا دوسرا طبقہ اوپر دیئے گئے تمام لوازمات تو استعمال کرتا تھا لیکن کالے رنگ کی یا پھولدار چادر سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیتا تھا۔ جب یہ خواتین اپنی منزل کو پہنچ جاتیں تو چادر اتار کر ایک طرف رکھ دیتیں اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔

تیسرا طبقہ فراک اور پاجامہ نما کوئی چیز پہنتا تھا اور چادر کا استعمال کرتا تھا صرف ان کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ خیابان بوذر جمہوری ایک لمبی اور بارونق کاروباری سڑک تھی۔ تمام انٹرنیشنل بسوں کے دفاتر اور اسٹینڈ اسی سڑک پر واقع تھے۔ آپ نے عراق، شام، فرانس، جرمنی، غرض جہاں بھی جانا ہے آپ یہاں سے ایڈوانس بکنگ کرا سکتے ہیں۔ نہایت خوبصورت اور آرام دہ بسیں ہر وقت سروس کے لئے تیار تھیں۔ یہیں تہران کے نائیٹ کلب واقع تھے جنہیں لالہ زار کا نام دیا گیا تھا۔ اسی خیابان پر چلتے چلتے اگر آپ دو فرلانگ تک چلے جائیں تو بائیں طرف ایک قبرستان ہے۔ تقریباً ہر قبر پر مرنے والے کی تصویر بھی شیشے کے فریم میں لگی ہوئی ہے جو کہ قبر کے تعویز کے ساتھ منسلک کی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پراسرار اور ویران سی جگہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ محمد اصغر بروجردی جو کہ ایرانی پولیس ریکارڈ کے مطابق ایران کا سب سے زیادہ قتل کرنے والا مجرم تھا۔ اس نے اکثر قتل اسی جگہ لا کر کئے اور آخر کار اپنے ہی شکار کے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور پھانسی گھاٹ پر جا کر اس کی زندگی کا سفر ختم ہوا۔ تہران سے 6/7 میل کے فاصلے پر ''رے'' کا تاریخی اور قدیم شہر واقع تھا۔ اسی مقام پر مشہور صوفی اور بزرگ ہستی دفن ہیں جنہیں عوام شاہ عبدالعظیم کے نام سے جانتے ہیں۔ اس بزرگ کے مقبرے سے آگے شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے والد محترم رضا شاہ کا عالیشان مقبرہ تھا۔ رضا شاہ کا انتقال 1944 میں ساؤتھ افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں ہوا جہاں وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ پہلے پہل اُن کو قاہرہ لے جا کر بطور امانت دفن کر دیا گیا۔ 1950 میں ان کے تابوت کو تہران لا کر ''رے'' کے قدیم اور تاریخی شہر میں دفن کیا گیا۔

تہران کے کسی نہ کسی اخبار میں میری تصویر مع میری سواری کے چھپتی رہتی تھی اور خبر بھی کافی تفصیل کے ساتھ چھپتی تھی۔ کبھی انٹرویو کی صورت میں، کبھی دورانِ سفر تجربات کی روشنی میں۔ ایک روز پاکستان ایمبیسی سے ہوٹل کے کمرے میں فون آیا کہ جناب صلاح الدین لغاری، فرسٹ سیکریٹری آپ سے ملاقات کے

خواہش مند ہیں۔ آپ کل صبح 11 بجے سفارت خانے تشریف لائیں۔ میں دوسرے روز ہوٹل کے کاؤنٹر سے پاکستانی سفارت خانے کا ایڈریس لے کر وہاں جا پہنچا۔ کچھ دیر انتظار گاہ میں بٹھایا گیا اور پھر ملاقات کا شرف بخشا گیا۔ لغاری صاحب ایک خوش مزاج اور نفیس انسان تھے۔ انہوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا، چائے اور دیگر لوازمات سے تواضع کی۔ دورانِ گفتگو بولے میں اکثر اخبار میں آپ کی خبر پڑھتا ہوں، کل کے اخبار میں آپ کا انٹرویو بھی چھپا ہے جس میں آپ نے بہاولپور کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے کیونکہ میرا تعلق بھی بہاولپور سے ہے اس لئے مجھے اشتیاق ہوا کہ یہ کون سر پھرا ہے جو بہاولپور سے لندن سکوٹر پر محوِ سفر ہے۔ اس سے ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ بہاولپور کے نام سے میں چونک گیا اور پوچھا کہ بہاولپور کے کونسے علاقے سے آپ کا تعلق ہے۔ وہ بولے ضلع رحیم یار خان، رحیم آباد سے ہے۔ میں جھٹ سے بولا پھر تو رحیم الدین لغاری آپ کے عزیز ہونگے۔ اب چونکنے کی باری ان کی تھی وہ بولے وہ ہمارے بزرگ ہیں مگر آپ ان کو کیسے جانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ بہاولپور میں ڈی آئی جی پولیس تھے کیونکہ میرے والد محترم بھی پولیس آفیسر تھے۔ اس لئے ان کو جانتا ہوں۔ انہوں نے والد محترم کا نام پوچھا میرے بتانے پر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ بہت مشہور پولیس آفیسر تھے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ میرا چھوٹا بھائی ہارون لغاری صادق پبلک سکول بہاولپور میں زیرِ تعلیم ہے۔ میں بری طرح چونک پڑا اور انہیں بتایا کہ وہ میرا دوست ہے۔ وہ بولے کہ ہارون اپنی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے تہران آیا ہوا ہے۔ لغاری صاحب نے اسی وقت اپنے گھر کا نمبر ملایا اور ہارون کو لائن پر لا کر مجھے کہنے لگے لو اپنے دوست سے بات کرو۔ جب ہارون کو میں نے بتایا کہ میں تہران میں آپ کے بھائی جان کے پاس بیٹھا ہوا ہوں تو وہ بہت خوش ہوا اور بولا کہ تم دس منٹ صبر کرو میں آ رہا ہوں۔ ہارون آ کر بہت گرم جوشی اور محبت سے ملا اور ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر یہ دونوں بھائی مجھے اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا اور بہت محبت سے رخصت کیا۔ بہ وقتِ رخصت سفارت خانے کی طرف سے ایک ڈپلومیٹک نوٹ بھی مجھے دیا گیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ یہ پاکستان کا سیاح ہے اور سفارت خانہ درخواست کرتا ہے کہ یہ جس ملک میں بھی جائے اس کو ہر ممکن سہولیات فراہم کی جائیں جس کے لئے حکومتِ پاکستان اور سفارت خانہ پاکستان، واقع ایران، ممنون ہوگا۔

چند روز بعد میں ایران کی رنگینیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا عراق کی طرف جا رہا تھا۔ ایران سے عراق جانے والی سڑک ان دنوں نئی بنی تھی۔ اتنی صاف ستھری سڑک شاید میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ جون

1966ء میں جب میں نے کوئٹہ سے ایران جانے کے لئے سفر شروع کیا تھا تو صرف نوشکی تک تارکول والی سڑک تھی۔ اس کے بعد کوہ تفتان تک غیر پختہ سڑک تھی۔ کوہ تفتان سے میر جاوا تک، جو کہ ایران کا پہلا قصبہ ہے غیر پختہ اور شکستہ سڑک تھی۔ میر جاوا سے زاہدان اور پھر تہران تک گریول روڈ تھی۔

پتھریلے راستوں پر بلڈوزر سے جو راستہ بنایا جاتا ہے اس کو گریول روڈ کہتے ہیں۔ چھوٹے سائز کے پتھر کو گریول کہا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے پتھریلی سڑک کو گریول روڈ کہتے ہیں اور اس قسم کی سڑک پر سکوٹر سے سفر کرنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ یہ تو سکوٹر سوار یا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا لیکن اس جوش جنون ولولہ انگیزی اور شوق کا کیا کریں جو ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ جب اس نو تعمیر شدہ انٹرنیشنل روٹ پر میرا سفر شروع ہوا تو سکوٹر فراٹے بھرنے لگا۔ موسم بھی بہت اچھا تھا۔ لہٰذا بغیر کسی تھکاوٹ کے 450 میل کا سفر میں نے تین دن میں طے کیا۔ راستے میں کئی گاؤں اور قصبے آئے۔ رات کو قیام وطعام کا بندوبست ہو جاتا۔ بغیر کسی رکاوٹ اور تکلیف کے میں سفر کرتا ہوا قصرِ شیریں پہنچ گیا۔ اس وقت شام کے 7 بجے تھے۔ قصرِ شیریں ایک بہت خوبصورت جگہ تھی۔ لبِ سڑک ہی ایک بہت خوبصورت ہوٹل تھا جہاں میں نے قیام کیا۔ میرا اصول تھا کہ تمام دن سفر کرو جہاں مغرب کا وقت ہو جائے بادبان کھول دو اور آرام کرو۔

ایرانی نان اور سیخ کباب بے حد لذیذ تھے۔ چقندر کی چینی منہ میں رکھ کر ایرانی قہوہ پینے کا مزا کچھ جدا ہی تھا کیونکہ تھکا ہوا تھا اس لئے خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگا۔ صبح سویرے آنکھ کھلی تو اٹھ کر باہر نکل آیا۔ واقعی بہت خوبصورت جگہ تھی۔ وہاں کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ فرہاد نے دودھ کی نہر اس جگہ ہی کھودی تھی اور شیریں کی قبر بھی اسی جگہ ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ شیریں کی قبر کس جگہ ہے تو ایک بہت بڑے پتھروں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا کہ یہ شیریں کی قبر ہے۔ مگر میرا یا آپ کا ان باتوں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایک حکایت انہوں نے بیان کی ہم نے سن لی۔ بہر حال قصرِ شیریں کا چھوٹا سا شہر، خوبصورت لوگ، بہت خوبصورت ماحول اور موسم بے حد خوشگوار۔ یہ شہر چھوڑتے ہوئے میرا دل بہت برا ہوا مگر مجھے احساس ہوا کہ میں ایک سیاح ہوں اور مجھے مزید آگے بڑھتے ہی جانا ہے۔ میری کوئی منزل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر بڑھتے ہی جانا ہے اور یہ سوچ کر اداسی کو میں نے جھٹک دیا اور دائیں بائیں آنے جانے والی ٹریفک میں کھو گیا۔

آخر شام تک میں ایران عراق بارڈر تک پہنچ گیا مگر بدقسمتی سے بارڈر بند ہو چکا تھا۔ اس لئے رات

بارڈر پر ہی گذارنی تھی۔ کچھ ٹرک چند پرائیوٹ گاڑیاں اور چند یورپین لوگ بارڈر پر بنے ہوئے ایک بڑے ہال میں موجود تھے مگر ہال کے اندر گرمی تھی اس لئے سب لوگ No Man Land پر نیچے زمین پر ہی بیٹھے تھے۔ ایک جرمن جوڑا بھی تھا جو اپنے BMW موٹر سائیکل پر عراق سے ایران میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھے سکوٹر پر دیکھ کر یہ جوڑا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بات چیت کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ جرمنی سے ترکی، ترکی سے شام اور شام سے عراق میں داخل ہوئے اور اب یہاں بیٹھے ہیں۔ مجھے کہنے لگے کہ آپ کیونکہ پاکستان سے آ رہے ہیں آپ ہمارے ساتھ اپنا experience share کریں۔ جس راستے سے سفر کرتا ہوا میں پاکستان سے یہاں تک آیا تھا اسی راستے سے باتوں باتوں میں اُن کو پاکستان تک لے گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے لوگوں میں گھل مل گئے۔ جب رات زیادہ ہوگئی تو سب لوگوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس رات کو ایک یادگار رات بنا دیا جائے۔ سب اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ایرانی، عراقی، یورپین، پولیس، کسٹم والے اور دیگر سرکاری لوگ بھی شامل ہو گئے۔ یورپین لوگوں میں کسی کا تعلق فرانس، کسی کا سویڈن سے تھا، ہالینڈ کا جوڑا بھی تھا، عراقی ایرانی بھی تھے اور میں پاکستانی بھی تھا۔ یورپین لوگوں کے پاس گٹار تھے جبکہ ایرانی لوگوں نے میز اور گھڑے پکڑ لئے۔ ایک عربی بھاگا بھاگا گیا اور اپنے دفتر سے رباب اٹھا لایا۔ پھر کیا تھا سب نے مل کر وہ سماں باندھا کہ رات گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ خاص طور پر خواتین نے وہ رقص کیا کہ زمین ہلا کر رکھ دی۔

صبح 9 بجے نیا عملہ اپنی Land Rover جیپ میں آیا جنہوں نے تمام لوگوں کو کلیئر کیا اور عراق جانے والے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جن لوگوں نے ایران میں داخل ہونا تھا وہ ایران کی طرف چلے گئے اور یوں خوش مزاج لوگوں کی محفل تمام ہوئی۔ آخر میں بچھڑنے سے پہلے سب لوگوں نے ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے ہاتھ ملائے کہ اب کبھی نہ ملنے کے لئے بچھڑ رہے ہیں۔ یہ ایک اداس کر دینے والا منظر تھا مگر سیاح کسی اداسی کی پرواہ نہیں کرتا ورنہ وہ کسی ایک ملک کا ہو کر رہ جائے اور ملک ملک کی خاک نہ چھان سکے۔ مقامی وقت کے مطابق تقریباً 2 بجے میں کاظمین شہر میں داخل ہو گیا۔

کاظمین شہر حضرت کاظمؒ کے نام سے موسوم ہے اور آپ کا مزار مبارک اسی شہر میں ہے۔ مزار کاظمؒ کے بالمقابل فندقِ کاظمین تھا۔ فندق عربی میں ہوٹل کو کہتے ہیں اور اسی ہوٹل میں مجھے جگہ مل گئی اور میں نے بادبان کھول دیئے۔ صبح کی اذان ہونے سے پہلے میں تیار ہو کر سلام کے لئے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کی

خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گیا اتنے میں اذان ہوگئی۔ نماز کے بعد حضرت امام تقیؑ کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔ دونوں مزاروں کے اندر سونے کا نہایت نفیس کام کیا ہوا تھا۔ رنگ برنگے شیشوں کا کام بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ مسجد اور دونوں مزاروں کی تعمیر ایرانی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ لوگوں کا اژدہام بہت بڑا تھا۔ مسجد کے باہر فارسی میں لکھی گئی تحریر کے مطابق مسجد اور دونوں مزاروں کو شاہ اسمٰعیل صفوی نے 1515ء میں تعمیر کروایا تھا۔ زائرین کی اکثریت شیعہ مسلک کی تھی۔ میں 8 بجے تک مسجد اور دونوں مزاروں میں ہی رہا۔ کبھی اس جگہ کی شان و شوکت میں تو کبھی زائرین کی بھیڑ میں گم ہو جاتا۔ آخر باہر آ کر میں ایک طرف پیدل ہی چل پڑا۔ جب مین روڈ پر پہنچا تو کچھ خواتین الگ الگ بیٹھیں صبح کا ناشتہ آفر کر رہی تھیں۔ آوازیں جو مجھے سمجھ میں آئیں وہ کچھ اس طرح کی تھیں 'محبوبی اے طالبی اے، اس کے علاوہ کچھ سمجھ نہ آیا۔

توجہ کر کے بات سمجھنے کی کوشش کی تو بوڑھی عورت کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت لڑکی جھٹ سے بولی کیا تم انگریزی سمجھ سکتے ہو۔ جب اسکی مترنم آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا تو میں نے اس کی طرف پہلی بار بہت غور سے دیکھا۔ وہ کالی چادر میں ڈھکی چھپی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی بوڑھی عورت دیہاتی لباس میں تھی اور لکڑی کے سٹول پر بیٹھی اپنے سامنے رکھے ہوئے مٹکے میں سے کچھ سفید سیال نکال کر گلاس میں ڈال رہی تھی۔ میں نے لڑکی سے بات چیت کو طول دینے کے لئے کہا کہ میں ناشتہ کرنا چاہتا ہوں مگر جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں کیا کھا رہا ہوں اس وقت تک میں وہ چیز نگل نہیں سکتا۔ چاہے مجھے کتنی ہی بھوک کیوں نہ لگی ہو۔ وہ بہت صاف انگریزی میں بولی بے حد دلچسپ! پھر اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں اور بولی کہ ہمارے پاس دو قسم کے مشروب ہیں جو کہ دہی سے بنائے گئے ہیں۔ ایک میں سے مکھن نہیں نکالا گیا۔ دوسرا مشروب مکھن کے بغیر ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ لسی کے متعلق بتا رہی ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ ناشتے کے لئے ہمارے پاس دو پیکج ہیں۔

اس نے ایک لمبی ڈبل روٹی کی طرف اشارہ کیا جو کہ مچھلی کی شکل سے ملتی جلتی تھی اور کہا کہ اس کو درمیان میں سے کاٹ کر اس میں کھجور کے درخت کی گری، مکھن اور شہد لگا کر مع ایک گلاس مکھن والی لسی بہ عوض ایک دینار آپ کو دیا جائیگا۔ ابھی پیکج نمبر۲ وہ بتلانے جا رہی تھی تو میں نے اس کو منع کر دیا اور کہا کہ یہ میرا پسندیدہ ناشتہ ہے۔ برائے مہربانی مجھے بنا دیں۔ وہ جلدی سے ساتھ والی خاتون سے ایک سٹول مانگ لائی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے ساتھ والی بوڑھی خاتون سے عربی میں کچھ کہنے لگی۔ پھر اس کے ہاتھ سے

چیزیں لے کر بہت نفاست سے خود بنانے لگی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر بہت آرام اور سکون سے ناشتہ کیا اور اس کو پیسے دیکر واپس اپنے ہوٹل کی طرف جانے لگا تو وہ بولی کہ تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا کیا تم ہندی ہو۔ میں نے اسے تلخ سا جواب دیا کہ کیا میرے چہرے پر لکھا ہوا ہے کہ میں ہندی ہوں۔ پھر میں نے اسکو بہت پیار سے بتایا کہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور پاکستان کا باشندہ ہوں اور اپنے ملک سے دنیا کی سیر کرنے نکلا ہوں تو وہ بہت حیران ہوئی اور بولی کہ کہاں ٹھہرے ہو۔ میں نے اس کو بتایا کہ فندق کاظمین میں میرا قیام ہے اور اب روزانہ ناشتہ میں آپ کے پاس ہی کیا کروں گا۔ وہ بولی میرا نام لبنیٰ کریم ہے اور میں بغداد یونیورسٹی میں آثارِقدیمہ پر تحقیق کر رہی ہوں اور آخری سال میں ہوں۔ یہ میری نانی ہیں میں اپنے فارغ وقت میں ان کی مدد کرتی ہوں۔ ہم کُرد خانہ بدوش ہیں۔ میں خاموشی سے اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

ایک گھنٹے کے بعد میں ہوٹل کاؤنٹر سے بغداد کا نقشہ اور ضروری ٹورسٹ اطلاعات لے کر نکلا تو پھر اس کے پاس سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی اور پاکستان اور عراق کے جھنڈوں کے درمیان عربی اور انگلش میں پاک عراق دوستی زندہ باد لکھا دیکھ کر بولی کیا تم اس سکوٹر پر سفر کر رہے ہو۔ میں نے کہا تمہیں شک ہے۔ وہ بولی نہیں تمہاری ہمت اور حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کے بعد میں بغداد کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اپنے سکوٹر کے Side Mirror میں دیکھا تو وہ مجھے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

چار پانچ کلومیٹر کے بعد جیسے ہی میں دریائے دجلہ کے پُل پر پہنچا تو میں نے جتنی بھی طلسماتی اور تاریخی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں سب یاد آنے لگیں۔ میں نے بار بار دجلہ کے کناروں پر نظر دوڑانا شروع کر دی مبادا کوئی پری، جل پری یا دیو نظر آ جائے پر ایسا تو ممکن نہ تھا۔ جیسے ہی پُل ختم ہوا بغداد کا شہر شروع ہو گیا۔ بغداد کی سڑکیں صاف ستھری، آب و ہوا خشک اور گرمی بہت تھی۔ اس روز میں نے دل بھر کر آوارہ گردی کی۔ زبیدہ سکوائر، کنگ فیصل سکوائر، میدان سکوائر، یہاں کے مشہور چوک تھے۔ اس کے علاوہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مامون سٹریٹ، رشید سٹریٹ، عسکری سٹریٹ، غازی سٹریٹ، مستنصر سٹریٹ اور چھتا بازار بہت پر رونق تھے۔ موٹر کاروں اور بسوں کی بہتات تھی۔ راستہ ملنا مشکل ہو جاتا تھا۔ شام تک میں بے حد تھک گیا اور ہوٹل واپس آ گیا تا کہ صبح ایک نئے عزم کے ساتھ بغداد دریافت کرنے نکلا جائے۔

دوسری صبح میں تیار ہو کر ناشتہ کرنے فٹ پاتھ پر جا پہنچا۔ سلام دعا کے بعد لبنیٰ کریم کو میں نے غور سے

دیکھتے ہوئے کہا کہ اپنے ہاتھوں سے اسی طرح مجھے نمبر ا پیکج بنا کر دو۔ وہ مسکرائی اور اچھی سی ڈبل روٹی تلاش کرنے لگی۔ یہ واقعی ایک ہیوی ناشتہ تھا گذشتہ روز یہ ناشتہ کرنے کے بعد مجھے دن بھر بھوک نہ لگی۔ ناشتہ کرنے کے دوران وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے کہنے لگی گذشتہ روز تم بغداد کے کون کون سے علاقے میں گئے تھے۔ میں نے اس کو تفصیل سے مندرجہ بالا تمام مقامات کا بتایا کہ بغداد ہمارے لاہور جیسا شہر ہے۔ صرف لباس اور زبان کا فرق ہے۔ دیگر مجھے تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور آج میرا امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر جانے کا ارادہ ہے جنہیں ہم امام اعظم کہتے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ تم نے ان گنت سوال کئے ہیں کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں؟ اس نے کہا کہ آپ سوال کریں میں توجہ سے سن رہی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ تم اتنی conservative کیوں ہو جبکہ یونیورسٹی کی اکثر لڑکیاں بے حد ماڈرن ہیں؟ وہ بولی میں بہت Straight Forward ہوں اور modernization کو پسند کرتی ہوں اور دو قدم پیچھے ہو کر اس نے اپنی سیاہ ریشمی چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے اپنے اندر کا لباس مجھے دکھا دیا جو کہ منی سکرٹ اور بلاؤز پر مشتمل تھا۔ وہ ایک بے حد خوبصورت جسم کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور صاف گوئی اس کے اچھے مستقبل کی ضامن تھی۔ وہ بولی کیونکہ میں ایک کُرد خانہ بدوش قبیلے کی فرد ہوں اس لیے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا اور ہمیں اچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا جاتا۔ ماضی اور حال میں بھی ہمارا قتل عام کیا گیا۔ آج کل چھٹیاں ہیں، میرا قبیلہ اپنے علاقے سے نکل کر روزی کرنے بغداد آیا ہوا ہے۔ جس ہوٹل میں تم قیام پذیر ہو اس طرف سے اگر تھوڑا پیدل چل کر جاؤ تو تم اپنے آپ کو ایک کھلے میدان میں پاؤ گے، اس میدان میں تمہیں بہت سے ٹینٹ لگے ہوئے ملیں گے وہ میرا قبیلہ ہے۔ ہمارے مرد دن کو تمام جانور دور دیہاتی علاقوں میں لے جاتے ہیں اور خواتین زیارت گاہ امام موسیٰ کاظمؒ کے ارد گرد زائرین کو دودھ، دہی، لسی، جنگلی شہد اور کھجور کی گری فروخت کرتی ہیں۔

میں نے حیرانی سے پوچھا کہ تمہارا اس حد تک تعلیم یافتہ ہونا، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی میرے والد بھی ایک پڑھے لکھے کُرد ہیں لیکن وہ اپنے کُردی ماحول میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہمارے قبیلے کے دیگر لڑکے لڑکیاں بھی زیرِ تعلیم ہیں۔ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا کہ میں تمہارے لئے اور تمہارے قبیلے کے لئے دعا گو ہوں اور رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو کامیابی عطا کرے۔ آمین!

وہ تشکر بھرے لہجے میں بولی تم کُردوں کو اچھا سمجھتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں کسی بھی انسان کو برا

نہیں سمجھتا جب تک وہ برائی نہ کرے، اور میرا مذہب عرب، عجم یا گُر دغرض یہ کہ کسی کو بھی کسی پر فوقیت نہیں دیتا۔ وہ حیرانی سے بولی کیا یہ بات تم عارف عبدالرحمٰن کو نہیں سمجھا سکتے۔ (عارف عبدالرحمٰن اس وقت عراق کے صدر تھے)۔ میں نے کہا کہ اگر نبی کریم ﷺ کے سمجھانے سے بھی کوئی نہیں سمجھتا تو میں کیا میری اوقات کیا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی اصل مسلمان تو آپ لوگ ہیں۔ میں اس کو حیران پریشان چھوڑتا ہوا سکوٹر پر سوار ہو کر دریائے دجلہ کے پُل کی طرف چل پڑا۔ پُل کراس کرتے ہی بغداد میں داخل ہو کر اپنی منزل کا تعین کرنے لگا۔ آج مجھے امام اعظمؒ کے مزار کی زیارت کرنی تھی۔

امام اعظم کا اسم گرامی نعمان تھا، کنیت ابوحنیفہ تھی اور امام اعظم لقب تھا۔ حنفی مدرسہ فکر کے لوگ ان کے پیروکار ہیں۔ میں نے امام اعظمؒ کے مزار پر حاضری دی۔ مزار پر ایک بہت بڑا عالی شان گنبد بنا ہوا تھا۔ جالیوں پر چاندی کا خوبصورت کام کیا گیا تھا۔ مزار کے ریکارڈ کے مطابق یہ گنبد خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مزار کے قریب ہی ایک مسجد ہے جسے شاہ الپ ارسلان نے 1200ء میں تعمیر کروایا تھا۔ سلطان سلیمان اعظم نے اس کو 1524ء میں دوبارہ تعمیر کروایا تھا۔ مزار کی جالیوں کے ساتھ منت کے تالے لگے ہوئے تھے۔ منت پورا ہونے پر تالے کھول دیئے جاتے۔ میں حیران ہوا کہ یہ بدعت یہاں بھی ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں محلّہ باب الشیخ جا پہنچا۔ جہاں پر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مزار ہے۔ مزار کا گنبد بغداد میں خوبصورت ترین شمار ہوتا تھا۔ منت کے تالے یہاں بھی دیکھنے میں آئے۔ یہ واحد مزار ہے جہاں میں اکثر ظہر کی نماز جا کر پڑھتا اور نماز پڑھنے کے بعد عصر تک ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات سر قبر کے پاؤں کی طرف کر کے لیٹ جاتا۔ کبھی سوتا کبھی جاگتا اور عصر کی نماز پڑھ کر واپس آ جاتا تھا۔ اسی طرح ابوبکر شبلیؒ کے مزار پر حاضری دی جن کا مزار امام اعظمؒ کے مزار کے قریب ہی ایک قبرستان میں تھا۔ مزار کے کتبے کے مطابق 1319ء میں سلطان عبدالحمید ثانی نے کتبہ لگوایا تھا۔ تیسرے روز میں صبح نماز کے وقت ہی اپنا سکوٹر سنبھالے کربلائے معلیٰ جانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ جلدی جانے کا مقصد یہ تھا کہ جلدی لوٹ آؤں کیونکہ بغداد سے کربلا کا فاصلہ 100 کلومیٹر تھا۔ میں لبنیٰ کریم کی جگہ کے پاس سے گزرا تو اس کے بغیر جگہ ویران نظر آئی مگر سفر زیادہ تھا اس لئے جلدی سے گزر گیا۔ اکا دکا ٹریفک تھی ابھی شہر جاگا نہیں تھا اس لئے راستہ تلاش کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ بغداد سے کربلا جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف پانی کی نہریں، باغات، فصلیں بہت خوبصورت مناظر تھے۔ 3 گھنٹے کے بعد میں ایک عظیم الشان عمارت

کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاں پر شہید اعظم، سید الشہداء حضرت امام حسینؑ مع اپنے دونوں جگر پاروں حضرت علی اکبرؓ اور حضرت علی اصغرؓ کے آرام فرما رہے ہیں۔ اردگرد چاندی کا کٹہرا بنا ہوا ہے اور منت کے تالے یہاں بھی پڑے ہوئے تھے۔ عمارت بہت وسیع اور عالی شان تھی۔ گنبد پر طلائی کام، درودیوار پر گلکاری اور آئینہ بندی کا کام دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں سے سلام پیش کرنے کے بعد قریب ہی حضرت عباسؓ کے روضے پر حاضری دی۔ پھر حضرت قاسمؓ جو کہ اسی قبہ میں آرام فرما رہے ہیں ان کی خدمت میں سلام عرض کیا اور فاتحہ پڑھی۔ قریب ہی کونے میں ایک جگہ دکھائی گئی تھی جہاں پر شہیدِ اعظم نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر حضرت حُر بن ریاح کا مزار ہے جو کہ یزیدی فوج کے افسر تھے مگر جنگ کے وقت حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پیش ہو کر بیعت کی اور بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ نجف اشرف یہاں سے 100 کلومیٹر ہے تو میں نے بغداد جانے کا پروگرام مؤخر کر دیا اور نجف اشرف کی طرف چل پڑا۔ جہاں پر حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کا روضہ مبارک ہے۔ جب آپؓ چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے تو آپ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالحکومت مقرر فرمایا۔ ایک صبح ایک خارجی ابن علم نے آپؓ کو خنجر مار کر شہید کر دیا۔ مزار بہت خوبصورت بنایا گیا تھا اور سونے اور چاندی کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ آئینہ بندی بھی بہت خوبصورت تھی۔ سونے چاندی کی قندیلیں لٹک رہی تھیں۔ مزار کے اردگرد بھی چاندی کی جالی تھی۔

قریب ہی حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے مزارات تھے، میں نے وہاں بھی حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔ کوفہ نجف اشرف سے 10 کلومیٹر تھا جہاں حضرت علیؑ کو شہید کیا گیا تھا۔ وہاں سے منبر و محراب بنا کر اس جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس کے قریب ہی حضرت مسلم بن عقیلؓ اور بنت حضرت علیؑ کے مزارات ہیں۔ کوفہ میں ہی حضرت نوحؑ، امیر مختارؒ، ہانی ابن عروہ، عبداللہ بن جابر، انصاری حدیقہ ایمانی، حضرت علی سید محمد طاہر بن الحسین بن علی کے مزارات دیکھے۔ پھر حضرت یونسؑ کے مزار پر حاضری دی۔

کوفہ سے حلہ جاتے ہوئے 20 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مسجد میں حضرت ذوالکفل کا مزار تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ وہاں چند یہودی بھی کھڑے دعا مانگ رہے تھے۔ حلہ سے 8 کلومیٹر کے فاصلے پر بابل ہے۔ قرآن پاک میں ہاروت ماروت کا ذکر موجود ہے اور روایات بھی موجود ہیں۔ میں نے اپنی تصنیف ۔۔فرشتے کی

ایف آئی آر۔۔میں جادو اور سحر کے حوالے سے ہاروت اور ماروت کا تفصیلاً ذکر کیا ہے، تاہم قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے مزید عرض کئے دیتا ہوں۔

ہلہ سے 8 کلومیٹر اور بغداد سے 55 کلومیٹر کے فاصلے پر بابل واقع ہے۔ میں نے بجائے واپسی کے سوچا یہاں سے بابل جاؤں اور وہاں سے بغداد۔ میں آیا تو ایک دن کے لئے تھا مگر آج مجھے چار یوم ہو گئے تھے۔ نہ ڈھنگ سے سویا تھا اور نہ ہی کھانا میری مرضی کا ملا تھا۔ بس جو کچھ ملا صبر شکر کر کے کھا لیا۔ جس کونے میں جگہ ملی ذرا سستا لیا کوئی غم فکر نہ تھا۔ پوری دنیا ہی میری تھی۔ جہاں قدم رکھ دیا اسی کا مالک بن بیٹھا اور پھر پیچھے دیکھے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اور آخر شدید گرمی میں صبح 9 بجے بابل پہنچ گیا۔

میرے ذہن میں جو کچھ تھا وہ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور بے حد شوق رکھتا تھا کہ میں بھی اس جگہ کو دیکھ سکوں۔ آج میرے قدم زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے۔ میرے ذہن میں قرآن پاک کی سورۃ بقرہ کے الفاظ کچھ یوں محفوظ تھے،''یہودیوں نے بجائے تورات کے، جادو کی ان باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا جو حضرت سلمانؑ کے زمانے میں شیطان لوگوں کو سکھاتے تھے اور اس جادو کو حضرت سلمانؑ کے نام سے منسوب کرتے تھے کہ یہ علم ان پر اترا ہے اور اس کی بدولت ان کو سب پر دسترس حاصل ہے۔ حالانکہ ان کفریات کا حضرت سلمانؑ سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ خود شیطان ہی ان کفریات کے موجد تھے اور لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ جادو دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا وہ اس علم سے واقف ضرور تھے پر کسی کو سکھاتے نہ تھے بلکہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تم لوگوں کے امتحان کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور تم اس جادو کو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ مگر یہ لوگ خود ہی کچھ اڑتی ہوئی باتوں کو سن کر اور اس کے ذریعے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتے اور لوگ ادھر ادھر سے جادو کی خرافات سیکھ لیتے جو انہیں نقصان ہی پہنچاتی تھیں، نفع خاک پہنچاتی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جو اس جادو پر عمل کرے گا وہ آخرت میں ذلیل ہوگا اور جادو کی وجہ سے ہی انہوں نے اپنے آپ کو مبتلائے عذاب کر رکھا ہے۔ جادو بہت ہی بری چیز ہے کاش وہ اس بات کو جانتے۔''

جب میں بابل میں ہاروت ماروت کے کنویں کے پاس پہنچا تو دیکھا تین چار فٹ قطر کا ایک کنواں ہے جس میں پتھر پھینکنے پر مجھے پانی ہونے کا احساس ہوا۔ روایت ہے کہ اس کنویں میں ہاروت ماروت الٹے لٹکے ہوئے ہیں اور قیامت تک لٹکے رہیں گے۔ جب میں بابل شہر کے اندر داخل ہوا تو ایک ریسٹ ہاؤس پر نظر

پڑی۔ساتھ ہی ایک عجائب گھر بھی تھا۔اگر آپ شاہراہ جلوس سے ہوتے ہوئے باب العشرت تک چلے جائیں تو پھر آپ جنوبی محل میں پہنچ جائیں گے۔وہاں ایک شیر کا مجسمہ ایستادہ ہے جو سیاہ پتھر کا بنایا گیا ہے۔اس شیر کا نام بابل ہے۔آج میں نے اپنے خواب کی تعبیر دیکھ لی تھی کہ یہ کیا لوگ تھے اور کیا ان کی تہذیب تھی۔

اس کے بعد رات تک سفر کرتا ہوا بغداد پہنچ گیا۔ مجھے بابل میں ہی مغرب ہو گئی تھی۔ میں بابل میں جہاں بھی جاتا میرے قدم میرے حکم سے باہر ہو جاتے اور میں گھنٹوں آنکھیں بند کئے ہزاروں سال پرانی تہذیب دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بابل سے بغداد آنا پڑا۔تھک کر چور ہو چکا تھا آتے ہی کمرے میں گر کر سو گیا۔صبح نماز کے وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور ۸ بجے آنکھ کھلی۔۹ بجے تک تیار ہو کر جلدی جلدی ناشتے والی جگہ پر پہنچا۔لبنیٰ کریم مجھے دیکھ کر بہت خفا ہوئی کہ تم ایک دن کے لئے گئے تھے اور آج پانچواں دن ہے۔ میں نے بہت دعائیں مانگیں کہ تم خیریت سے ہو۔میرے تفصیل سے بتانے پر وہ بولی تم مجھے اتنے مذہبی نظر تو نہیں آتے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کٹر مذہبی نہیں ہوں۔ میں نماز ہر جگہ پڑھ لیتا ہوں چاہے گرجا گھر ہو، شیعانِ علی کی مسجد ہو، امام بارگاہ یا سنی مسجد ہو۔ میں فرقہ بندی کو نہیں مانتا۔ وہ بے حد خوش ہوئی اور بولی تم ایک اچھے اور سمجھدار لڑکے ہو۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں شیعہ نہیں ہوں مگر واپسی پر میں امام موسیٰ رضاؒ کے مزار کی زیارت کے لئے جانے کی تمنا رکھتا ہوں اور ارادہ بھی ہے آگے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔

آج بھی ناشتہ لبنیٰ کریم نے اپنے ہاتھ سے ہی بنایا۔ میں نے بہت آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔حسبِ معمول میں نے ناشتے کا بل دینے کی کوشش کی تو وہ مسکرا کر بولی آج میری طرف سے۔ میں نے بل دینے کے لئے اصرار کرتے ہوئے پیسے نکالے تو وہ ناراضی سے بولی گذشتہ چار روز سے تم نے مجھے جس اذیت اور پریشانی میں مبتلا کئے رکھا تھا مجھے آج اس سے نجات مل گئی ہے۔اس لئے اس خوشی میں ناشتہ میری طرف سے ہے اور اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں ہوگی۔آج تم نے کس طرف جانا ہے وہ بات بدلنے کی خاطر مسکرا کر بولی۔ میں نے اسے بتایا کہ بغداد نبیوں، پیغمبروں اور اللہ کے ولیوں کی سرزمین ہے اور ابھی بہت سی زیارتیں رہتی ہیں۔ وہ بولی تم کب تک بغداد میں ہو۔ میں نے کہا جب تک تم کہو گی میں بغداد میں ہی رہوں گا۔ وہ بولی کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ یہاں ہی رہو۔ میں مسکرایا تو وہ بولی تم ایک شرارتی لیکن ایک بہت پیارے لڑکے ہو۔اب میں نے بات بدلنے کی خاطر اسے کہا کہ آج تم نے

اپنی نانی جیسا لباس کیوں پہنا ہوا ہے۔ وہ بولی نہیں تو اور ساتھ ہی اس نے اپنی کالی چادر جو کہ اس کے بے حد حسین چہرے پر بہت خوبصورت لگتی تھی ایک لمحے کے لئے کھول کر پھر بند کر لی۔ میں کھلکھلا کر ہنس دیا اور بولا آج کا دن میرا بہت اچھا گزرے گا۔

اب وہ میری شرارت سمجھ گئی تھی اور ناراضی سے بولی!...You crazy boy اسی دوران میں سکوٹر کو کک لگا چکا تھا۔ اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور میں دریائے دجلہ کے پل کی طرف چل پڑا۔ اور جلد ہی میں بغداد میں داخل ہو گیا۔ آج حضرت یوشعؑ، حضرت جنید بغدادیؒ، شیخ سری سقطیؒ، حضرت بہلول دانأؒ، حضرت ابراہیم خواصؒ، حضرت معروف کرخیؒ کے مزار پر جانا تھا۔ حضرت معروف کرخیؒ کے نام پر ایک سٹریٹ بھی ہے جس کا نام شیخ معروف سٹریٹ ہے۔ اسی سٹریٹ کے کونے پر آپ کا مزار ہے جس پر کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔ جو کہ ترک زبان میں ہے اور 1313ء میں لگایا گیا تھا۔

ملکہ زبیدہ جو کہ خلیفہ ہارون رشید کی ملکہ تھی کا مزار ریلوے شیڈ کے قریب ہے۔ یہ وہی ملکہ ہے جس نے زبیدہ نامی نہر عراق سے مکہ (سعودی عرب) تک بنوا کر عالمی شہرت حاصل کی۔ لوگ آج تک اس نہر سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ مزار کی حالت بہت خستہ تھی جسے دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس کے بعد شیخ عمر سٹریٹ کے وسیع قبرستان گیا۔ جہاں امام غزالیؒ کا مزار ہے۔ زیارت کرنے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد بغداد سے 30 کلومیٹر محل کسریٰ کے کھنڈرات دیکھنے چلا گیا۔ 90 سے 95 فٹ اونچی ڈاٹ اور اسکی دیواریں اب بھی قائم ہیں اور اس زمانے کے فن تعمیر کو اجاگر کئے ہوئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر پورا محل متزلزل ہو گیا تھا اور اس کے کنگرے گر گئے تھے۔

واپسی پر حضرت سلمان پاکؒ کے مزار پر حاضری دی۔ جس جگہ پر یہ مزار ہے اس قصبے کا نام آپ کے نام پر ہی رکھا گیا ہے۔ شام تک میری واپسی ہوئی تھکاوٹ کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں اٹھا اور امام موسیٰ کاظمؒ کے مزار پر چلا گیا کیونکہ آج جمعرات کی رات تھی اس لئے اتنا رش تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ زائرین ایران، عراق، شام اور نہ جانے کہاں کہاں سے آئے تھے۔ حُسن کا ایک بحر بیکراں تھا جو مجھ جیسے کمزور انسان کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ کچھ حُسن پردہ نشین تھا کچھ بے حجاب تھا۔ آنکھیں اتنی خوبصورت کہ لکھنا محال ہے۔ ان آنکھوں سے کچھ لہریں نکل کر جسم و جاں کے آر پار ہوئے جا رہی تھیں۔ اس حسن بے پردا کو کیا معلوم ایک غریب الوطن مسافر سامنے زمین پر بیٹھا حسن کی خیرات کا طلب گار ہے۔ یہ فقیر تو صرف نگاہوں

سے ہی خیرات مانگ سکتا ہے۔ جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ میرے دل سے بے اختیار ان پریوں کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں۔ ان کو ہی میں نے اپنے بچپن میں طلسماتی کہانیوں میں پڑھا تھا۔

مگر بقول شاعر

میرا درد نغمۂ بے صدا

میری ذات ذرہ بے نشان

میں نے محسوس کیا کہ غزالوں کے ریوڑ میں سے ایک غزالی مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔ جب کچھ دور چلی گئی تو پلٹ کر ہاتھ سے کچھ اشارہ بھی کیا۔ مجھے سمجھ نہ آیا اور میں نے ذہن کو جھٹک دیا اور خود کلامی میں اپنے آپ سے کہا ''ایسی قسمت میری کہاں۔۔۔''

ابھی سوچوں میں غلطاں ہی تھا کہ میرے قریب ایک غزالی آ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے حیرانی سے دیکھا اور کچھ سمٹ کر فاصلہ پیدا کیا کہ یہ برا ہی نہ مان جائے۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو آواز کچھ جانی پہچانی تھی جو کہہ رہی تھی کہ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہو کیا وطن میں کوئی یاد آ رہا ہے۔ تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو میری اَن داتا ہے جو روزانہ صبح مجھے اپنے نفیس اور خوبصورت ہاتھوں سے ناشتہ بنا کر دیتی ہے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور بے اختیاری سے میں نے اسے کہا کہ تم لبنیٰ۔۔۔ وہ بولی ہاں میں ہی ہوں مگر تم مجھے اتنے سنجیدہ اور اداس پہلے کبھی نظر نہیں آئے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا لبنیٰ میں دجلہ کی پری دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ بچپن سے اب تک میں ہزار داستان سیریز کی کہانیاں پڑھتا چلا آ رہا ہوں جس کی ہر کہانی میں دریائے دجلہ، اس کی پریاں اور کالے دیو کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ آج میں دریائے دجلہ کی سرزمین پر موجود ہوں اور میں نے اس کی پری کو بھی دریافت کر لیا ہے۔ وہ بہت پریشانی سے بولی تو کہاں ہے وہ پری۔ میں نے اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ پری میرے سامنے بیٹھی ہے۔ وہ بولی میرا ہاتھ چھوڑ دو یہاں پر اس طرح ہاتھ پکڑ کر بیٹھنا اور گفتگو کرنا سخت منع ہے۔ یہ رات کا وقت ہے کسی نے نوٹس نہیں لیا میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ پھر میں نے لبنیٰ کو کہا کہ میں اپنی شدید خواہش کے باوجود ابھی تک دجلہ کے کنارے نہیں گیا۔۔ کیوں؟ وہ بولی۔۔ میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ اگر میں دجلہ کے کنارے گیا تو صرف اور صرف تمہارے ساتھ جاؤنگا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہ وزاری کی کہ تم میرے ساتھ دجلہ

کنارے چلو۔ میری شدید خواہش اور منت سماجت پر وہ کچھ نیم رضامند ہوگئی اور بولی تم ناشتے والی جگہ پر اپنے سکوٹر سمیت آجاؤ پھر چلتے ہیں۔

میں خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک طرف چلی گئی اور میں جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا بلکہ ہوا میں معلق نیچے کی طرف بغیر کسی پیراشوٹ کے گر رہا تھا۔ 10 منٹ کے بعد میں ناشتہ والی جگہ پر پہنچ گیا اور لبنیٰ بغیر چادر کے اپنے ماڈرن لباس میں آ گئی۔ اس قسم کے لباس کا ان دنوں ایران عراق میں بے حد کریز تھا۔ فیشن بھی تھا اور اشرفیہ کی کریز بھی تھی۔ دقیانوسی لوگوں کو چھوڑ کر دیگر لوگ اور خاص طور پر نوجوان خواتین کا من پسند لباس تھا۔

وہ جھٹ سے سکوٹر پر بیٹھ گئی اور مجھے دریائے دجلہ کے پل کی طرف جانے والے راستے کو Bypass کرنے کا کہنے لگی۔ وہ بتاتی گئی اور میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر چابی والے کھلونے کی طرح عمل کرتا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں دجلہ کے کنارے پر تھے۔ میرا خواب، میری خواہش اور دجلہ کی پری میرے ساتھ رات کے 2 بجے کا وقت۔ وہ بولی آؤ میں تمہیں کشتی کی سیر کراتی ہوں۔ دیگر بڑی کشتیوں کے ساتھ دریا کے کنارے ایک درمیانے سائز کی کشتی بندھی ہوئی تھی وہ اس نے کھولی اور مجھ سے پوچھا کیا تم کشتی چلا سکتے ہو۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ مسکرائی اور بولی میں چلا سکتی ہوں اور پھر کشتی میں سوار ہم دریا کے وسط میں پہنچ گئے۔ اس نے پوچھا کہ اب تمہاری ہزار داستاں کیا کہتی ہے؟ میں نے کہا کہ میں اس وقت دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہوں۔ دریائے دجلہ مع اپنی پری کے جو کہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں سے لبریز ہے، میرے سامنے ہے اور میں دجلہ کے سینے پر سوار ہوں جبکہ میرے بھولے بھالے بچپن پر ایک لعنتی دیو☆ کی حکومت تھی جس کو میں شکست فاش دے کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ بے حد حیران ہوئی اور بولی کیا مجھے نہیں سناؤ گے اپنی داستان۔۔۔!

پھر مجھے بتانے لگی کہ طلسماتی کہانیاں، ہزار داستاں اور حاتم طائی کی کہانیاں عرب کلچر اور تاریخ کا حصہ ہیں اور میں حیران ہوں کہ تمہارے ملک میں بھی یہ لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ وہ پھر بچوں کی طرح ضد کرنے لگی کہ تم بھی مجھے اپنی روداد سناؤ میں نے اس کے سامنے اپنی زندگی کے حالات و واقعات سے پردہ اٹھانا شروع کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ کچھ واقعات پر تو اس کے رونے کی سسکاریاں صاف صاف سنی جا سکتی تھیں۔

☆ لعنتی دیو سے مراد ڈاکٹر قدیر احمد MFMP ہے۔ تفصیل کے لیے پڑھیں ''فرشتے کی ایف آئی آر'' جلد اوّل

پھر وہ بولی صبح کی اذان ہونے والی ہے اور مجھے واپس روضہ حضرت موسیٰ کاظمؑ جانا ہے اور صبح کی نماز با جماعت ادا کرنی ہے لہٰذا اب واپس چلتے ہیں اور ہم کشتی کو کنارے پر لے آئے۔ میں نے اسے کہا ایک اور درخواست ہے وہ بولی تم درخواست پیش کر سکتے ہو میں ہمدردانہ غور کروں گی۔ میں نے کہا ہم پھر کب آ سکتے ہیں اس دجلہ کی آغوش میں؟ وہ بولی یہ میں بعد میں بتاؤں گی اور ناشتے پر ملاقات نہیں ہو گی میں آج تمام دن نیند کے مزے لوں گی۔۔۔اور میں بھی۔ میں نے اسے اپنی طرف سے کہا۔ وہ بولی تم میرے آگے آگے چل کر کچھ دور جا کر ٹھہر جاؤ اور تم نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ میں کچھ بولے بغیر چل پڑا اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد کوئی چیز مجھ سے آ کر ٹکرا گئی اور میں نے ایک جھٹکا کھایا مگر پھر سنبھل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھ سے لپٹا ہوا ہے اور ہلکی سی آواز آئی۔

''اے اجنبی! میں دجلہ کی وہی پری ہوں جس کو تم کہانیوں میں پڑھ چکے ہو، خواب میں دیکھ چکے ہو اور آج دریا کے سینے پر اس کے ساتھ دجلہ کی سواری کر چکے ہو۔ ہاں میں ہی وہ پری ہوں۔ اور پریوں کو چاہنے والے بھی عظیم ہوتے ہیں اور تم ایک عظیم انسان ہو جو دجلہ کی پری کو دیکھنے ہزاروں میل کا سفر کرتے ہوئے دجلہ پر آ پہنچا۔''

اس کے بعد جن راستوں سے ہم گئے تھے انہی راستوں سے ہم واپس ہوئے اور ہاں اس پری نے کالی چادر لے کر اپنے حُسن کو ڈھانپ لیا تھا مبادا کسی کالے دیو کی نظر نہ پڑ جائے۔ ناشتے والی جگہ پر میں نے اس کو اتار دیا اور ہوٹل کے کمرے میں جا کر پھر پریوں کے دیس میں پہنچ گیا۔ شام کے تقریباً 4 بجے ہوش آیا اور رات کے تمام منظر دماغ کے ذریعے آنکھوں میں فلم کی طرح چلنے شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اٹھا غسل کر کے تیار ہوا اور بغداد کی شام کو دریافت کرنے نکل کھڑا ہوا۔ ایک جگہ سے گزرا تو احساس ہوا کہ یہ تو سینما گھر ہے اور اس پر جانور نامی ہندی پکچر چل رہی ہے۔ میں بھی ٹکٹ لے کر فلم دیکھنے بیٹھ گیا۔ شدید خواہش تھی کہ کاش لبنیٰ بھی میرے ساتھ ہوتی۔ فلم کے ہیرو شمی کپور کی اچھل کود اور گانوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب تک فلم ختم ہوئی بھوک زوروں پر تھی۔ پھر ایک نائیٹ کلب میں چلا گیا۔ وہاں کا باربی کیو اور مصری رقاصاؤں کا بیلے ڈانس قابل ذکر تھا۔ واپس آ کر سونے کی کوشش کی مگر نیند کوسوں دور تھی۔

صبح جلد ہی تیار ہو کر ناشتہ کرنے جا پہنچا۔ میں نے محسوس کیا کہ لبنیٰ بھی کچھ بے چین سی تھی۔ میں نے کئی بار پوچھا تو وہ بولی شام کو ملتے ہیں۔ تم اپنے سکوٹر پر سے جھنڈے اتار کر اپنے کمرے میں رکھ آنا تا کہ ہم ایک

عام سے سکوٹر سوار نظر آئیں پھر باہر گھومنے چلیں گے اور بات چیت کریں گے۔ میں بہت خوش ہوا میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میں نے کچھ دیر آوارہ گردی میں اپنا وقت ضائع کیا پھر مجھے رشید روڈ پر ایک مکینک کی دکان نظر آئی جس سے میں نے سکوٹر کی سروس اور ٹیوننگ وغیرہ کرائی۔ اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد میں نے اپنے ساتھی سکوٹر کو نہلا دھلا کر اور اس کی تمام غذائی ضروریات پوری کر کے اس کو تازہ دم کر دیا اور کمرے میں آ کر آرام کرنے لگا۔ وقت تھا کہ کٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ 4 بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور باتھ روم کی راہ لی۔ تیار ہو کر ناشتے والی جگہ پر پہنچ کر سکوٹر کھڑا کر کے اسی پر بیٹھ گیا۔ لبنیٰ نے بہت انتظار کرایا۔ جب میں مایوس ہو کر ناامید ہو چکا تھا تو وہ دور سے مجھے آتی نظر آئی۔

آج اس نے جینز کے اوپر چھوٹی سی کھلے گلے کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ حسب معمول بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ خوبصورت آدمی ہو، بچہ ہو یا لڑکی وہ کچھ بھی پہنے خوبصورت ہی نظر آئیگا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں سکوٹر سٹارٹ کر کے اس پر سوار ہو چکا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آئی عربی عود کی خوشبو میرے ناک میں رچ بس گئی۔ وہ مجھے راستہ بتاتی گئی میں چلتا گیا اور ہمارا پہلا اسٹاپ بغداد یونیورسٹی تھا۔ وہ مجھے ایک جگہ چھوڑ کر آدھے گھنٹے کے بعد آنے کا کہہ کر چلی گئی اور میں یونیورسٹی کے طلبا و طالبات میں کھو کر رہ گیا۔ ہر طرح کے لوگ، ہر طرح کا فیشن، حسن بے حجاب و بے نقاب بھی اور کچھ با نقاب بھی۔ کچھ نے ہاتھوں تک بھی دستانے چڑھائے ہوئے تھے اور کچھ نے کھلے گلے کی ٹی شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ کچھ اپنے روایتی عربی لباس میں تھیں۔ 45 منٹ کے بعد لبنیٰ دور سے لڑکیوں کے جھرمٹ میں آتی نظر آئی۔ قریب پہنچ کر اس نے لڑکیوں سے میرا تعارف بطور پاکستانی سیاح کے کروایا اور لڑکیوں کو بتایا کہ اس نے اپنی سروسز بطور گائیڈ مجھے آفر کی تھیں جس کو میں نے اپنے قیام بغداد کے دوران تک قبول کر لیا لہٰذا ابھی وہ کچھ دن میری گائیڈ کے طور پر کام کریگی۔ جس کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور یونیورسٹی سے باہر آ گئے۔ وہ مجھے کہنے لگی کہ آج میں آپ کو ایک تاریخی جگہ لئے چلتی ہوں۔ وہ مجھے گائیڈ کرتی گئی اور میں چلتا گیا۔ ہم ایک جگہ جا کر رکے وہ بولی اس کو آزادی چوک کہتے ہیں۔ بریگیڈیئر عبدالکریم قاسم نے شاہ فیصل دوئم کو اس کے خاندان اور وزیراعظم سمیت ناحق قتل کر دیا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کے خلاف انقلاب لا کر اس کو قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش کو اس چوک میں لٹکا دیا گیا جو کہ کئی دن لٹکی رہی اور سڑتی رہی۔ آخر کسی خدا

ترس نے انسانی ہمدردی کی خاطر رات کے کسی حصے میں چوری سے لاش اتار کر کہیں گم نام دفن کر دی اور اس گمنام آدمی کی وجہ سے لاش کو بھی اور عوام کو بھی آزادی مل گئی۔ ہم اس کے قریبی پارک کے بینچ پر جا کر بیٹھ گئے اور آئسکریم کھانے لگے جو لبنیٰ پارک سے ملحقہ کینٹین سے لائی تھی۔

آئس کریم کھانے کے دوران ہم باتیں کر رہے تھے۔ لبنیٰ نے ہی مجھے بتایا کہ شہر بغداد جس کی بنیاد ایرانی شہنشاہ نوشیرواں عادل کے زمانے میں رکھی گئی تھی۔ شہنشاہ نے اپنا سرمائی محل باغِ داد دجلہ کے کنارے تعمیر کروایا لیکن یہ سب کچھ تباہ ہونے کے بعد اب صرف تاریخ کے اوراق میں دفن ہے۔ 763ء میں خلیفہ ابوجعفر المنصور نے اپنا دارالخلافہ دمشق سے عراق منتقل کرنے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا اور یہ شہر خلیفہ کی نسبت سے منصوریہ کہلایا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دورِ حکومت میں بغداد دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا اور علوم وفنون کا بڑا مرکز تھا۔ اس کی شان وشوکت دیدنی تھی۔ 1258ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں متواتر چھیالیس دن تک قتل وغارت ہوتا رہا۔ نتیجتاً 20 لاکھ کی آبادی میں سے 16 لاکھ نفوس قتل کر دیئے گئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ بغداد کی سڑکیں اور گلیاں خون کی ندیوں میں تبدیل ہو گئیں جبکہ دریائے دجلہ کا پانی میلوں تک سرخ تھا اور لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ اور اس کے خاندان کے دیگر لوگوں کو نہائیت ہی سخت اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔ خلیفہ کو ایک بورے میں بند کر کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل دیا گیا۔ محلات، درسگاہیں، کتب خانے، صدیوں پرانے علم وادب اور ہنر وفنون کے نایاب زخیرے نذرِ آتش کر دیئے گئے جو مہینوں جلتے رہے۔ اتنی ہولناک تباہی کے بعد یہ شہر آج تک اپنی وہ شان وشوکت دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔ 1638ء سے لے کر 1917ء تک بغداد ترکوں کے زیرِ تسلط رہا۔

پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد عراق میں ہاشمی خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو بغداد ایک بار پھر دارالسلطنت بن گیا۔ آج اسی دریا کے کنارے میں اور دجلہ کی پری موجود تھے جو میرے دل کو فرحت اور میری روح کو عروج بخش رہی تھی۔ تمام فضا میں رومانی کیفیت تھی۔ روح پرور موسیقی اور وجدانی نغمے میرے دل ودماغ میں سما چکے تھے اور دل میں ایک مدوجزر کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ چاند کی روشنی دریا کی لہروں پر نچھاور ہو رہی تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی جس سے فضا میں سکون اور تمکنت جبکہ دجلہ کی لہروں میں جاذبِ نظر زیبائی پیدا ہو چکی تھی۔ کہیں دور سے آتی عربی موسیقی کی آواز نے ہمیں بے خود کر دیا۔ دریا

کے کنارے تھیٹر بھی آباد ہیں جہاں تمام رات عربی نازنینیں عربی نغموں پر جھوم جھوم کر محوِ رقص رہتی تھیں۔ کچھ عباؤں کے اندر کچھ عباؤں سے باہر۔ دیگر تمام لوازمات بھی دستیاب تھے۔ بے حد لذیذ دجلہ کی مچھلی کے خاص الخاص کباب بھی دستیاب تھے۔

میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ میرا ویزا 30 دن کا تھا۔ آج مجھے 25 واں دن ہے اور 29 دن کے بعد میں یہ ملک چھوڑ دوں گا۔ کیونکہ میں اپنے ویزا کی معیاد ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہی وہ ملک چھوڑ دیتا ہوں۔ ہر ملک جس کی میں سیاحت کرتا ہوں اس کے قانون کا احترام کرتا ہوں۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے اسے کہا کہ میری شدید خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ ایران چلو۔ ہم مشہد زیارت کے لئے جائیں، کرمان شاہ جائیں اور سارا ایران گھومیں۔ وہ بولی یہ تو کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ میں خود اکیلی بھی اور اپنی فیملی کے ساتھ بھی ایران اور ترکی جاتی رہتی ہوں کیونکہ ہمارا خاندان ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ کچھ لوگ عراق میں رہتے ہیں تو کچھ ایران اور ترکی میں رہائش پذیر ہیں۔

پھر وہ کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی۔ جیسے ہی خیالات کے بھنور سے نکلی تو بولی میں تمہیں کل بتاؤں گی اور پوچھنے لگی ادریس تمہارا کل کا کیا پروگرام ہے۔؟ میں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بتایا کہ کل میں موصل جانا چاہتا ہوں۔ وہ بولی وہاں کیا خاص بات ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ دوسری جنگ عظیم میں میرے والد کے بڑے بھائی خان محمود احمد سعید خان موصل ریلوے ہیڈ کوارٹر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ کافی عرصہ عراق میں قیام پذیر رہے۔ اگر ریلوے ہیڈ کوارٹر سے ان کا کوئی ریکارڈ مل جائے تو میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ بولی کل مجھے یونیورسٹی جانا ہے اکٹھے چلیں گے پہلے یونیورسٹی اور پھر موصل ریلوے ہیڈ کوارٹر۔ ہم نے رات کا کھانا ایک ہوٹل سے کھایا اور واپس آ گئے۔

صبح ناشتے پر وہ یونیورسٹی کے لئے تیار ہو کر آئی تھی اور ناشتے کے دوران ہی اس نے مجھے بتایا کہ تم 9 بجے عبداللہ یمنی کی دکان کے پاس ٹھہرنا، میں آ جاؤں گی۔ 9 بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے تو وہ کچھ کاغذات اور نوٹ بک لئے آ گئی۔ اپنی ہاتھ والی چیزیں مع پرس کے اس نے سکوٹر کی ٹوکری میں رکھ دیں اور جمپ لگا کر سکوٹر پر سوار ہوگئی۔ ہم ہوا سے باتیں کرنے لگے۔۔ آج مجھے یونیورسٹی اجنبی نہ لگی۔ اس کے ساتھ اس کی کلاس کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں بھی آ گئے اور ہم کینٹین میں جا کر بیٹھ گئے۔ مشروب کا دور چلتا رہا۔ میں نے سب کا بل دینے کی کوشش کی تو ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا، نو

۔ برادر! یہ میرا فرض ہے۔ آپ مہمان ہیں۔ میں سیاسیات کا طالب علم ہوں۔ جب میں نے ان لوگوں سے (دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سنا کہ ایک پاکستانی سیاح سکوٹر پر عراق کی سیاحت کر رہا ہے تو مجھے آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہوا۔ پھر اس نے پاکستان اور انڈیا سے متعلق بہت سے سوال کئے۔ ان باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سٹوڈنٹ لیڈر ہے۔ ذہانت اور سرداری اس کے چہرے سے عیاں تھی اور اس کا مستقبل تابناک تھا۔ بعد میں وہ عراق کا بہت بڑا لیڈر بنا۔ مجھے بہت عزت اور پیار سے سب نے رخصت کیا۔ میں اور لبنیٰ کریم موصل کی طرف روانہ ہو گئے۔

موصل ریلوے ہیڈ کوارٹر دوسری جنگ عظیم کے دور سے پہلے کی انگریزوں کی بنائی ہوئی ایک خوبصورت اور عظیم عمارت تھی۔ یہ نہ صرف ریلوے ہیڈ کوارٹر تھا بلکہ عراق ایئر اور مرچنٹ نیوی کا ہیڈ کوارٹر بھی اسی عمارت میں تھا۔ لبنیٰ کریم کی عربی یہاں بہت کام آئی۔ جلد ہی ہم دونوں ریلوے ہیڈ کوارٹر کے چیف کے آفس میں تھے۔ ریلوے چیف ایک دراز قد کا ماڈرن عراقی تھا۔ عربی لہجے میں بہت خوبصورت انداز سے انگلش بولتا تھا۔ پاکستان سے عراق آنا اور اپنے تایا کے ریکارڈ کی تلاش میں اس تک پہنچنا اسے بہت بھایا۔ اس نے ہمیں نہ صرف مشروب پلایا بلکہ ہماری بہت مدد بھی کی۔ میرے بتانے پر اس نے میرے تایا جان کا نام لکھا اور ریکارڈ روم کے انچارج کو بلا کر اس کو چٹ دی اور عربی میں کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور تحکمانہ لہجے میں حکم صادر کرتا رہا۔ بعد میں مجھے لبنیٰ کریم نے بتایا کہ ریکارڈ روم انچارج اتنا پرانا ریکارڈ نکالنے پر آمادہ نہ تھا۔ جس پر چیف نے کہا کہ ایک نوجوان لڑکا پاکستان سے عراق اپنے بزرگوں کی تلاش میں آ سکتا ہے تو تم ریکارڈ تلاش نہیں کر سکتے۔ جاؤ تمام کام چھوڑ کر پہلے یہ کام کرو۔ وہ پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

ہم دو بجے تک اس کے آفس میں ہی بیٹھے رہے۔ بات چیت کے دوران اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بار مسٹر محمد علی جناح سے بھی مل چکا ہے اور وہ کافی متاثر کن شخصیت تھے۔ دو بجے کے قریب ریکارڈ کیپر ایک پرانا بوسیدہ رجسٹر لے کر آیا جس میں میرے تایا جان کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے سامنے 374 دینار تنخواہ وصول کرنے کے دستخط تھے۔ میرے لئے یہ بھی بہت تھا۔ اگر ان دنوں فوٹو سٹیٹ کی سہولت ہوتی تو میں ضرور اس ریکارڈ کی فوٹو کاپی حاصل کرتا۔ ہم دونوں نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ محبت اور دعاؤں سے اس نے ہمیں باہر دروازے تک رخصت کیا۔ پھر ہم بغداد شہر گھومتے رہے اور شام تک واپسی ہوئی۔ لبنیٰ کریم

بولی آج جمعرات ہے شام کو مزار موسیٰ کاظمؒ پر ملاقات ہوگی اور پھر میں تمہاری دجلہ کی پری سے ملاقات کرادوں گی۔ میں بے حد خوش ہوا اور لبنیٰ کریم کو اس کی بتائی ہوئی جگہ پر چھوڑتا ہوا کمرے میں آ کر سو گیا۔

رات آٹھ بجے کے قریب سو کر اٹھا تو طبیعت کافی تر و تازہ تھی۔ تیار ہو کر مارکیٹ گیا۔ رات کے لئے کچھ کھانے پینے کے سامان کا ایک ڈبہ تیار کرایا اور لبنیٰ کریم کے لئے بھی کچھ خریدا جس میں سونے کے ٹاپس قابلِ ذکر تھے۔ ان دنوں عراق میں انڈین جیولری کا بہت کریز تھا۔ دس بجے رات میں مزار پر چلا گیا اور اسی جگہ پر بیٹھا جو اس نے بتائی تھی۔ آج بہت گرمی تھی اور رش کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی۔ خواتین کی ریشمی کالے رنگ کی چادروں نے ان کو بہت پریشان کیا ہوا تھا۔ مجبوراً کچھ نوجوان لڑکیوں نے چادریں اتار دیں۔ کچھ نے اپنے چہرے نقابوں سے آزاد کر لئے تھے۔ ان کے سیاہ مژگان اور بے حد خوبصورت آنکھیں صحرا میں نخلستان کی مانند تھیں۔ میرے جیسے حُسن پرست اور کمزور انسان کے لئے یہ سب کچھ beauty intoxication سے کم نہ تھا۔ میری کیفیت اس وقت اُس انسان کی سی تھی جس کو بہت ساری ناگنیں گھیر لیں اور باری باری ڈستی جائیں۔ مجھے تو وہ عین دل کے مقام پر ڈنگ پر ڈنگ مار رہی تھیں اور میں تھا کہ ان کی آنکھوں سے جام پر جام پیئے جا رہا تھا اور گرد و نواح سے بے خبر اور مدہوش تھا۔

مجھے محسوس ہی نہ ہوا کہ لبنیٰ کریم ٹھنڈے ہوا کے جھونکے کی طرح کب آئی اور میرے پاس میں بیٹھ گئی۔ میرے متوجہ نہ ہونے پر اس نے میرے کندھے ہلائے اور پوچھا کیا تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟ کسی گہرے کنویں کی تہہ سے میری بہت نحیف آواز آئی ہاں ٹھیک ہوں اور میں نے خود کلامی میں کہا کہ آؤ اس سحر سے مجھے آزاد کرو۔ وہ بولی ابھی تم اپنے ملک کی لینگویج میں کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا میں تو گہری نیند میں تھا نہ جانے کیا کہہ گیا ہوں، مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہے۔ میں ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوا دل ہی دل میں ان دجلہ کی پریوں کو اللہ حافظ کہتا ہوا لبنیٰ کریم سے پہلے ناشتے والی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سات آٹھ منٹ میں وہ آ گئی اور ہم دجلہ کی طرف بڑھنے لگے۔

آج وہ مجھے دجلہ کے کنارے کنارے کافی دور تک لے گئی۔ پھر ہم کشتی میں بیٹھ کر دور نکل گئے۔ ہم نے اتنی باتیں کیں کہ آج تقریباً آدھی صدی گذرنے کے بعد بھی مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔ وہ بولی مجھے بے حد خوشی ہے کہ تم جیسا لڑکا میرا دوست ہے جو دجلہ کی پریوں کو دیکھنے کا خواہش مند تھا اور ہے۔ میرے لئے بہت عزت کا مقام ہے کہ تم مجھے پری سے تشبیہ دیتے ہو جبکہ میرے اپنے ہی ملک میں سیاسی اور شخصی طور پر

ہمارا استحصال کیا جا رہا ہے اور ہمیں نفرت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ہم رات بھر باتیں کرتے رہے پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا وہ کہنے لگی مجھے بھی بے حد شوق ہے By Road سفر کرنے کا مگر میں عراق سے تمہارے ساتھ سکوٹر پر بارڈر کراس نہیں کر سکتی۔ میں حسبِ سابقہ بذریعہ بس بغداد سے قصرِ شیریں جاؤں گی۔ وہاں تم میرا انتظار کرو گے اور پھر ہم دونوں اکٹھے سفر کریں گے۔ میں نے کہا جیسے تمہاری مرضی۔ میں 2 روز کے بعد بغداد سے قصرِ شیریں روانہ ہو جاؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا۔ وہ شرارت کے لہجے میں بولی اگر میں کبھی بھی نہ آؤں تو تم کب تک میرا انتظار کرو گے۔ میں نے کہا تمھارے آنے تک میں قصرِ شیریں میں ہی قیام کروں گا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔اس کی مترنم ہنسی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کچھ ہیرے جواہرات سنگ مرمر کے فرش پر گر گئے ہیں۔

اس نے مجھے یاد دلایا کہ اب واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔آج ناشتے پر ملاقات نہیں ہو گی لیکن جانے سے پہلے تم مجھے ضرور مل کر جاؤ گے۔ میں نے اسے اپنے کمرے کا فون نمبر دیا اور کہا کہ میں تمہارے فون کا کمرے میں ہی انتظار کروں گا۔ جیسے ہی کال کرو گی میں باہر آ جاؤں گا۔اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کشتی کو واپسی کے سفر پر ڈال دیا تھا۔ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر میں نے سکوٹر کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ دل کو لبھانے والی کچھ آوازیں اور بھی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ اتنے میں کوئی چیز مجھ سے ٹکرائی اور بولی اے اجنبی میں ہوں دجلہ کی پری آؤ تمہیں پرستان کی سیر کرالاؤں۔ میں نے اس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بے اختیار بول اٹھا۔۔اے پری اس آدم زاد پر مہربان ہونے کا شکریہ۔اس کی دوستی کا دم بھرنے کا شکریہ۔اس کی پریوں سے ملاقاتیں کروانے کا شکریہ۔ نہ جانے کب میری دونوں آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے خوبصورت چہرے پر گرنے لگے اور اس نے اپنی خوبصورت مخروطی انگلیوں کے پوروں سے میرے آنسو گرنے سے پہلے ہی اٹھانے شروع کر دیئے اور آہستہ سے بولی پلیز مجھے چھوڑ دو۔اور میں نے اپنے ہاتھوں کا دباؤ کم کرتے ہوئے آہستہ سے اس کو چھوڑ دیا۔ہم واپس آ گئے۔ جاتے ہوئے وہ مجھے کہہ گئی کہ اب تم ناشتہ کرنے نانی کے پاس مت جانا۔ دو روز کہیں اور جا کر ناشتہ کرنا اور خوبصورت انداز سے وہ مجھ سے جدا ہو کر چلی گئی۔

بقول چراغ حسن حسرت

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

دوسرے روز کافی دیر تک سوتا رہا۔ جب تیار ہوکر دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے جانے کو تھا تو فون کال آ گئی کہ میں عبداللہ یمنی کی دکان کے سامنے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ میں بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تو وہ خوبصورت لباس میں وہاں کھڑی تھی۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لئے بریک لگائی اور وہ اچھل کر سکوٹر پر سوار ہوگئی۔ ہم بغداد کے ایک بہت ہی پوش علاقے کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلے گئے۔ تقریباً 3 بجے کے قریب جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو اس نے بتایا کہ تمام تیاری مکمل ہے صرف ضرورت کی چند چیزیں لینی باقی ہیں۔ ہم قریب ہی ایک مارکیٹ میں چلے گئے اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کچھ سامان خریدا جو کہ زیادہ تر سفر کے دوران کھانے پینے کا تھا۔ واپسی پر وہ بولی میری تمام تیاری مکمل ہے۔ اب ہم قصرِ شیریں کے بس اسٹینڈ TBT پر ملیں گے۔ میں نے اسے بتایا کہ بس اسٹینڈ کے بالمقابل مین روڈ پر جو ریسٹورنٹ ہے میں اسی میں انتظار کروں گا۔ وہ بولی فکر نہ کرو۔ مجھے تمہیں تلاش کرنے میں دقت نہ ہوگی اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں بھی کمرے میں لوٹ آیا۔ صبح نماز کے بعد سفر شروع کرنا تھا۔ کمرے میں آ کر فالتو سامان اپنے تھیلے سے نکال دیا۔ تمام سفری کاغذات پھر سے چیک کئے اور لیٹ گیا۔ گذشتہ تمام حالات وواقعات ایک فلم کی طرح دماغ اور آنکھوں کے سامنے چلنے لگے مگر نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح نماز امام موسیٰ کاظمؒ کی مسجد میں ادا کی۔ اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؒ اور امام تقیؒ کے مزاروں پر الوداعی سلام عرض کرنے کے بعد اپنا سفر شروع کر دیا۔ جلد ہی میں عراق ایران بارڈر پر پہنچ گیا۔ دونوں ملکوں کے امیگریشن والوں نے مجھے جلد ہی فارغ کر دیا۔ ایک عراقی کسٹم آفیسر نے مجھے پوچھا کہ تم نے عراق کو کیسا پایا۔ میں نے اسے ہنستے ہوئے کہا کہ بغداد اور لاہور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف لباس اور زبان کا فرق ہے۔ وہ مسکرایا اور بولا کیا آپ لوگ انڈیا پاکستان بارڈر سے ایک دوسرے کے ملک میں داخل ہو سکتے ہو۔ میں بولا نہیں۔۔ کیوں؟ (اس نے پوچھا)۔ میں نے اسے بتایا کہ انڈیا غاصب ہے، ہمارے کشمیر پر قابض ہے۔ دو جنگیں ہو چکی ہیں اور دونوں ملکوں کو ایک دوسرے پر اعتبار نہیں ہے۔ اس لئے بارڈر بند ہیں۔ ساتھ ہی اس نے مجھے کلیئر کرنے کا اشارہ دے دیا۔ میں نے اپنا سفر قصرِ شیریں کی طرف شروع کر دیا۔ جہاں آبادی والی جگہ آتی میں کچھ دیر رک جاتا۔ لوگ میرے اردگرد اکٹھے ہو جاتے اور سلام دعا کے بعد

بولتے (حال شما خواب اے) یعنی آپ کا کیا حال ہے۔ میں جواب دیتا (چتوری) یعنی ٹھیک ہے۔ ایک صاحب فرمانے لگے شما کدم شہراے یعنی آپ کس شہر کے رہنے والے ہیں۔ میرے بہاولپور بتانے پر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ایک خاتون کہنے لگی آغا شما اسم چہ اے۔ میرے ادریس احمد آفتاب بتانے پر بولی آغا آفتاب خوش آمدید، میں بولا خیلے اشکرک یعنی آپ کا بہت بہت شکریہ اور اس طرح میں رات تک قصرِ شیریں پہنچ کر ہوٹل کے کمرے میں لیٹ کر بے خبر سو گیا۔ صبح دس بجے کے قریب آنکھ کھلی تو تیار ہو کر سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہا۔

قصرِ شیریں ایک خوبصورت سرسبز جگہ ہے۔ گرمی بھی برائے نام تھی۔ لوگ نرم خُو، خوبصورت، مہمان نواز اور خوش مزاج تھے۔ دو روز گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ آخر تیسرے روز صبح آٹھ بجے لبنیٰ کریم قصرِ شیریں پہنچ گئی۔ میں نے اس کا تھیلہ لے کر اپنے تھیلے کے اوپر رکھ کر ریشمی ڈوری سے باندھا ہی تھا کہ وہ بولی۔۔نہیں نہیں آج ہم تہران نہیں جائیں گے، میں تمہیں قصرِ شیریں کی سیر کرواؤں گی اور اس کی تاریخی حیثیت سے بھی آگاہ کروں گی۔ میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بادبان کھول دیے۔ پہلے ہم دونوں نے ناشتہ کیا پھر قصرِ شیریں کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ وہ مجھے آبِ جو کے کنارے ایک محل کے کھنڈرات میں لے گئی اور بولی کہ حُسن و محبت کے شیدائی یہاں ضرور آتے ہیں کیونکہ یہ محل شیریں نے تعمیر کروایا تھا۔ وہ شہنشاہِ عجم خسرو پرویز کے ساتھ بہار و سرما کے پُر کیف شب و روز یہیں بسر کرتی تھی۔ شیریں مذہب کے لحاظ سے عیسائی لیکن حُسن میں ایسی بے مثال پری تمثال شاعر صفت حسینہ تھی کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کا ذکر اور چرچا آج بھی پہلے روز کی طرح ہی کیا جا رہا تھا کیونکہ آج یہاں کوئی مقامی تہوار تھا جسے یہاں کی مقامی زبان میں شبنہ کہا جا رہا تھا یا شاید میں مقامی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے سمجھ رہا تھا۔ اردگرد کی خوش منظر پہاڑیوں اور کوہ قاف جیسی وادیوں سے کُرد حسیناؤں کے غول کے غول پریوں کے روپ میں وادی میں جمع ہو رہے تھے۔ ان پریوں نے قدیم کُردی رقص کرتے ہوئے ایک جشن برپا کر دیا جس نے فضا کو رنگ و موج اور مجھ سے غریب الوطن کو سُرور اور مسحور کُن کیفیت بخشی۔

رقص کے اختتام پر لبنیٰ کریم کے جھنجھوڑنے پر مجھے روحانی دنیا سے واپس حقیقی دنیا میں آنے میں چند ساعتیں لگیں۔ آبِ رواں کی فراوانی سے قصرِ شیریں کا قصبہ سرسبز، خوبصورت اور صاف ستھرا بلکہ ایک گُل دستہ کی مانند ہے۔ قصرِ شیریں ایرانی کُردستان کا مشہور مقام ہے۔ خرید و فروخت کا اہم مرکز ہے۔ قصبے کے

بازار میں کُردی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے مقامی لباس یعنی تنگ پائنچے کی شلوار قمیض، کمر میں ریشمی دوپٹہ اور ہلکی سی پگڑی باندھے ہاتھوں میں گُل دستے لیے ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔لبنیٰ نے اس علاقے کو کوہ قاف سے تشبیہ دی۔اس علاقے کی قدرتی خوبصورتی اور قابلِ رشک حُسن و جمال دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہاں کی ہر حسینہ بذاتِ خود شیریں ہے۔

قارئینِ کرام تہران اور بغداد کے درمیان 650 میل لمبا فاصلہ ہے۔ اگر بغداد سے تہران کی طرف سفر کریں تو خسروی کے مقام پر یہ سڑک ایران میں داخل ہوتی ہے۔ تاریخی اہمیت کی حامل یہ سڑک بغداد کو سمرقند و بخارہ سے ملاتی تھی۔ یہ اُن تاریخی، رومانوی اور تجارتی کاروانوں کی گزرگاہ تھی جس کے دلچسپ تجربات، رنگین روایات اور خطرناک اسفار کی وجہ سے الف لیلیٰ کے افسانے وجود میں آئے۔ سونا، چاندی، جواہرات و دیگر سامانِ تجارت اونٹوں پر وسط ایشیا سے بغداد آتا تھا۔ اس شاہراہ کو جادۂ زریں کہا جاتا تھا۔

ہم قصرِ شیریں سے تہران کی جانب محوِ سفر تھے۔تقریباً یک صد میل سفر کرنے کے بعد کرمان شاہ کا خوبصورت شہر آ گیا۔ یہ جگہ ایران کا قلب ہے۔ ایرانی تیل کے ذخائر کا گڑھ ہے۔ یہاں خال خال لوگ شکستہ اُردو میں بھی بات کرتے تھے۔ ہم نے شہر کا چکر لگایا۔ انگور کا تازہ جوس پیا جو کینیڈا ڈرائی کی بوتلوں میں دستیاب تھا۔ کرمان شاہ شہر سے چار میل کے فاصلے پر دامنِ کوہ میں بستان کے مقام پر خسرو پرویز کے محل کے کھنڈرات اور پتھروں پر کندہ تصاویر ہیں جو آج بھی فرہاد کی یاد تازہ کیے ہوئے ہیں اور شیریں سے اس کی لازوال محبت کو بیان کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اسی کوہ سے شہنشاہ کے مرغزاروں کو سیراب کرنے کے لیے فرہاد نے نہر نکالی تھی تاکہ وہ شہنشاہِ معظم سے سچے عشق کی سند حاصل کر سکے۔ وہ اپنے خلوص اور محبت کی سچائی تو ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کا ثمر حاصل نہ کر سکا۔ میں نے لبنیٰ کو سسکاری بھرتے ہوئے کہا کہ کچھ بھی ہو میں اس کو کامیاب کہوں گا کیونکہ وہ ایک غیر فانی کردار بن گیا ہے۔ شہنشاہ کو آج کوئی نہیں جانتا مگر فرہاد کو سب جانتے ہیں اور تمام لوگوں کے دل فرہاد کی عظمت سے معمور ہیں۔

ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ قصبوں کے علاوہ جو قابلِ ذکر اور تاریخی شہر ہمارے راستے میں آیا وہ شہر ہمدان تھا۔ تاریخ کے مطابق قبل مسیح یہ شہر اشکائی حکمرانوں کا دارالسلطنت رہا۔ سلجوقی بادشاہوں نے بھی ہمدان کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ منگول سالار نے بھی اپنی رسمِ تاج پوشی اسی شہر میں منعقد کی۔ عظیم مفکر اور طبیب

حکیم بُوعلی سینا کا مزار بھی ہمدان میں ہے۔ان کا خوبصورت مقبرہ عالمِ اسلام کے اس عظیم المرتبت عالم کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔دوسرا قابلِ ذکر اور تاریخی شہر قذوین تھا۔اس شہر کو صفوی بادشاہ نے اپنا پایہ تخت بنایا۔اسی شہر میں ہمایوں نے پناہ لی تھی اور بعد میں یہاں کے بادشاہ سے مدد حاصل کر کے ہندوستان کو دوبارہ فتح کیا تھا۔اسی شہر کے شمال کی طرف جو سڑک رشت کی طرف جاتی ہے وہ ایسے پہاڑی سلسلے کے درمیان سے گزرتی ہے جس کی بلند ترین چوٹی پر قلعہ الموت واقع ہے۔جس پر حسن بن صباح نے اپنی جنت بنائی تھی اور اسی جگہ سے فرقہ اسماعیلیہ نے اپنی ہلاکت خیز اشاعت اور سرگرمیاں تقریباً دوصد سال تک جاری رکھیں۔ آخر کار منگولوں کے سردار ہلاکو خان نے فرقہ اسماعیلیہ کے آخری شیخ الجبال رکن الدین خورشاہ کو قتل کر کے اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔قذوین کا شہر بھی خوبصورت اور نہایت ہی صاف ستھرا تھا۔

ہم خوشی خوشی تہران کی طرف بڑھتے رہے۔اب اس نے اپنے سر سے رومال بھی اتار دیا تھا جو عرب خواتین اپنے سر پر لئے رکھتی ہیں۔لبنیٰ کریم کی زلفیں نہایت خوبصورت تھیں۔ ہلکے سنہرے رنگ کے، ناگن کی طرح بل کھاتے، لمبے بال دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتے۔فضا میں جب لہراتے تو ایک خاص قسم کی خوشبو دماغ کو معطر کر دیتی۔اس دجلہ کی پری کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر انسانی کیمسٹری اور بائیو کنٹرول سے باہر ہو جاتی۔آخر کار ہم رات گیارہ بجے کے قریب اپنی مستی میں مست تہران کے خیابانِ بوزر جمہوری پہنچ کر ہوٹل نشین ہو گئے۔لبنیٰ مجھے کہنے لگی کہ میں تہران کے چپے چپے سے واقف ہوں اور تم نے بھی تہران میں کافی وقت گزار لیا ہے کیوں نہ شمران چلیں جو کہ ایک خوبصورت اور صحت افزاء مقام ہے۔مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور ہم شمران جا پہنچے۔واقعی وہ ایک خوبصورت پہاڑی مقام تھا۔ایک ہفتہ ہمارا قیام شمران میں رہا اور پھر ہم مشہد شریف کے لئے عازم سفر ہوئے۔یہ ایک 600 میل لمبا سفر تھا جس کی تفصیلات میں اپنی زیر تحریر تصنیف 'بہاولپور سے لندن' میں لکھوں گا۔

مشہد ایک بارڈر سٹی ہے جس کی سرحد اس وقت کے USSR سے ملتی تھی۔مذہبی رجحان بہت زیادہ تھا۔ہم جب مشہد میں داخل ہو گئے۔امام موسیٰ رضاؑ کے روضہ مبارک کے قریب بہت سے ہوٹل اور ریسٹورنٹ تھے۔ہم بے حد تھکے ہوئے تھے۔میں لبنیٰ کریم کو سڑک پر سکوٹر کے قریب چھوڑ کر رہائش کی تلاش میں ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا۔Receptionist سے پوچھا کہ جگہ مل جائے گی تو پہلا سوال جو کاؤنٹر پر کھڑے شخص نے پوچھا وہ کچھ اس طرح تھا۔شما شیعہ اے سنی اے۔میں نے جذباتی انداز میں جواب دیا کہ الحمدللہ من سنی است۔وہ بڑی نفرت سے بولا برو برو جگہ نیست۔ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ چیختے ہوئے بولا۔۔برو بابا عیب نہ

دارم اور ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

میں مایوسی سے باہر آیا تو میرا موڈ دیکھ کر لبنیٰ بہت حیران ہوئی۔ میرے بتانے پر وہ ہنس پڑی اور بولی فکر نہ کرو کسی اور ہوٹل میں چلتے ہیں لیکن اس بار ہوٹل کاؤنٹر پر میں خود بات کروں گی۔ ہم نے سکوٹر پر گولائی میں ایک چکر لگایا اور ایک بہت اچھے، صاف ستھرے اور بڑے ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ کاؤنٹر پر اس نے فارسی میں بات چیت کی اور ایک دومنٹ کی بات چیت کے بعد کمرے کی چابی لینے میں کامیاب ہوگئی۔ غسل وغیرہ کرنے کے بعد ہم نے کھانا تناول کیا اور نیند کی وادیوں میں پہنچ گئے۔

آج ہمارا مشہد میں پہلا دن تھا۔ زیارت گاہ قریب ہی تھی ہم پیدل اس کی طرف چل پڑے۔ لبنیٰ نے اپنے سامان سے کالی چادر نکال کر اپنے آپ کو ڈھانپ لیا تھا کیونکہ اس کے بغیر زیارت گاہ میں داخلہ ممنوع تھا۔ ہم کافی دیر زیارت گاہ میں گھومتے رہے۔ فاتحہ پڑھی۔ وہ مجھے بتانے لگی کہ اگر کوئی خاتون اپنا آدھا چہرہ بے نقاب کر کے دکھائے تو سمجھ لو کہ یہ متعہ کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ اور آپ دائیں بائیں سے باخبر ہو کر اس موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی آپ کو کہے کہ ذرا ایک طرف ہو کر میری بات سنیں تو یہ سمجھ لیں کہ یہ match maker ہے۔ یعنی متعہ کے لئے مرد و زن میں رابطہ کرانے والا۔ حالانکہ شہنشاہ رضا پہلوی کے ایران میں متعہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بے عزتی بھی خیال کیا جاتا تھا۔ سرکاری طور پر اس کی رجسٹریشن بھی نہیں ہوتی تھی۔ لوگ چوری چھپے متعہ کرتے تھے۔

ہم دوپہر تک زیارت گاہ میں رہے۔ میرے لئے یہ جگہ مذہبی، معاشرتی اور سیاحتی لحاظ سے جدا سی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ایرانی ہوٹل میں کھایا۔ مجھے سیخ کباب اور نان پسند آئے۔ لبنیٰ نے ایرانی ڈش چلو خورش منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد ہماری نظر قریب ہی ایک فالودے والے پر پڑی۔ تو ہم فالودہ کھانے کے لئے رک گئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا مزیدار فالودہ کھایا۔ حالانکہ میرے اپنے شہر بہاولپور کا فالودہ بھی بہت لذیذ ہوتا ہے لیکن یہ فالودہ بجائے سویوں کے موتیوں کی شکل کا تھا۔ خوش شکل، پیاری خوشبو اور بہترین ذائقہ۔ چونکہ مشہد ایک مذہبی شہر ہے اس لئے ماحول میں پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ یہاں آٹھویں امام موسیٰ رضا کا خوبصورت مقبرہ واقع ہے۔ مقبرے کے پہلو میں نادر کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جس کا شمار دنیا کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے سے لاکھوں زائرین یہاں آتے ہیں اور اللہ سبحان تعالیٰ کی کبریائی کا ورد کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجتے

ہیں۔۔امامؑ کے حضور عقیدت و احترام سے سلام پیش کرتے ہیں۔ جہاں یہ سب چوبیس گھنٹے ہوتا ہو وہاں کے ماحول میں پاکیزگی ہی پاکیزگی ہوگی۔موسم بھی بے حد سہانا تھا۔گرمی نام کو نہ تھی بلکہ شام کے وقت ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔

مشہد میں کچھ روز سیاحت اور سیر و تفریح میں گذار کر ہم دونوں بندر عباس کی طرف عازمِ سفر ہوگئے۔جس کی تفصیل میری آئندہ آنے والی Publication بہاولپور سے لندن' میں پڑھی جاسکے گی۔ یہ آسان سفر نہ تھے۔اللہ تعالیٰ کو زندگی منظور تھی۔میری اہلیہ اور دس بچوں کا ساتھ اللہ تعالیٰ نے قائم کرنا تھا اور آج 48 سال کے بعد بھی میرے ذہن میں ان یادداشتوں کا تر و تازہ ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

ہم دونوں گیارہ روز کے بعد بندر عباس پہنچے۔لبنیٰ کریم ایک حوصلہ مند، عقل و دانش میں یکتا اور بہترین ہمسفر ثابت ہوئی۔اس کے مشورے فہم و فراست کا منہ بولتا ثبوت تھے۔معمولی اختلاف رائے کے علاوہ ہمارے درمیان کشیدگی، لڑائی جھگڑا نام کو بھی نہ تھا۔اتنے پر خطر سفر کے باوجود ہم دونوں نا صرف پرسکون تھے بلکہ ہر قسم کی Tension، Depression اور Frustration سے محفوظ تھے۔صرف تھکاوٹ ضرور ہو جاتی تھی۔ وہ میرے حوصلے کی داد دیتی تھی اور میں اس کی ہمت کو سراہتا تھا۔ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے اور خیال رکھتے کہ ہمسفر کی دل شکنی نہ ہو۔

بندر عباس ایران کی ایک مشہور بندرگاہ ہے۔ جہاں سے بحرین اور دوبئ کے لئے کارگو سروس بذریعہ لانچ آپریٹ کی جاتی تھی۔ بندر عباس بھی دیگر ساحلی شہروں کی طرح ہر قسم کی برائیوں سے بھرپور تھا۔ یہاں پر بلوچی، ایرانی، مکرانی، عربی اور دیگر ملاح اپنی اپنی بولیاں بولتے اور خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے۔ لانچوں میں انگور، سیب اور دیگر قسم کا فروٹ اور سبزیاں دوبئ بحرین کے لئے لوڈ کی جا رہی تھیں۔لبنیٰ کریم کہنے لگی کہ میں ایران تو اکثر آتی رہتی ہوں مگر بندر عباس آنے کا اتفاق مجھے پہلی بار ہوا۔ ابھی ہم بندر عباس کے متعلق گفتگو ہی کر رہے تھے کہ نوجوان لڑکوں کا ایک گروپ ہمارے پاس آ کر رک گیا اور پنجابی زبان میں ایک لڑکے نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ہم سب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے اٹھ کر فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا۔تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ ان لڑکوں کا تعلق لاہور سے تھا اور یہ روزگار کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔روزگار تو نہ ملا مگر اب یہ سب مل کر ایران سے سامان خرید کر عراق میں اور عراق سے خرید کر ایران میں فروخت کرتے تھے۔اسی طرح دوبئ کا چکر بھی لگا لیتے۔عرفِ عام

میں اس طرح کا بزنس کرنے والوں کو پھیرے باز کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ پیسہ تو کما لیتے مگر عزت نہیں۔ لوگ ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہ لوگ جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے مقامی دکاندار ان کے ارد گرد رہتے اور ان کا سمگل شدہ سامان خریدنے کے لئے ان سے بھاؤ تاؤ کرتے نظر آتے۔

ان لڑکوں کا لیڈر ایک الطاف نامی لڑکا تھا۔ جو عرصہ دو سال سے یہ کاروبار کر رہا تھا۔ اس لڑکے میں یہ خوبی تھی کہ اگر کوئی بھی پاکستانی بیمار ہو جائے تو یہ اس کی مدد کرتا۔ کسی کا سامان کسٹم میں پھنس جائے تو یہ میل ملاپ کر کے اس کا مسئلہ حل کراتا۔ اگر کوئی پاکستانی واپس وطن جانا چاہتا اور اس کے پاس زادِ راہ نہیں ہوتا تو یہ اس کی مدد کرتا۔ ان خوبیوں کی وجہ سے اپنے پرائے سب اس کی عزت کرتے۔ اس کی بات غور سے سنتے۔ ایرانی، عراقی اور دوبئی والے سب اس کو الطاف لاہوری کے نام سے جانتے تھے۔ الطاف گفتگو میں بھی نرم خو اور میٹھا تھا۔ مجھ سے بات چیت کے دوران میرے حوصلے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ ہم نے کل کے اخبار میں آپ کی تصاویر دیکھیں تھیں جب ہمیں معلوم ہوا کہ آپ پاکستان سے سیاحت کرتے ہوئے بندر عباس تک آ پہنچے ہیں۔ تو آپ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ میں نے دیگر لڑکوں کو بتایا تو ان میں سے دو لڑکوں نے مجھے کہا کہ انہوں نے بندر عباس کے بازاروں میں کئی بار آپ کو لوگوں کے جھرمٹ میں دیکھا ہے۔ بس ہم سب آپ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ میں نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور 3 گھنٹے تک ان لوگوں کے ساتھ گفتگو کے ذریعے اپنے سفری تجربات شیئر کرتا رہا۔ بات چیت کے دوران میں نے ان کو بتایا کہ ہم دوبئی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس پر انہوں نے کہا کہ دو روز بعد ایک بڑی لانچ کارگو لے کر رات 8 بجے دوبئی روانہ ہو گی۔ جو صبح نماز کے وقت دوبئی پہنچ جائے گی۔ ہم سب اس پر دوبئی جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ بکنگ کرا لوں۔ پھر سب لوگ چلے گئے۔

رات 9 بجے کے قریب الطاف مجھے ملنے ہوٹل آیا تو اس نے بتایا کہ 130 تومان فی نفر کے حساب سے آپ کی بکنگ کرائی گئی ہے اور پرسوں شام 6 بجے آپ جیٹی پر آ جائیں۔ میں نے اس کو 260 تومان دینے کی بہت کوشش کی مگر وہ آمادہ نہ ہوا اور بولا یہ ہماری طرف سے ہے۔ ہمیں آپ پر فخر ہے۔

وقت مقررہ پر ہم دونوں اپنا مختصر سامان لے کر جیٹی پر پہنچ گئے۔ یہ میرا پہلا سمندری سفر تھا۔ دل میں خدشات بھی بہت تھے۔ رات 9 بجے کے قریب لانچ نے لنگر اٹھا دیا اور آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ لانچ میں 9 پاکستانی لڑکے جن کا لیڈر الطاف تھا، راقم الحروف اور لبنیٰ کریم کو ملا کر ہم

گیارہ لوگ تھے۔ لانچ کا عملہ 7 لوگوں پر مشتمل تھا جو کہ بدصورت اور غصیلے تھے۔ بات بات پر لڑتے جھگڑتے تھے۔ کبھی عربی میں تو کبھی فارسی میں بات کرتے تھے۔ بے حد لالچی، بات بات پر بخششیں یعنی رشوت طلب کرتے تھے۔ تمام رات لانچ نے اپنا سفر جاری رکھا۔ سمندر میں تنکے کی طرح ڈولتی ہچکولے کھاتی دوبئی کی طرف رواں دواں رہی۔ کبھی کبھی ناہموار بھی ہو جاتی۔ جس کی وجہ سے سر چکرانے لگتا اور قے یعنی vomiting کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کچھ لڑکے زیادہ پریشان ہو گئے کیونکہ رات کا کھانا زیادہ کھانے کی وجہ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور بار بار قے کر رہے تھے۔ میں نے اور لبنیٰ کریم نے اس خدشے کے پیش نظر رات کا کھانا نہ کھایا تھا۔ اس کے باوجود ہم دونوں کو متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت بے حد بے مزہ اور پریشان کن تھی۔ اس کے باوجود آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانے کی خواہش کو نہ تو دبا سکے اور نہ ہی کوئی مجبوری یا ڈر خوف آڑے آیا۔

تمام رات سمندر اور لانچ کی آنکھ مچولی چلتی رہی اور ہم سب غریب الوطن مہاجرین تھے۔ رات کے 3 بجے کے بعد سمندر پرسکون ہوا تو لانچ میں رونق آنی شروع ہوگئی۔ جو لڑکے بے ہوشی کی کیفیت میں تھے وہ ہوش میں آنے لگے۔ جو بات چیت پر چڑ چڑے پن کا اظہار کرتے تھے ان کی خوش مزاجی لوٹنے لگی۔ صبح کے چار بجے تک سب نارمل ہو چکے تھے اور بھوک بھوک کر رہے تھے۔ میں نے ان کو یاد دلایا کہ آپ لوگ انگوروں کی پیٹیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اور بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ ایک لڑکے نے چاقو نکال کر ایک پیٹی میں سوراخ کر دیا جبکہ دوسرے لڑکے دیدبانی کرنے لگے۔ اس سوراخ میں سے انگور نکلتے گئے اور ہم سب کھاتے گئے۔ الطاف نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک رومال بچھایا۔ لڑکے نے آہستہ آہستہ پیٹی کھول کر رومال پر خالی کر دی اور خالی پیٹی سمندر کی نظر کر دی گئی۔ پھر کیا تھا سب نے دعوتِ شیراز اڑائی اور منٹوں میں تمام انگور ختم ہو گئے۔ انگوروں کی باقیات کو سمندر برد کر دیا گیا۔ انگور بہت اچھی کوالٹی کے تھے۔ انگور کھانے کے بعد سب کی طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی۔

اسی دوران ملاح شور مچانے لگے کہ دوبئی کا ساحل قریب ہے۔ ابھی موقع محل دیکھ کر سمندر میں کشتی اتاریں گے تم سب تیار ہو جاؤ۔ ان دنوں UAE کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا۔ برٹش فورسز اپنا بوریا بستر باندھے اگلے حکم کے انتظار میں تھیں۔ دوبئی کا نہ ویزا تھا نہ پاسپورٹ مگر ساحلوں پر سختی ضرور تھی۔ اگر کوئی لانچ غیر قانونی طور پر ساحل کی طرف آتی نظر پڑتی تو وارننگ دی جاتی اور اس کے بعد اس کو گرفتار کر لیا جاتا

اور بعض حالات میں اس پر مشین گن سے فائر بھی کیا جاتا تھا۔ کیونکہ لانچ پر بھاری جرمانہ یا لانچ کی ضبطی یا دونوں سزائیں بھی دی جاسکتی تھیں۔ لہٰذا ملاح اس قسم کے قوانین سے بے حد ڈرتے تھے لیکن غیر قانونی کام سے باز بھی نہ آتے تھے۔

ان حالات میں اس نے ہمیں دوبئ کے ساحل پر چوری چھپے اتار کر پھر جیٹی پر جانا تھا۔ جہاں پر وہ اپنا کارگو آف لوڈ کرنے کے بعد نیا کارگو لوڈ کر کے واپس ایران چلا جاتا۔ دوسری طرف اگر آپ دوبئ کے ساحل پر اتر جاتے تھے تو کوئی بھی قانون آپ پر لاگو نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پوچھ پریت نہ تھی۔ اس لئے لوگ رسک لے لیتے تھے۔ یہ تمام باتیں مجھے دوران سفر لاہوری لڑکوں نے بتائیں تھیں۔ وہ اکثر دوبئ آتے جاتے رہتے تھے۔

اب ملاحوں نے ایک چھوٹی کشتی سمندر میں اتار دی تھی اور دبی دبی مگر بے حد غصیلی آواز میں وہ ہم سب کو اس میں سوار ہونے کا حکم دے رہے تھے۔ آخر کار ہم سب لوگ اس کشتی میں سوار ہو گئے اور ملاح نے پتوار سنبھال لئے۔ ساحل ابھی دور تھا فورسز کے ٹاور بہت دور نظر آرہے تھے۔ کہیں کہیں ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں ایک نئی دنیا دیکھنے پر بہت خوش تھا کہ اچانک ملاح نے بڑبڑاتے ہوئے کشتی واپس سمندر کی طرف کھیلنی شروع کر دی اور شُرتا شُرتا کہہ کر ہمیں ڈرانا شروع کر دیا۔ اس نے پھر ایک لمبا چکر لگایا اور کشتی کو ساحل کی طرف لے جانا شروع کیا اب صبح کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ پتوار چلاتے چلاتے ملاح تھک چکا تھا اور بے حد بدتمیزی کر رہا تھا۔ کبھی پیسے مانگتا تھا کبھی شرتے کی گولی سے ڈراتا تھا۔ میں نے الطاف سے کہا اس کو جوتے مارتے ہیں یہ باز نہیں آرہا۔ جوتے کھانے کے بعد یہ بالکل سیدھا ہو جائے گا اور ہمارے حکم کے تابع ہو گا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ جیسے ہی ہم نے اس پر ہاتھ ڈالا یہ کشتی الٹا دے گا اور ہم سب سمندر میں گر جائیں گے۔ میں نے فوراً کہا کہ یہ خود بھی تو گرے گا۔ الطاف بولا یہ تو سمندر کے کیڑے ہیں۔ اس کو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ کشتی کو سیدھا کرے گا اور لانچ کی طرف بھاگ جائے گا اور جا کر کہے گا کہ میں سب کو ساحل پر اتار آیا ہوں اور بات ختم ہو جائے گی۔ رحم اور انسانی ہمدردی سے ان لوگوں کی واقفیت نہیں ہے۔

میں خاموش ہو گیا۔ اتنے میں ساحل قریب آگیا اور اس نے ہمیں جلد از جلد سامان سمیت کشتی سے اتر جانے کا حکم دیا۔ میں اور لبنیٰ کریم اپنے بہت ہی مختصر سامان سمیت چھلانگ لگا کر کشتی سے باہر آگئے۔ دیگر

لوگ چونکہ پھیرے باز تھے سامان زیادہ تھا اس لئے ان کو اپنا سامان اتارنے میں کچھ دیر ہوگئی جس پر وہ ملاح بہت سیخ پا ہوگیا۔اس نے لڑکوں کا سامان اٹھا کر بے دردی سے پھینکنا شروع کر دیا اور آناً فاناً یہ جا وہ جا۔

میں غور سے زمین کو دیکھ رہا تھا جس پر ہم کھڑے تھے۔زمین میں سے پانی رس رہا تھا۔مونگے بھی بہت تھے۔اتنے میں الطاف نے کہا کہ اپنا سارا سامان اٹھاؤ اور ساحل سے دور ہوتے چلے جاؤ۔ایسا نہ ہو کہ شک کی بنیاد پر کوئی ہمیں روک کر تفتیش شروع کر دے۔ہم سب نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور الطاف کی رہنمائی میں چل پڑے۔ابھی ہم کچھ دور ہی گئے تھے کہ سامنے پھر پانی تھا۔اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے نظر دوڑانے پر معلوم ہوا کہ ہم کسی ٹاپو پر ہیں لیکن سامنے کچھ دوری پر ساحل بھی نظر آ رہا تھا۔ہم پانی کے کنارے پر جا کر رک گئے۔اس وقت مقامی وقت کے مطابق چھ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ساحل سامنے نظر تو آ رہا تھا مگر ہمارے اور ساحل کے درمیان پانی حائل تھا۔دور سامنے ساحل کے پاس ایک دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔الطاف نے کہا کہ شاید یہ کشتی ہے۔سب نے دیدیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو یقین سا ہوگیا کہ واقعی یہ کشتی ہے۔الطاف مع ایک اور لڑکے کے سمندر میں کود گیا۔بہت جدوجہد کے بعد وہ ہم تک کشتی لانے میں کامیاب ہوگئے۔کیونکہ ہوا مخالف نہ تھی اس لئے کشتی جلد ہی ہماری طرف پہنچ گئی۔کشتی بہت پرانی بوسیدہ اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔

ہم سب اپنے اناڑی پن کی وجہ سے جھٹ پٹ کشتی میں سوار ہوگئے۔پہلے تو کشتی ہوا کے رخ پر چلنے لگی لیکن ساحل کی طرف نہیں بلکہ کھلے سمندر کی طرف۔جب اس کو ساحل کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی گئی تو وہ گولائی میں چکراتے ہوئے الٹنے لگی۔الطاف جو کہ واقعی ایک دلیر آدمی تھا بولا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اگر ہم سب کو اپنی زندگیاں بچانی ہیں تو صرف ایک ہی راستہ ہے کہ دو لڑکے پتوار سنبھال لیں اور کشتی کو ساحل کی طرف دھکیلیں دیگر تمام لڑکے سمندر میں کود جائیں اور کشتی کے کنارے پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ پانی میں سفر کرتے ہوئے کشتی کو سہارا بھی دیں اور سامنے منزل کی طرف دھکا بھی دیتے جائیں۔اس طرح آپ کشتی کا سہارا ہوں گے اور کشتی آپ کا سہارا ہوگی۔الطاف کی یہ ذہانت کام تو بہت آئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سب کی جان بھی بچ گئی۔مگر یہ آسان کام نہیں تھا۔جب ہم اصل ساحل پر پہنچے تو صبح کے 10 بج رہے تھے۔اچانک ہماری نظر اس طرف گئی جس طرف سے ہم آئے تھے۔وہاں پر زمین نام کی کوئی چیز نہ تھی۔صرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔اس وقت ہمیں احساس ہوا کہ وہ بدمعاش ہمیں ٹاپو پر اتار گیا تھا

کیونکہ اب سورج اپنی پوری آب تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا تھا۔ سورج کی جلوہ گری سمندر میں مد و جزر پیدا کرتی ہے اور سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا ساحل سے لہروں کی شکل میں ٹکراتا ہے اور تمام ٹاپو سمندر میں غائب ہو کر سمندر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسی قسم کے ٹاپو پر ہم اترے تھے لیکن قسمت نے یاوری کی اور اصل ساحل پر ہم اپنے قدم رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

شکر الحمد الله رب العالمین

ساحل پر اتر تو گئے مگر ایک جان لیوا مصیبت میں پھنس گئے۔ سب کو پیاس زوروں پر تھی اور دور دور تک آبادی کا نام نشان بھی نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں مٹی اڑاتی ہوا پیچھے سمندر اور آگے تاحد نظر میدان اور ٹیلے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جائیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا پیاس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ میری نظریں چاروں طرف حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ لبنیٰ کریم کا چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر وہ شادابی نہیں تھی جو کہ اس کے چہرے کا خاصا تھی۔ میں اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی غالباً میرے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس کے احساسات بھی میرے متعلق میری سوچ کے مطابق تھے۔

میں نے اس کو بہت تسلی دی۔ وہ بولی ادریس ہم دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں جو مقدر میں ہوگا دیکھا جائے گا۔ میرے متعلق زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی کہ لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور میں ایک نئے ولولے کے ساتھ اس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

سمندری پرندے آتے، پانی میں ڈبکی لگا کر مچھلی پکڑتے اور مخالف سمت میں چلے جاتے۔ میں نے الطاف سے کہا کہ اگر ہم سمندر کی مخالف سمت میں چل پڑیں تو ممکن ہے کہ کوئی چرند پرند یا کسی انسان کا نشان مل جائے اور ہم کسی سڑک تک پہنچ جائیں۔ وہ بولا تم ٹھیک کہتے ہو آؤ چلتے ہیں۔ ہم باہمی یقین کے ساتھ ایک سمت کا تعین کرنے کے بعد چل پڑے۔ چلنے کے بعد گرمی اور پیاس کی شدت سے ہمارا برا حال ہو گیا۔ میں نے الطاف سے کہا کہ دیکھو سامنے دھول اڑ رہی ہے۔ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ سب نے غور کرنا شروع کیا تو وہ کوئی جیپ وغیرہ معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے بہت ہمت کر کے اس جگہ تک پہنچنے کی کوشش کی جس میں کامیاب بھی ہوئے۔ مگر ہمارا ایک ساتھی گرا اور بیہوش ہو گیا۔ جیپ تو ہوا سے باتیں کرتی ہوئی کبھی کی

نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی مگر ہم صحیح رستے پر آ چکے تھے۔ اب ہمارے پاس کوئی اور چوائس نہیں تھی۔ ما سوائے اس کے کہ ہم سب اسی جگہ پر رکیں اور کسی اور راہ گیر کا انتظار کریں کیونکہ نہ تو ہم مزید چل سکتے تھے اور نہ بغیر پانی کے زندہ رہ سکتے تھے۔ سب لوگ بیہوش لڑکے کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک اور جیپ آتی نظر آئی۔ سب نے ہاتھ ہلائے مگر وہ رکی نہیں اور جس تیزی سے آ رہی تھی اسی تیزی سے گذر گئی۔ مجھے اب کچھ کچھ تسلی ہونے لگی کہ یہ کچا راستہ ایک سڑک ہے۔ میں اپنی رائے کا اظہار لبنیٰ کریم اور الطاف سے کر ہی رہا تھا کہ ایک اور لینڈ روور جیپ دور سے آتی نظر آئی اور ہمارے پاس آ کر رک گئی۔ اس جیپ میں صرف ایک ہی بدو تھا جو کہ سٹیئرنگ سنبھالے ہوئے ہمیں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے الطاف سے کہا کہ تم اس سے پانی کی بوتل لے کر بیہوش لڑکے کے منہ میں ٹپکاؤ۔ پانی تو بدو نے دے دیا مگر اشاروں میں کچھ پوچھنے لگا۔ جب ہمیں کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے ہمیں انڈین روپیہ اور ایرانی تومان کے نوٹ نکال کر دکھائے اور پوچھا کہ ان میں سے تمہارے پاس کون سی کرنسی ہے۔ میں نے تومان کی طرف اشارہ کیا تو وہ خوش ہو کر اشارہ کرتے ہوئے بولا یہاں سے بر دوبئ تک ایک ہزار تومان لوں گا۔ لڑکے ذرا سوچنے لگے تو اس نے گاڑی لے جانے کی کوشش کی میں نے جلدی سے اسکو اشارہ کیا کہ منظور ہے۔ اس نے اشارے سے کہا کہ نکالو۔ ہم نے جلدی سے آپس میں ہزار تومان جمع کئے اور اس کو تھما دیئے۔ اس نے دو تین بار گنے اور جب اس کی تسلی ہوگئی کہ نوٹ پورے ہیں اور اصلی بھی ہیں تو فوراً اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کچھ بولا اور اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں اور لبنیٰ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے باقی سب کو اس نے بھیڑ بکریوں کی طرف اپنی گاڑی میں ٹھونس لیا اور اپنی جیپ کو ہوا میں اڑاتا، کچی سڑک پر دھول کے نشان چھوڑتا دوبئ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد تارکول والی پختہ سڑک شروع ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی کیونکہ پیاس سے ہمارا بہت برا حال تھا۔ مزید پچیس تیس منٹ کے بعد ہم بر دوبئ میں دوبئ کی قدیم گرینڈ مارکیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ الطاف اترتے ہی بھاگا اور چند سیکنڈ میں پانی کی بوتلیں لے آیا۔ ہم نے وہاں زمین پر ہی بیٹھ کر پی ڈالیں۔ جب کچھ ہوش آیا تو کوک کے ٹن پی ڈالے۔ 15-20 منٹ کے بعد کچھ نہ کچھ پیتے رہے۔ اس طرح ہماری انرجی اور خوش مزاجی واپس آ گئی۔

اب شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ سب بھوک بھوک پکار رہے تھے۔ ہم سب نے اکٹھے ہی ایک انڈین ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس دوران الطاف ایک ایرانی گیسٹ ہاؤس میں رہائش کا بندوبست کر چکا تھا۔

سب نے اپنے اپنے کمرے میں جا کر غسل کیا اور بے خبر سو گئے۔ علی الصبح میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی غسل ہی کر رہا تھا کہ اذان کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ سب سے پہلے نماز ادا کر کے اپنے مالک و خالق کا شکر ادا کیا کہ اس نے نئی زندگی عطا فرمائی۔ لبنیٰ کریم ابھی سوئی ہوئی تھی۔ اس کو میں نے اٹھایا اور مشورہ دیا کہ وہ بھی تیار ہو کر نماز ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اس نے شرمندگی سے میری بات کو سراہا اور جلدی جلدی باتھ روم کی راہ لی۔ میں تیار ہو کر باہر نکل آیا تو دیکھا کہ الطاف بھی مسجد سے نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا۔ ہم دونوں بہت محبت سے گلے ملے اور پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے لگے۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو دوبئ آتا جاتا رہتا ہوں۔ تمہارا پہلا چانس ہے آؤ تمہیں مرشد بازار گھما لاؤں۔ میں نے کہا کہ میں کمرے میں لبنیٰ کے ساتھ ناشتہ کروں گا اور پھر دن چڑھے دوبئ دیکھنے نکلیں گے۔ میں ناشتہ لے کر کمرے میں آ گیا۔ لبنیٰ نماز ادا کر رہی تھی۔ اپنے عربی لباس میں سکارف سے سر ڈھانپے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکی ہوئی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد گذشتہ حالات و واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے ہم نے محتاط رہنے کا فیصلہ کیا اور دوبئ کو Explore کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ الطاف نے بطور گائیڈ اپنی خدمات پیش کیں لیکن ہم انگلی پکڑ کر بچوں کی طرح چلنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور دونوں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ہمارا دوبئ میں دوسرا دن تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دوبئ میں انڈین روپیہ بطور کرنسی استعمال ہوتا ہے۔ دوبئ کی اپنی کرنسی نہیں تھی۔ ہمارے دوبئ میں قیام کے دوران ہی انڈین روپیہ De-value ہو گیا تو دوبئ کے حکمرانوں نے انٹرنیشنل کورٹ میں انڈیا کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور انڈین کرنسی بند کر کے سعودی ریال ٹھیکے پر لے لئے۔ جب دوبئ گورنمنٹ نے اپنے درہم بطور کرنسی استعمال کیئے تو اس وقت سعودی ریال بند کئے۔ دوبئ میں ٹریفک بھی keep to left تھی۔

ہمارے قیام کے دوران ہی ٹریفک Keep to right ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ پاکستانی مزدور لڑکے فٹ پاتھ رنگ کر رہے تھے اور Keep to left کے سائن ہٹا کر Keep to right کے سائن لگا رہے تھے۔ ہمارے قیام کے دوران ہی شارجہ میں UBL کی برانچ کا افتتاح ہوا جو کہ اس خطے میں پہلا پاکستانی بینک تھا۔ میں اور لبنیٰ UBL کی افتتاحی تقریب میں موجود تھے۔

دوسرے روز ہم علی صبح دوبئ دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ بَر دوبئ میں ایک بہت پرانی مارکیٹ جس میں

ایرانی لوگ مصالحہ جات، میوہ جات اور کپڑا وغیرہ فروخت کرتے نظر آئے۔ لبِ سڑک ہی کریک میں لکڑی کی بڑی بڑی کشتیاں کھڑی تھیں جو بَر دوبئی سے ڈیرہ دوبئی لے کر جاتی تھیں۔ دراصل بَر دوبئی اور ڈیرہ دوبئی کے درمیان صرف کریک ہے۔ ایک کنارے پر بَر دوبئی ہے اور دوسرے کنارے پر ڈیرہ دوبئی ہے۔ اُس وقت قابلِ ذکر مُرشد بازار تھا جس کی پختہ سڑک ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ پتھر بچھایا جا چکا تھا، بقایا کام ہونا ابھی باقی تھا۔۔ مُرشد بازار کے ایک کونے پر دوبئی کی قدیم مارکیٹ تھی جو آج بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُس وقت وہ شکستہ سی تھی آج Renovated ہے۔ لکڑی کی چھت سرکنڈوں کے چھپر کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اس کے نیچے عطر اور دیگر دنیا جہان کی چیزیں فروخت کی جا رہی تھیں جو ایران اور انڈیا سے منگوائی گئی تھیں۔ چائنا کی ۴ پونڈ، ٦ پونڈ اور ٨ پونڈ کی بوسکی اور ہانگ کانگ کی نقلی گھڑیاں قابلِ ذکر تھیں۔ اس زمانے میں Rolex, Zeenth, Fever luba, Camy, westend گھڑیوں کا بہت کریز تھا اور پائیداری کے لحاظ سے مندرجہ بالا برانڈ کی گھڑیاں بے حد اچھی تھیں۔ حیران کن بات جو ہم نے دیکھی وہ یہ تھی کہ یہ نقلی گھڑیاں تول کر کلو کے حساب سے فروخت کی جا رہی تھیں۔

مُرشد بازار کی پشت کی طرف سمندر کے کنارے مچھیرے مچھلی فروخت کرتے نظر آئے۔ مختلف قسم کی مچھلیوں کے چھوٹے بڑے ڈھیر بنا کر لوگوں کو اس طرف متوجہ کر کے بھاؤ تاؤ کیا جا رہا تھا۔ مچھلی کی سڑاند کی بُو چارسُو پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کا یہ کنارا بے حد گندا تھا۔ اس سے تھوڑی دور چند جھونپڑیاں تھیں۔ وہ یہاں کا Red light area تھا۔ انڈین، لبنانی، فلسطینی، ایرانی اور نہ جانے کہاں کہاں سے بدنصیب لڑکیاں بکاؤ مال کی طرح فروخت کی جا رہی تھیں۔ بے شک یہ دنیا کا قدیم ترین لیکن قبیح ترین بزنس ہے۔ اس کے نقصانات ہمیشہ اس قسم کے لوگوں اور اُن کے خاندانوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ حضرت انسان نے اللہ کی عطا کردہ نعمت کو مارکیٹ کا product بنا دیا۔ یہاں پر حضرت انسان کے دو کارنامے جو سیاہ ترین، بدترین اور عزتِ نفس سے عاری ہیں عرض کرتا ہوں۔

لبنیٰ کریم اور میں نے فیصلہ کیا کہ ان جھونپڑیوں کا چکر لگا کر دیکھا جائے کہ یہاں لوگ کیسے بزنس کرتے ہیں۔ ہم دونوں ایک جھونپڑی میں گئے۔ باہر سے یہ جھونپڑی بوسیدہ سی لگتی تھی۔ اندر ایک رنگین پیڑھی پر سرخ رنگ کی مخمل بچھا کر اس پر ایک 18/19 سال کی نہایت خوبصورت فلسطینی لڑکی کو آلتی پالتی مار کر بٹھایا ہوا تھا۔ لوگ آ رہے تھے، دیکھ رہے تھے، مذاق بھی جاری تھا۔ اس بکاؤ مال کا دلال ایک لمبا تڑنگا،

بڑی بڑی مونچھوں والا یمنی تھا جو نہایت بے شرمی اور بے عزتی سے اس لڑکی کی تعریفیں اور مول تول کر رہا تھا۔ اسی طرح کے مناظر دیگر جھونپڑیوں میں بھی تھے۔ ان جھونپڑیوں کے آخر میں چند جھونپڑیاں الگ تھلگ بھی تھیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ she-male تھے یا تھیں۔ دوسری خاص بات جو ہم نے نوٹ کی کہ وہ لوگ جب آپس میں بات کرتے تو مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایسے لوگ جو خوشحال تھے اور اپنی کار بھی رکھتے تھے، عربی لباس زیبِ تن کئے ایک خاص جگہ کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح پر وِرد جاری رکھتے۔ جب بھی اسی قماش کی عورت پر ان کی نظر پڑتی تو اس کو یا اس کے دلال کو تسبیح کا بانکا کھڑا کر کے دکھاتے اور اپنی کار میں بیٹھ جاتے۔ حسبِ حالات اور حسبِ موقع ان کی مطلوبہ Product بھی کار میں آ کر بیٹھ جاتی اور یہ جا وہ جا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا تعلق دوبئی کی اشرافیہ سے تھا جو Red light area میں نہیں جا سکتے تھے۔ دکاندار لوگ ایسے گاہکوں کی تلاش میں سڑکوں اور اُن خاص جگہوں کے چکر لگاتے رہتے کیونکہ ایسا شکار اتنی رقم دے جاتا جو عام مارکیٹ میں ملنا محال تھی۔

ہم دونوں دوبئی میں خوب گھومتے پھرتے رہے۔ کبھی سمندر کا کنارہ، کبھی مصری بیلے ڈانسرز کا فن دیکھا، کبھی شارجہ، کبھی العین، غرض کوئی بھی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ہم نہ گئے ہوں۔ ایک دن الطاف گروپ ہمیں ملنے آ گیا۔ الطاف نے بتایا کہ کل رات وہ لانچ کے ذریعے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا بزنس ٹور اچھا رہا اور یہ کہ وہ دوبئ سے بھی کافی مال لے کر ایران جا رہے ہیں، اس کے بعد ان کا عراق جانے کا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو اور آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ وہ بولا کہ آپ اور ہم مصیبت بھرے سفر کے ساتھی ہیں۔ کئی جگہ آپ کی رائے بہت کام آئی جس نے ہمیں اور آپ کو جان بچانے میں بہت مدد کی۔ ہم زندگی بھر آپ کو یاد رکھیں گے۔ اللہ حافظ! ہم نے ایک دوسرے کو بوجھل دل سے الوداع کہا۔

ایک روز ہم مُرشد بازار میں گھوم رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر گھڑیوں کی ایک دکان پر کھڑے دیپک ترپاٹھی پر پڑی۔ ہم جس ہوٹل میں رہائش پذیر تھے دیپک ترپاٹھی کی بیوی اسی ہوٹل کے کچن میں کام کرتی تھی۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کی عمر چار پانچ سال تھی۔ یہ بہت پیارا بچہ تھا۔ اکثر راہداری میں کھیلتا ہوا ہمارے کمرے میں بھی آ جاتا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران اگر وہ آ جاتا تو ہم اس کو کرسی پر بٹھا دیتے اور اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ ایک روز اس کی والدہ کملا دیوی اس کو ڈھونڈتی ہوئی اچانک کمرے میں آ گئی۔

اس وقت وہ بچہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ گوشت کی بوٹی آدھی اس کے منہ میں تھی اور آدھی ہاتھ میں۔ جیسے ہی کملا کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی تو اس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر مار کر شور مچانے لگی کہ میرے بیٹے کو ماس (گوشت) کھلا دیا۔ ہمارا دھرم نشٹ (تباہ) ہو گیا۔ بڑا جلم (ظلم) ہو گیا ہے ہمارے ساتھ۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر نکال دیا اور بچے کو بھی اس کی ماں کے ساتھ روانہ کیا۔ جاتے جاتے اُسے کہا کہ جو کچھ ہم کھا رہے ہیں تم نے ہی پکایا ہے، اُس وقت تمہارا دھرم نشٹ نہیں ہوا۔ Get out! اور وہ شور مچاتی چلی گئی۔ دوسرے روز ہمارے کمرے کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک آدمی اُسی بچے کو لے کر دروازے میں کھڑا تھا۔ بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ میں نے پیار سے پوچھا کہ بیٹا آپ کیوں رو رہے ہو؟ بچہ باہیں کھول کر میرے پاس آ گیا اور چپ ہو گیا۔ میں نے آدمی کی طرف دیکھا تو وہ بولا میرا نام دیپک ترپاٹھی ہے۔ یہ بچہ میرا بیٹا اور کملا میری پتنی (بیوی) ہے۔ ہم لوگ پٹنہ، انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں اور میں ایک عربی کی گھڑیوں کی دکان پر کام کرتا ہوں۔ میں نے آنے کی وجہ پوچھی تو ہاتھ جوڑ کر بولا، مہاراج! میرا بیٹا صبح سے رو رہا تھا کہ چاچا کے پاس جانا ہے۔ میں نے اور اس کی ماں نے بہت بہلایا مگر اس کے رونے چلانے کی رفتار اور زیادہ ہو گئی۔ میں مجبور ہو کر اسے آپ سے ملوانے لایا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ بچے کو یہیں چھوڑ جاؤ اور وہ بچے کو میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

گھڑیوں کی دکان پر جب دیپک نے ہمیں دیکھا تو بہت اپنائیت اور محبت سے اُس نے ہمیں دکان میں آنے کی دعوت دی۔ جیسے ہی ہم دکان میں داخل ہوئے وہ بھاگا گیا، کوک کے دو ٹن لے آیا اور ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے۔ ہم اُس کی دکان میں سجی مختلف برانڈز کی اصلی اور نقلی گھڑیوں کو دیکھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ دیپک بار بار میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دراصل میں نے اس دن اپنا بہاولپوری تِلے دار کھُسہ پہنا ہوا تھا۔ میں نے جب اُس سے وجہ پوچھی تو وہ بولا کہ مہاراج آپ کا جوتا بہت کھوب صورت (خوب صورت) ہے، میں نے ایسا جوتا پہلی بار دیکھا ہے۔ اس کی للچائی ہوئی نظریں دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اُسے کہا کہ مہاراج اگر آپ کو یہ جوتا پسند ہے تو یہ آپ کو مل سکتا ہے۔ وہ بولا مہاراج کتنے کا دیں گے؟ میں نے کہا کہ یہ بالکل نیا جوتا ہے جو میں نے آج دوسری بار پہنا ہے۔ یہ میں آپ کو بالکل فری دوں گا، بس میری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔ وہ بولا کہ وہ کیا مہاراج؟ میں نے کہا کہ آپ کو کلمہ شریف پڑھنا ہوگا اور میرے ساتھ ہسپتال جا کر ختنہ کروانا ہوگا۔ وہ کچھ ناراضگی سے بولا مہاراج ایسا مذاق اچھا نہیں جس

سے دھرم پر بات آئے۔ مجھے یہ کھوب صورت جوتا نہیں چاہیے مجھے ماپھ (معاف) رکھو۔ میں ہنسی میں لوٹ پوٹ دکان سے باہر آ گیا۔لبنیٰ کریم کچھ نہ سمجھ پائی اور بولی آپ نے اس کو ہندی میں کیا کہا ہے جو یہ ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا؟ میں پہلے تو ٹالتا رہا، جب اس کا اصرار بڑھ گیا تو میں نے اس کو تمام ماجرا سنا دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔

ہم نے واپسی کا پروگرام بنایا اور لانچ کی بجائے بحری جہاز العباس سے بندر عباس کے لیے اپنی بکنگ کروائی۔ ایک رات ہم کسی ہوٹل میں باربی کیو کے لیے گئے تو دیکھا ایک کونے میں ترپاٹھی بیٹھا تکوں کی پلیٹ کے ساتھ انصاف کر رہا ہے۔ ہمیں دیکھ کر نظریں چرانے لگا۔ میں نے شرارتاً پرنام کیا اور کہا کہ آج میں کملا دیوی کو بتاؤں گا کہ آپ گائے کے تکے کھا رہے تھے۔ دھرم تو نشٹ ہوا ہی تھا ساتھ ہی پھیرے بھی بھرشٹ ہو جائیں گے۔ اب بھی مان جاؤ، سیدھے ہسپتال چلتے ہیں، پھر مولوی صاحب کے پاس چلیں گے اور کلمہ شریف پڑھیں گے، پھر چاہے پوری گائے کھا جانا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ نوالہ اس کے گلے میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ غصے میں بولا جاؤ جاؤ جس کو مرضی بتا دو۔ وہ سالی (کملا دیوی یعنی اُس کی بیوی) ہوٹل سے پکا پکایا گوشت لا کر کھاتی ہے۔ میں کوئی ہندو گاؤ ماتا کا ماس (گوشت) نہیں کھا رہا، یہ تو کسی اور ملک سے آئی تھی، یہ ہماری ماتا نہیں۔ ہاں اگر یہ ہندو گاؤ ماتا ہوتی تو میں یہاں کھڑا بھی نہ ہوتا۔ پھر وہ روہانسی شکل بنا کر ہاتھ جوڑ کر بولا مہاراج کرپا کریں، کیوں میرا ویک اینڈ خراب کر رہے ہیں۔ جب یہ سب باتیں میں نے لبنیٰ کو بتائیں تو وہ ہنسی کا گول گپا بن گئی۔

اگلے دو روز کے بعد ہماری واپس روانگی تھی۔ العباس نامی بحری جہاز کی فرسٹ کلاس میں ہماری بکنگ کنفرم ہو چکی تھی۔ ہم ہر جگہ الوداعی دورہ کرتے جیٹی پر پہنچ گئے۔ بحری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے پاسپورٹ طلب کئے گئے اور انہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس نے ہمیں پاسپورٹ واپس کر دئے۔ ہمیں welcome کہتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے رہنمائی بھی کی۔ اس طرح ہم اپنے کیبن میں آ گئے۔ جہاز کی اپنی ہی ایک دنیا تھی۔ صاف ستھرا اور مزیدار کھانا، چاک و چوبند سٹاف، نائیٹ کلب جس میں مصری اور ترکش لڑکیاں بطور ڈانسرز اور بار گرل کے طور پر موجود تھیں۔ لبنیٰ کریم نے مجھ سے پوچھا کیا آپ انگور کی بیٹی سے شغل نہیں کرتے؟ میں نے کہا No۔ وہ بولی آپ ایک اچھے اور ذہن کے صاف انسان ہو۔ میں نے اُسے شکریہ کہا۔ نہ جانے رات کے کس حصے میں جہاز نے لنگر اٹھا دیے۔ صبح ناشتے سے

فارغ ہوئے ہی تھے کہ اعلان ہوا کہ ہم ایک گھنٹے بعد پورٹ کی برتھ نمبر 13 سے منسلک ہوں گے۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب جہاز چلا، کب پورٹ پر آ گیا۔ یہ ایک آرام دہ اور یادگار سفر تھا۔

بندر عباس پہنچ کر سب سے پہلے میں نے سکوٹر کی سروس کروائی۔ اس کی دیکھ بھال اور غذائی ضرورت پوری کی۔ وہ ایک وفادار ساتھی تھا۔ ہر وقت خدمت کے لیے تیار رہتا۔ کبھی ناراض نہ ہوتا۔ لبنی کریم کو جہاں سے بھی موقع ملا وہ عراق فون کر کے خیریت معلوم کرتی رہی۔ بندر عباس سے ہمارا پروگرام تہران جانے کا تھا اور پھر وہاں سے ترکی کے شہر ارزروم جانا تھا۔ تہران پہنچ کر حسبِ سابق اس نے عراق فون کیا۔ کچھ دیر تو وہ باتیں کرتی رہی پھر رونے لگی اور زمین پر بیٹھ گئی۔ میں کانپ سا گیا اور سمجھ گیا کہ خیریت نہیں ہے۔ بہت مشکل سے وہ مجھے بتا پائی کہ گورنمنٹ کے گماشتوں نے فائرنگ کر کے اس کے دو بھائی اور چچا سمیت قبیلے کے سترہ لوگوں کو قتل کر دیا اور باقی لوگ روپوش ہیں۔ وہ بولی، ادریس! مجھ واپس جانا پڑے گا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ اسی طرح روتی میرے ساتھ ٹرانسپورٹ بکنگ آفس آئی، اپنی سیٹ کنفرم کروائی اور رات ۸ بجے عراق کے لیے روانہ ہوگئی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کو الوداع کہا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ میرے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ بولی، ادریس! تم ایک بہت اچھے لڑکے ہو۔ میں تمھیں کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔ اس نے ایک کاغذ جس پر ایڈریس لکھا ہوا تھا میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، مجھے نہیں معلوم ہم آئندہ کبھی مل سکیں گے یا نہیں، لیکن دجلہ کی پری تمھاری منتظر رہے گی۔ سرخ اور خوبصورت آنسو بھری آنکھوں کی پلکیں جھکائے وہ بس میں سوار ہوئی اور چلی گئی۔

میں کٹا پھٹا، حیران پریشان کافی دیر تک بس اسٹینڈ پر کھڑا رہا۔ پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ساری رات سو نہ سکا مگر ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ صبح ہوتے ہی عراقی ایمبیسی کے گیٹ پر پہنچنے والا پہلا درخواست گذار میں ہی تھا۔ ویزا فارم مع فیس جاری کر دیئے گئے۔ پاسپورٹ بھی جمع کر لیا گیا اور رسید جاری کر دی گئی۔ دوسرے روز تین بجے پاسپورٹ واپس ملنا تھا۔ پہلے بھی میں نے عراق کا ویزا اسی طرح اس جگہ سے لیا تھا۔ رات بمشکل گذری۔ میں سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہا، ٹھیک تین بجے ایمبیسی کے گیٹ پر تھا۔ پہلے تو رسید دکھانے پر کھڑکی سے ہی پاسپورٹ دے دیا گیا تھا جس پر ویزا بھی لگا ہوا تھا لیکن اس بار کچھ دیر انتظار کے بعد مجھے اندر طلب کیا گیا۔ ویزا آفیسر نے مجھ سے عراق جانے کی وجہ پوچھی۔ میں

نے جواب دیا کہ میں پہلے بھی ۳۰ روز عراق کا وزٹ کر آیا ہوں اور مزید ۳۰ روز کا وزٹ کرنا چاہتا ہوں۔ آفیسر نے اس بار سختی سے پوچھا۔۔ کیوں؟۔۔ میں بولا یہ میری خواہش ہے۔ اُس نے کچھ اخبارات نکال کر میرے سامنے میز پر پھیلا دیں اور بولا تمھارے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟ میں نے کہا یہ میری دوست اور ساتھی سیاح ہے۔ اُس نے پوچھا یہ تمہیں کہاں ملی؟ میں نے بتایا کہ وہ مجھے عراق میں ملی تھی، بطور گائیڈ میں نے اس کی خدمات ہائر کی تھیں۔ پھر وہ مجھے اتفاقاً قصرِ شیریں میں ملی اور ہم اکھٹے سیاحت کرتے رہے۔ وہ بولا اب یہ لڑکی کہاں ہے؟ میں نے بتایا کہ وہ عراق واپس چلی گئی ہے اور اب کہاں ہوگی یہ مجھے نہیں معلوم۔ اُس نے میری ویزے کی درخواست نامنظور کرتے ہوئے میرا پاسپورٹ مجھے واپس تھما دیا۔ میں کچھ کہنے لگا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے، آپ جا سکتے ہیں۔ وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ میں سوچوں میں غرق ایمبیسی سے باہر آ گیا۔

اس کے بعد میں ایک سال تک لبنیٰ کریم کرد کو خط لکھتا رہا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے تمام خطوط سنسر یا کسی ایجنسی کی نظر ہو رہے ہیں۔ آخر ایک روز مجھے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ دجلہ کی پری اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ آج بھی ۴۸ سال گذرنے کے باوجود میرے اندر کا ادریس لبنیٰ کریم کے اس دنیا سے گذر جانے کا غم کرتا ہے۔ جیسے آگ میں دبی چنگاریوں کو اگر ہوا دی جائے تو دوبارہ آگ لگ سکتی ہے، بس ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔ آج سے 3/4 سال پیشتر میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہیلو کہا تو ایک شخص نے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ وہ شخص بولا میں دولت مند بول رہا ہوں۔ مجھے یہ لفظ اور اندازِ تکلم اچھا نہیں لگا۔ میں نے جواباً طنزیہ کہا کہ میں ایک غریب آدمی بول رہا ہوں، فرمایئے کیسے تکلیف فرمائی؟ ایک سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ پھر سنبھل گیا اور بولا: ادریس صاحب بُرا نہ مانیں میرا نام دولت مند ہے۔ پھر اُس نے میرے ایک دوست میاں ظہیر صاحب کا نام لیا کہ آپ اُن کے ساتھ میری دکان پر آئے تھے اور میاں ظہیر صاحب میرے قریبی عزیز ہیں۔ اپنے دوست کا حوالہ سن کر میں کچھ نرم پڑ گیا اور اخلاقی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا: دولت مند صاحب فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے لمبی تمہید باندھنی شروع کر دی۔ مجھے کچھ سمجھ آیا کچھ نہیں۔ میں نے کہا آپ کو جو بھی بات کرنی ہے آپ خود تشریف لائیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ وہ بولے میں ضرور آؤں گا۔ دو روز گذر گئے، وہ خود تو نہ آئے مگر دو خواتین اُن کے حوالے سے تشریف لے آئیں۔

میں اپنے گھر کے لان میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ خواتین کو اندر آتے دیکھ کر میں احتراماً کھڑا ہو گیا اور سلام کرنے میں بھی پہل کی۔ انہوں نے دولت مند صاحب کا حوالہ دیا۔ ایک دولت مند صاحب کی اہلیہ محترمہ تھیں اور دوسری غالباً اُن کی بہن یا کزن تھی۔ ایک خاتون کالی چادر میں اور دوسری بغیر چادر کے تھیں۔ کالی چادر والی خاتون کی آنکھیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ میں نے یہ آنکھیں پہلے بھی کہیں دیکھی ہیں۔ ابھی میں اسی تذبذب میں تھا کہ سخت گرمی کی وجہ سے کالی چادر والی خاتون نے اپنی چادر اتار کر ساتھ پڑی کرسی پر رکھ دی اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے اپنا خون منجمد ہوتا محسوس ہوا کیونکہ وہ ہو بہو لبنیٰ کریم کرد سے مشابہہ تھی۔ وہی انداز، عربی نما اُردو، موٹی موٹی کٹار سی خوبصورت آنکھیں، چمکتی پیشانی، گفتگو میں بھی بہت نازک، ریشم کی طرح نرم، ایک خاص ادا سے ہاتھوں اور آنکھوں سے باتیں کرتی ہوئی۔ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اُس سے پوچھا کہ کیا آپ کا تعلق عراق سے ہے؟ وہ بولی آپ کو کیسے پتہ چلا؟ میں نے پھر پوچھا کہ کیا واقعی آپ کا تعلق عراق سے ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! میرے والد روزگار کے سلسلے میں کئی سال عراق میں رہے۔ انہوں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ میری ماں عراقی کرد تھی۔ میں عراق میں پیدا ہوئی۔ جب میرے والدین پاکستان آ گئے تو میں بھی اُن کے ساتھ آ گئی۔ میں اُس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور لبنیٰ کریم کرد ایک بار پھر میرے سامنے آ گئی۔۔۔

لیکن وقت کی دھول بے حد ظالم ہوتی ہے۔ ہر چہرے کو ڈھانپ لیتی ہے۔۔۔۔۔ دجلہ کی پری کی یاد کو بھی۔۔۔۔۔۔

بقول غالب۔۔۔

عرضِ نیاز شوق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

تیسرا باب

دلی میں وہ سترہ دن

(بھارتی دارالحکومت میں سترہ دن بسر کرنے والے پاکستانی کی کہانی)

مجھے اپنے آباؤ اجداد کا شہر ہردو خان پور ضلع ہوشیار پور، بھارت دیکھنے کا بے حد شوق تھا اور ہے۔ میں اکثر اس بات کا تذکرہ ایس ایم یحییٰ مرحوم سے بھی کیا کرتا تھا۔ موصوف کے دادا محترم اور میرے پردادا محترم دونوں سگے بھائی تھے۔ اُن کے ایک عزیز ہوشیار پور گئے تھے۔ وہاں سے وہ کچھ تصاویر بھی اپنے موبائل فون کے ذریعے بنا لائے تھے۔ اس تصویری خبر نامے کے مطابق ہمارے آباؤ اجداد کی قبور ابھی تک صحیح سلامت تھیں اور ان کی رہائش گاہوں پر سیمنٹ سے یحییٰ منزل اور دیگر نام، تعمیرات کی تواریخ وغیرہ لکھی ہوئی تھیں۔ میرے پردادا حاجی غلام محی الدین کی قبر کے کتبے کی جھلک بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ جس نے میرے شوق کو اور ہوا دی۔ میں نے اس کا ذکر اپنے ایک دیرینہ دوست میاں ظہیر احمد سے کیا تو وہ بھی اسی مرض میں مبتلا نکلے اور بولے کہ میرا تعلق ضلع پٹیالہ کے ایک گاؤں بسی سے ہے۔ میں پرائمری کلاس تک وہاں کے سکول میں پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ گھر سے سکول کا راستہ، سکول کے کمرے، اساتذہ کرام کے نام، محلے کی گلیاں اور دوستوں کے نام وغیرہ۔ ان سب جگہوں اور بچپن سے ملنے کی خواہش میاں صاحب میں بھی بدرجہ اَتم موجود تھی۔ وہ سارا وقت پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے پھر یکدم چونک کر بولے کہ میرے ماموں زاد بھائی سپورٹس آفیسر ہیں اور انڈیا جانے والی کبڈی اور دیگر کھیلوں کی ٹیموں کا ویزا وغیرہ وہی لگواتے ہیں۔ اپنا پاسپورٹ لے آؤ، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے پاسپورٹ اُن کے حوالے کر دیا۔ چند روز کے بعد وہ کچھ کاغذات لے آئے کہ ان پر دستخط کر دو۔ وہ بھی کر دیئے گئے۔ تین ہفتے کے بعد پاسپورٹ ویزا لگ کر آ گئے۔

3 مئی 2007ء کو دوستی بس سے لاہور دہلی کی بکنگ کے بعد ٹکٹیں اور سفری کاغذات آئے تو ٹکٹوں پر سیٹ نمبر نہ تھا۔ میں نے اسی وقت فون کر کے نمبر پوچھا تو بکنگ کرنے والے صاحب فرمانے لگے کہ سیٹ نمبر موقع پر ہی الاٹ کیا جائے گا۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر موقع پر آپ مجھے آخری نمبر

الاٹ کریں گے تو مجھے منظور نہیں ہوگا اور میں سفر نہیں کروں گا۔ مجھے بس میں سوار ہونے سے پہلے اپنا سیٹ نمبر معلوم ہونا چاہیئے۔ وہ بولے آپ ہمارے منیجر صاحب سے بات کرلیں اور مجھے ایک نمبر عطا کر دیا۔ میں نے فوراً ہی وہ نمبر ڈائل کیا تو ایک صاحب نے بڑے شُستہ انداز سے ہیلو کہا۔ میں نے اپنا نام بتایا اور سلام دعا کے بعد اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے بہت مہربانی فرمائی اور سیٹ نمبر 3 اور 4 الاٹ کر دیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ فون بند کر دیا۔ غالباً یہ کوئی ریٹائرڈ لیفٹنٹ کرنل تھے۔

لاہور میں میرا قیام ڈاکٹر جاوید حسن کے پاس تھا۔ دوسری صبح اتوار ہونے کی وجہ سے چھٹی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر پرویز حسن، ڈاکٹر طارق حسن، بریگیڈیر نجیب اور اُن کی اہلیہ محترمہ آپا شمع بھی تشریف لے آئے۔ آدھی رات تک گپ شپ اور کھانا پینا چلتا رہا۔ رات دو بجے اچانک ڈاکٹر پرویز حسن کو کچھ خیال آیا اور فرمانے لگے کہ یار ادریس کو آرام کرنے دو، صبح اس نے دہلی جانا ہے۔ سب نے ازراہِ ہمدردی مجھے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اب سونے کا مطلب تھا کہ دہلی نہیں جانا کیونکہ آنکھ کھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے میں نے تیاری شروع کر دی جو ایک گھنٹے سے زیادہ کی ہی ہوتی ہے۔ پھر میاں ظہیر صاحب کو بھی pick کرنا تھا جو اپنے کسی عزیز کے پاس ایک گھنٹے کی ڈرائیو کی دوری پر ٹھہرے ہوئے تھے۔

بس نے صبح آٹھ بجے جانا تھا لیکن مسافروں کو بس ٹرمینل پر جو کہ لبرٹی میں تھا، صبح 4 بجے رپورٹ کرنے کو کہا گیا۔ راقم الحروف اور میاں ظہیر احمد صاحب 3:45 پر بس ٹرمینل پہنچ گئے تھے۔ غالباً سب سے پہلے پہنچنے والے مسافر ہم ہی تھے۔ بس اپنے ٹھیک ٹائم پر عازمِ سفر ہوئی۔ بس ٹرمینل پر کوئی ہنستا مسکراتا چہرہ نہ تھا۔ اکثر Rocky faced تھے۔ بے حد سنجیدہ، کچھ پریشان، ضرورت سے زیادہ محتاط، صاف پتہ چلتا تھا کہ خفیہ والے ہیں۔ بس آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ میرا سر بوجھل بھی تھا اور نیند بھی آ رہی تھی۔ لیکن دہلی جانے کی ایک انجانی سی خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے میں active تھا۔ واہگہ بارڈر پر پاکستانی side پر ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ FIA کا تمام سٹاف راؤ صاحبان پر مشتمل تھا۔ ان کے ایس پی ڈاکٹر راؤ سردار علی خان تھے جو میرے دیرینہ دوست راؤ شافع علی خان صاحب، ریٹائرڈ سیشن جج کے بھائی ہیں۔ سب لوگ بہت عزت سے پیش آئے۔ ویٹنگ روم میں بٹھایا، چائے پلائی اور ہمیں اللہ حافظ کہا۔ میں ان سب حضرات کا بے حد ممنون ہوں اور ان کے لیے دعا گو رہتا ہوں۔

ہم واہگہ بارڈر کے آزادی گیٹ سے پیدل گذر کر انڈیا کی طرف آ گئے۔ اور ایک ہال میں داخل ہو گئے جہاں پر تمام سہولیات بہتر انداز میں میسر تھیں۔ کاؤنٹر پر کھڑے ایک صاحب نے ہاتھ آگے کی طرف بڑھایا تو میں نے اپنا اور میاں صاحب کا پاسپورٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے مجھے بہت برے انداز میں گھورتے ہوئے میرے ہاتھ سے دونوں پاسپورٹس ایک جھٹکے سے لے لئے اور ہمیں حکم دینے کے انداز میں کہا کہ سامنے بیٹھ کر انتظار کرو۔ 15/20 منٹ بعد اس نے مجھے بلایا اور پاسپورٹ اور کچھ stamped فارم دیئے۔ اس کے بعد کسٹم کی باری آئی۔ کسٹمز والوں کا رویہ کافی شریفانہ تھا۔ اب تمام مسافر دوبارہ بس میں سوار ہو گئے۔ ہم دونوں کے پاس صرف ایک ایک چھوٹا ٹرالی بیگ تھا۔ مگر دیگر لوگوں کے پاس وزنی سامان بھی تھا۔ جس کو سکھ قلی بس سے اتار اور چڑھا رہے تھے اور منہ مانگے دام وصول کر رہے تھے۔ اب سفر دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ میرا ذہن بار بار اُس متعصب ہندو کی طرف جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس قماش کے لوگ بدترین حاکم اور بہترین محکوم ہوتے ہیں۔ میں بس میں بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری خواہش پوری کر دی۔ مجھے دنیا کے اکثر ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بھارت دیکھنے کے شوق کی بھی آج تکمیل ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار بوٹسوانہ میں اپنے قیام کے دوران بھی بھارت کا ویزا لیا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد جس صبح میں نے بمبئی کے لئے فلائٹ لینی تھی اسی رات میرے بڑے بھائی شفیق احمد صاحب وفات پا گئے۔ اس لیے میں اپنے شوق کی تکمیل نہیں کر سکا۔ لیکن آج میں دہلی کی طرف محوِ سفر تھا۔

ہمارا پہلا پڑاؤ کرتار پور آیا۔ جہاں مسافروں کو دوستی بس سروس کی طرف سے دوپہر کا کھانا دیا گیا۔ کھانا کیا تھا؟ موٹے اُبلے ہوئے چاول، بدذائقہ دال۔ سبزی کا بھی برا حال تھا۔ اگر میں بھولتا نہیں تو کرتار پور سابق صدرِ بھارت گیانی ذیل سنگھ کا علاقہ ہے۔ مسافروں کے بس میں سوار ہونے کا اعلان کیا گیا تو میں جلدی سے واش روم چلا گیا۔ جب واش روم سے باہر نکلا تو میرے واش روم کے عین سامنے ہریانہ پولیس کا سکھ سب انسپکٹر اکڑا ہوا کھڑا تھا۔ جب ہماری نظریں ملیں اور مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا تو میں نے ازراہِ تفنن کہا کہ ''سردار جی! جی آیاں نوں۔ تُسی ایویں تکلف ہی کیتا، اندر میرے نال ای آ جاندے''۔ (یعنی سردار جی! آپ نے یوں ہی تکلف کیا۔ آپ میرے ساتھ ہی اندر آ جاتے)۔ وہ ہنس پڑا اور بولا کہ ''بس جی ڈیوٹی تے فیر ڈیوٹی اے''۔ میں نے محسوس کیا جیسے ہم مسافر نہیں بلکہ جنگی قیدی ہیں کیونکہ ہماری بہت

نگرانی کی جارہی تھی۔ مسافروں سے زیادہ تعداد پولیس اور خفیہ والوں کی تھی۔ ایک پولیس سکواڈ ہماری بس سے آگے اور ایک پیچھے تھا۔ بس کے اندر بھی پولیس والے موجود تھے۔ بس کے دونوں دروازوں میں بھی ایک ایک سب انسپکٹر پولیس کھڑا تھا۔ آخرکار شام کو مغرب کے وقت بس دہلی پہنچ گئی۔

جب ہم بس ٹرمینل سے باہر آئے تو ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ موسم کو دیکھتے ہوئے ٹیکسی، آٹو رکشہ، سائیکل رکشہ سب نے اپنے اپنے ریٹ کئی گنا بڑھا دیے تھے۔ ہمارے ایک PIA کے دوست نے ہمیں بتایا تھا کہ قرول باغ اچھی جگہ ہے اور وہاں صاف ستھرے ہوٹل مناسب دام میں میسر ہیں۔ 3/4 فرلانگ چلنے کے بعد ایک آٹو رکشہ والا مل گیا جو میٹر کے مطابق کرایہ لینے کو تیار تھا۔ ہم جھٹ سے رکشہ میں بیٹھ گئے اور اُسے قرول باغ چلنے کا کہا۔ قرول باغ پہنچ کر رکشے والے نے پوچھا کہ صاحب کہاں جانا ہے؟ میں نے کہا یہاں جو ہوٹل سب سے اچھا ہے وہاں لے چلو۔ اس نے ہمیں کئی ہوٹل دکھائے جو اچھے نہیں تھے۔ میں نے اسے اشاروں کنایوں میں ہوٹل والوں کے ساتھ کمیشن طے کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ آخرکار میں نے اسے کہا کہ ہمیں یہیں سڑک کے کنارے اتار دو، اپنا کرایہ لو اور جاؤ۔ آخر وہ پھٹ پڑا اور کہنے لگا کہ آپ کسی نہ کسی ہوٹل میں تو ٹھہریں گے، میرے کہنے پر ہوٹل پسند کرلیں مجھے کمیشن مل جائے گا۔ ابھی میں اسے کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ مجھے ''ست سری اکال'' کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک پہلوان نما سردار جی ہاتھ جوڑ کر کھڑے تھے۔ میں نے اخلاقاً جواب دیا تو بولے کہ غالباً آپ لاہور سے تشریف لائے ہیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹرالی بیگ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے ایک طرف چل پڑے کہ جب آپ کا اپنا ہوٹل موجود ہے تو اِدھر اُدھر کیوں بھٹک رہے ہیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک خوبصورت بلڈنگ تھی۔ مین گیٹ پر ہی ملازم نے آ کر ہمارے بیگ لے لیے اور ہم لاؤنج میں پہنچ کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ سردار جی بولے، ''یہ میرا ہوٹل ہے۔ اسی طرح کے میرے چار اور ہوٹل بھی اس علاقے میں ہیں۔ میں اکثر لاہور جاتا رہتا ہوں جہاں ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک ہوتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ لاہور سے آنے والے مہمان ہمارے پاس ہی قیام کریں۔ اگر آپ کو جگہ پسند نہ آئے تو میری کار اور ڈرائیور باہر موجود ہے۔ جہاں بھی آپ حکم کریں گے آپ کو چھوڑ آئے گا۔ اتنی دیر میں آپ مشروب لیں۔ کھانے کی طلب ہو تو ڈائننگ ہال سامنے ہے وہاں چلتے ہیں''۔ میں نے ہوٹل کے ٹیرف کے بارے میں پوچھا تو سردار جی جذباتی ہو کر بولے کہ کوئی ٹیرف نہیں۔ اگر رہائش اور کھانے سے مطمئن ہوں تو جو دل چاہے

ٹیرف دیں ورنہ لاہوریوں کے لیے سب مفت حاضر ہے۔ میں اور میاں صاحب ہنس پڑے۔ میں نے کہا سردار جی ہمیں ہمارا کمرہ دکھائیں۔ ہم فریش ہو کر آتے ہیں۔ پھر کھانا بھی کھائیں گے۔

کمرے بہت اچھے تھے۔ سروس بھی عمدہ تھی۔ اس کے ساتھ سردار جی کا اندازِ بیان بھی غضب کا تھا اس لیے ہم نے لنگر ڈال دیے۔ کھانا کھا کر ہوش نہ رہا اور صبح دیر تک سوتے رہے۔ اُٹھ کر تیار ہوئے تو فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے اُن صاحب سے ملنا چاہئے جنھوں نے ہمارا ویزا اسپانسر کیا تھا۔ ہم ٹیکسی لے کر کناٹ پلیس کے پوش علاقے میں واقع کناٹ پیلس ہوٹل پہنچ گئے۔ کاونٹر پر کھڑے ملازم کی راہنمائی میں ہم کمرے تک پہنچ گئے۔ کمرے کے اندر ایک عمر رسیدہ، خوش گفتار اور خوش لباس شخص سے ملاقات ہوئی جو سرگودھا کے انداز کی پنجابی بول رہا تھا۔ ہم نے اپنا تعارف کروایا تو بہت محبت سے ملا۔ باتوں کے دوران پتہ چلا کہ موصوف سرگودھا سے ہجرت کر کے 1947ء میں دہلی تشریف لائے تھے۔ چناب کلب کے اب بھی ممبر ہیں اور کلب کی سب تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ کلب کی صد سالہ تقریب میں انہیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا اور ان کی پذیرائی کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کافی خوش تھے۔ وہ غالباً اُس وقت کلب کے سب سے سینئر ممبر تھے۔ انھوں نے ہم سے ہمارے قیام و طعام کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ہوٹل کے بارے میں بتایا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کوئی تکلیف ہو تو بیان کریں۔ میں نے کہا کہ ہم پہلی بار دہلی آئے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ کرنی ہے، اس کی رہنمائی فرمائیں۔ انھوں نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور حکم دیا کہ پہلے ہمیں ترکمان گیٹ پاکستان رپورٹنگ سنٹر لے جائے اور واپسی پر ہمارا سامان بھی ہوٹل سے لیتا آئے۔ ہمیں اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا اور بولے کہ لنچ اکٹھے کریں گے۔

ڈرائیور ہمیں رپورٹنگ سنٹر لایا۔ ہم نے کاؤنٹر پر اپنے پاسپورٹ اور فارم دیے۔ انسپکٹر پہلے تو انہیں پڑھتا رہا پھر درشت لہجے میں بولا کہ آپ دہلی کیوں آئے ہیں؟ میں نے جواباً کہا کہ ہم ویزہ لے کر آئے ہیں اور ویزے میں آنے کی وجہ لکھی ہوئی ہے۔ اس نے تمام کاغذات اور پاسپورٹس ہمیں واپس کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو ویزہ سپانسر کرنے والا خود آ کر آپ کی ضمانت دے گا تو پھر میں اندراج کروں گا۔ میں نے انسپکٹر کو اسی لہجے میں جواب دیا کہ اگر آپ کے ملک سے کوئی بھی ہمارے ملک آئے تو ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، آپ کی طرح کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ کچھ دھیمے انداز میں بولا کہ آپ کے ملک سے سمجھوتا ایکسپریس میں آئے 19 افراد غائب ہیں، ہم کیا کریں؟ میں نے

کہا کہ ?Is it fair اور بڑبڑاتا ہوا اس کے آفس سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر ڈرائیور سے کہا کہ واپس ہوٹل چلتے ہیں۔ میں اپنے موبائل سے لالہ جی کا نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنے میں انسپکٹر اپنے آفس سے باہر آیا اور مجھے کہنے لگا کہ اگر میں آپ کو کلیر کر دوں تو کیا کل آپ مجھے اپنے سپانسر کا شناختی کارڈ، راشن کارڈ یا ڈرائیونگ لائسنس کی کاپی لا دیں گے؟ میں نے کہا کہ کل نہیں بلکہ ابھی آپ کو یہ ڈرائیور لا کر دے گا۔ انسپکٹر بولا very fine! Please come in ہم پھر اسکے آفس میں چلے گئے۔ اس نے اندراج کی تمام کاروائی مکمل کر کے کاغذات ہمارے حوالے کیے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کو ایک بار پھر باور کروایا کہ آپ کے جو لوگ ہمارے ملک میں آتے ہیں ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہم عوام ہیں اور دوستی عوامی سطح پر ہی اچھی ہوتی ہے۔ حکمران آتے جاتے رہتے ہیں لیکن عوام اپنی جگہ قائم و دائم رہتے ہیں۔ وہ بولا یقین جانیں میں نے بھی آپ کی بہت عزت کی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ مجھے آپ کی عنائیت ہمیشہ یاد رہے گی، آپ بھی کبھی آئیں پاکستان۔ وہ مسکراتا ہوا مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ہم باہر آکر کار میں بیٹھ گئے اور سکھ کا سانس لیا۔

واپسی پر قرول باغ والے ہوٹل سے اپنا سامان لیا تو سردار جی پریشان ہو کر بولے کیوں جی! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی۔ میں نے سردار جی کو سمجھایا کہ آپ بھی بہت اچھے ہیں۔ ہوٹل اور سروس بھی بہت اچھی ہے۔ لیکن ہمیں ویزہ کناٹ پیلس ہوٹل نے سپانسر کیا تھا اس لیے ہمیں وہاں ہی ٹھہرنا چاہیے۔ سردار جی بولے کہ اگر آئندہ آپ نے بھارت آنا ہو تو ہم آپ کو ویزہ سپانسر کر دیں گے۔ ہم نے ان کو دھنواد کہا اور بل ادا کر کے گاڑی میں بیٹھ کر لالہ جی کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ہمارے انتظار میں تھے۔ ہماری رام کہانی سن کر اسی وقت ڈرائیور کے ہاتھ اپنے شناختی کارڈ کی کاپی روانہ کی۔ ہم نے اطمنیان کا سانس لیا اور لنچ کے بعد اپنے کمرے میں آ گئے۔

کچھ دیر آرام کے بعد ہم تیار ہو کر کاؤنٹر پر آئے اور Receptionist کو گاڑی منگوانے کا کہا۔ اُس نے ایک سوزوکی وین (ڈبہ) منگوا دی جس کو ایک خوش مزاج اور تابعدار سکھ نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی ہمیں لے کر جب راشٹر پتی بھون کے سامنے سے گزری تو ڈرائیور نے پوچھا سر جی کیا حکم ہے؟ میں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر چلنے کا کہا۔ 20/25 منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم مزار شریف پہنچ گئے۔ راستے پر ہی بائیں طرف مرزا اسد اللہ خان غالب اور ان کی اہلیہ محترمہ کا مزار تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا

جس میں دو قبریں تھیں اور قبر کے تعویز سے صاحبِ قبر کا پتا چلتا تھا۔ ساتھ ہی غالب اکیڈمی کی عمارت تھی جہاں اُس وقت غالب کی یاد میں کوئی تقریب چل رہی تھی۔ اسی راستے پر چلتے چلتے دائیں طرف امیر خسرو کا مزار تھا اور سامنے کی طرف حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار تھا۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ لوگ قالین پر بیٹھے محوِ گفتگو تھے۔ انھوں نے ہم سے سلام دعا کی اور ایک رجسٹر ہماری طرف بڑھایا کہ اس میں اپنا نام اور پتا درج کر دیں۔ پھر فرمانے لگے کہ اگر آپ نے مزار شریف کو نذر نیاز یا چندہ وغیرہ دینا ہے تو پیٹی میں نہ ڈالیں بلکہ ہمیں عنایت فرما دیں کیونکہ پیٹی میں سے محکمہ اوقاف والے لے جاتے ہیں۔ ہم مزار کے خلیفہ اور اولادِ حضرت نظام الدین اولیاء ہیں اس لیے ہمیں دیں۔ ہم دونوں نے فاتحہ شریف پڑھی۔ اُن دنوں میری اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں۔ میں نے اُن خلیفہ صاحب سے درخواست کی کہ میری اہلیہ محترمہ کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔ وہ مجھے مزار کے قریب لے گئے۔ اپنے اور میرے سر پر مزار کی چادر دے کر ایک لمبی چوڑی دعا کی۔ بار بار مزار اور میری طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے صاحبِ مزار کو مخاطب کرتے اور دعا فرماتے رہے۔ انھوں نے میری اہلیہ محترمہ کو کھلانے کے لیے کچھ مکھانے بھی دیے۔ اس کے بعد ہم واپس ہوٹل آ گئے۔

ہم روزانہ ہوٹل کے توسط سے اسی سوزوکی وین کو مع ڈرائیور بلواتے اور دہلی کی خاک چھانتے۔ اپنے 17 دن کے قیام کے دوران ہم نے دہلی کی اکثر تاریخی عمارات دیکھ لیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مزار شریف حضرت نظام الدین اولیاء

۲۔ مزار شریف حضرت نصیر الدین چراغ

۳۔ مزار شریف امیر خسرو (مرکزی دروازے پر ان کا نام کچھ اس طرح درج ہے: ملک الشعرا طوطی ہند ابو الحسن امیر خسرو۔۔۔ جبکہ ان کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین خسرو ہے)

۴۔ مزار شریف حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ

۵۔ مقبرہ ہمایوں

۶۔ مقبرہ عبدالرحیم خانِ خاناں

۷۔ مقبرہ کوکلتاش

۸۔ مقبرہ سلطان شمس الدین التمش

۹۔ مقبرہ سلطان علاؤ الدین خلجی

۱۰۔ مقبرہ سلطان غیاث الدین تغلق

۱۱۔ مقبرہ سلطان سکندر لودھی

۱۲۔ مقبرہ سلطان بہلول لودھی

۱۳۔ مقبرہ ادم خان

۱۴۔ جامع مسجد دہلی یا جامع مسجد شاہ جہانی

قارئینِ کرام اگر آپ کوان تاریخی عمارات کے بارے میں زیادہ تفصیل جاننے کا شوق ہوتو جناب سرسید کی شہرہ آفاق تصنیف آثارِالصنادید کا مطالعہ فرمائیں۔

ایک روز ہم نمازِ ظہر ادا کرنے دہلی کے وسط میں واقع جامع مسجد دہلی جا پہنچے۔ جناب امام عبداللہ بخاری کی امامت میں نماز ادا کی۔ مسجد کا بغور جائزہ لینے سے پتہ چلا کہ مسجد بے حد خوشنما ہے۔اپنی تعمیر کے وقت یہ دنیا کی خوبصورت مساجد میں سے ایک تھی۔ سرسید کی تصنیف آثارِالصنادید کے مطابق یہ مسجد 1650ء میں تعمیر کی گئی۔اس کے نگران دیوان سعد اللہ خان اور فاضل خان خانساماں تھے۔ یہ خوبصورت مسجد 6 سال میں تعمیر ہوئی اوراس پر کثیر سرمایہ خرچ ہوا۔اس مسجد کے گیارہ در ہیں۔ درمیان والے در میں کالے پتھر کی پچی کاری کے ذریعے ''یاہادی'' لکھا ہوا ہے۔دیگر دروں پر مسجد کی تاریخ تعمیر لکھی گئی ہے اور قرآن پاک کی آیات کالے پتھر کی پچی کاری سے لکھی گئی ہیں۔ان دروں کے دونوں طرف نہایت خوشنما مینار ہیں۔ دونوں کونوں پر لال پتھر کے زینے بنے ہوئے ہیں۔مسجد کے اندر سات محرابیں ہیں۔ مسجد نہایت سادہ اور بے حد دیدہ زیب ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے تین طرف سے زینوں کا سلسلہ ہے۔مسجد کے گنبد سنگِ مرمر کے ہیں اوران پر کالے پتھر سے دھاریاں نکالی گئی ہیں۔ میناروں کی برجیاں سنگِ مرمر کی ہیں۔شمال، جنوب اور مغرب کی طرف ایک ایک دروازہ ہے۔ان دروازوں سے ملحق دالان بھی ہیں جہاں حجرے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد میں ایک مقام درگاہ آثار شریف کے نام سے ہے جہاں حضور پاک ﷺ کے کچھ تبرکات رکھے گئے ہیں۔مسجد کا تمام فرش سنگِ مرمر کا ہے جس پر کالے پتھر کی پچی کاری سے مصلے بنے ہوئے ہیں۔صحن کے درمیان میں ایک خوبصورت حوض ہے جس میں فوارہ ہے اور نمازی

حضرات یہاں وضو کرتے ہیں۔۔اسی جگہ سے میرے دوست میاں ظہیر احمد صاحب کی جوتی دورانِ وضو اُن کی پشت سے کوئی ضرورت مند اٹھا کر لے گیا۔

صحن میں بڑے دروازے کے سامنے چند زینوں کی ایک عمارت جسے مکبّر کہتے ہیں۔ یہ ایک اونچی جگہ ہے جہاں سے مؤذّن امام کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں تکبیروں کو دہراتا ہے۔حوض کے شمالی طرف ایک کٹہرا بنا ہوا ہے جسے قدمِ رسولؐ کہتے ہیں۔ایک روایت کے مطابق محمد تحسین خان نگرانِ مسجد نے ایک رات خواب میں حضور پاک ﷺ کو وہاں بیٹھے دیکھا تھا۔مسجد کے دالان کے سامنے دھوپ گھڑی نماز کا وقت معلوم کرنے کے لیے لگی ہوئی ہے جو اب تک درست رہنمائی کر رہی ہے۔

میں اپنے پڑھنے والوں کی توجہ ایک سازش اور تاریخی غلطی کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ چند سطریں اوپر میں نے فاضل خان خانساماں کے نام کے نیچے ایک خط کشید کر دیا تھا۔اب اس کی وجہ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کی مکاری کا یہ عالم تھا کہ جس قوم یا شخص نے ان کے خلاف جنگ کی، آزادی مانگی، بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے خلاف کسی بھی جنگ میں حصہ لیا، کسی جنگ میں در پردہ ان کی مخالفت اور ان کے دشمن کی مدد کی، انگریزوں نے نہ صرف اس سے انتقام لیا بلکہ اپنے منفی پروپیگنڈا کے ذریعے ان کو ہر لحاظ سے تباہ کر دیا۔مثلاً خلافتِ عثمانیہ کے دور میں بادشاہِ وقت خلیفہ کا لقب اختیار کرتا تھا۔انگریزوں نے عثمانی خلیفاؤں کو بےتوقیر کرنے کے لیے نائیوں کو خلیفہ کہنا شروع کر دیا جو آج تک رائج ہے۔اسی طرح ٹیپو سلطان کے نامور جنرل بیرا خان جس نے کئی بار انگریزوں کے دانت کھٹے کیے اور ان کو شکست سے دوچار کیا، انگریزوں نے اپنے کچن کے ملازموں کو بیرا کہنا شروع کر دیا تاکہ ایک نامور جنرل کا مذاق اڑایا جا سکے۔مزید یہ کہ ٹیپو سلطان کے نامور جنرل وزیر جنگ خان سامہ کے نام کو ان کی شہادت کے بعد اپنے باورچیوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی آج تک اسی طرح جاری و ساری ہے۔

۱۸۸۱ء میں Sir Denzil Abbetson نے اپنے آقاؤں کی اس کمینگی کو ثابت کرنے کے لیے اپنی کتاب Punjab Castes میں خان سامے ماچھی وغیرہ کو شیڈول کاسٹ نمبر ۳۸ میں شامل کیا تاکہ اپنے دشمن کا مذاق اڑا سکے جو آج تک اڑایا جا رہا ہے۔دشمن کی مکاری دیکھیں کہ ہم خود آج تک اپنے اسلاف کا مذاق اڑا رہے ہیں اور نہ جانے قیامت تک اڑاتے رہیں گے مگر میں نہایت احترام سے آپ

سب پڑھنے والوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک انسان کو اپنی کم علمی یا غلطی کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ معافی کا حقدار ہے لیکن جب اس کے علم میں ہر بات آ جائے تو پھر غلطی اور معافی کی گنجائش نہیں۔

بادشاہی مسجد کے مرکزی دروازے سے جب مسجد میں داخل ہوں تو بائیں طرف مسجد کا آفس ہے۔ جس کے ایک کمرے پر امام عبداللہ بخاری کا بورڈ آویزاں تھا۔ جب میاں صاحب اپنی گمشدہ جوتی ڈھونڈ رہے تھے میں اُس کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازے کے باہر ایک آدمی ہاتھ میں پرانا سا پستول لیے کھڑا تھا۔ ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا جس سے ظاہر تھا کہ وہ ہندو ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ وہ یہاں کیوں کھڑا ہے؟ میں نے اسی سے پوچھا کہ امام صاحب کہاں ہیں۔ وہ بولا کیوں تمہیں ان سے کیا کام ہے؟ میں نے اسی کے لہجے میں جواب دیا کہ میری اہلیہ محترمہ بیمار ہیں، میں نے اُن سے دعا کروانی ہے۔ وہ بولا مجھے نہیں معلوم۔ میں آفس میں داخل ہو گیا لیکن وہاں سے بھی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ ایک پراسراری خاموشی اور بد اعتمادی کی فضا تھی۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی Defensive ہو جاتا ہے۔ میں خاموشی سے واپس آ گیا۔

مقبرہ ہمایوں:

سر سید احمد خان کی تصنیف آثار الصنادید کے مطابق کبھی یہ عمارت سرسبز و شاداب تھی۔ چاروں اطراف نہریں اور جا بجا حوض بنے ہوئے تھے جن سے فوارے پھوٹتے تھے۔ جگہ جگہ انواع اقسام کے پھول اپنی بہاریں دکھاتے تھے۔ اس عمارت کو سنگِ مرمر اور سرخ رنگ سے بنایا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تاج محل کا ڈیزائن اسی مقبرے سے لیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تاج محل میں سرخ رنگ استعمال نہیں کیا گیا صرف سنگِ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ تاج محل کے چاروں کونوں پر مینار ہیں جبکہ اس مقبرے کے مینار نہیں ہیں۔ مقبرے میں بڑے بڑے چبوترے بنے ہوئے ہیں جن کے نیچے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں طلباء رہائش پذیر ہوتے تھے اور قرآن پاک حفظ کیا کرتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ ایک اداسی تھی جو ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جگہ خاندانِ تیموریہ کا قبرستان ہے۔ اورنگ زیب کے بعد جو بھی مغل شہزادہ فوت ہوا وہ اسی مقبرے میں دفن ہوا۔ اس مقبرے کے ہر در میں ایک ایک شہزادہ دفن ہے۔ عبدالرحیم خانِ خاناں بھی یہیں دفن ہیں۔

ہمایوں کے مقبرے کو دیکھنے میں اکیلا آیا تھا کیونکہ میاں صاحب کا موڈ سونے کا تھا جبکہ میرے خیال میں اگر سونا ہی تھا تو پھر ہندوستان آنے کی کیا ضرورت تھی۔ 4/5 گھنٹوں میں مقبرے کا کونہ کونہ دیکھ ڈالا۔ آخر تھک ہار کر واپسی کی راہ لی۔ سیڑھیاں اُتر کر گیٹ کے پاس پہنچا جہاں میری گاڑی اور سکھ ڈرائیور موجود تھے۔ ابھی میں گیٹ سے باہر نہیں نکلا تھا کہ مجھے رونے کی دھیمی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو ایک خاتون کالے ریشمی برقعے میں لپٹی، پلاٹ میں بیٹھی آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ میں نے اشارے سے سردار جی اور مقبرے کے نگران سے اس عورت کے رونے کی وجہ پوچھی مگر دونوں کو معلوم نہ تھا۔ میں گیٹ سے نکلنے لگا ہی تھا کہ اچانک خیال آیا کہ برقعے میں ملبوس یہ خاتون مسلمان ہے۔ میں پلٹا اور خاتون کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی لال آنکھیں گھمائیں اور غصے سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پوچھا آپ کیوں رو رہی ہیں اور میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ اُس نے جلدی جلدی برقعے سے آنکھیں صاف کیں اور مجھے غصے سے لرزتی آواز میں کہا کہ ''ارے میاں! جاؤ اپنی راہ لو، تمھیں ہمارے رونے دھونے سے کیا غرض۔۔'' کیونکہ میں ہمت کر کے خاتون سے ہمکلام ہو چکا تھا اور سردار جی اور نگران بھی میری طرف متوجہ تھے، اسطرح میں بھاگنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے مزید پر اعتماد لہجے میں کہا، ''دیکھیں! میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں یہاں اجنبی ہوں۔ مجھے آپ کے برقعے سے آپ کے مسلمان ہونے کا اور آپ کے رونے سے غم زدہ ہونے کا پتہ لگا ہے۔ اسلئے آپ سے پوچھنے کی جسارت کر بیٹھا۔ لیکن آپ کے غصے کا شکار ہو کر آپ سے بھی زیادہ غم زدہ ہو گیا ہوں۔ اگر آپ نہیں پسند کرتی تو نہ بتائیں۔'' وہ بولی میری شادی چند سال پہلے ہوئی۔ لیکن اولاد نہ ہونے کی وجہ سے میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی۔ بس ایسے ہی دل بھر آیا اور میں اس اداس سی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔'' میں نے کہا کہ آج کل حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے ہیں جس سے نہ پوچھو وہ ہی سکھی نظر آتا ہے۔ کسی سے ہمدردی کا اظہار کر بیٹھو تو اس سے زیادہ کوئی مظلوم نہیں۔ اُس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں میری طرف دیکھا تو میں بولا کہ اب آپ مجھے ہی دیکھ لیں۔ میں آپ کو چاق و چوبند اور خوش و خرم نظر آ رہا ہوں مگر میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ چکی، دل بہت غمزدہ ہے اور میں یہاں گھر سے دور ہندوستان کی خاک چھان رہا ہوں۔ میری بیوی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اُس نے بہت حیرانی اور ہمدردانہ نگاہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں دس بچوں کا باپ ہوں۔ میں نے اپنی زوجہ محترمہ سے کہا

کہ اگر دو بچے اور پیدا کرلیں تو درجن ہو جائیں گے۔ اُس خاتون نے پریشانی سے ایک لمبی جی کہہ کر مجھے دیکھا اور کچھ سوچ کر بولی آپ کی بیوی نے صحیح کیا ہے۔ آپ کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہیے تھی اور ساتھ ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے اپنی پشت پر سردار جی اور مقبرے کے نگران کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ روتی خاتون ہنس رہی تھی اور ماحول خوشگوار ہو چکا تھا۔ میں نے سردار جی سے کہا آؤ چلیں اور واپس ہوٹل آ گیا۔

دوسرے روز میں اور میاں صاحب چاندنی چوک کی چکا چوند دیکھتے دیکھتے دہلی کے مشہور و معروف الکریم ہوٹل پہنچ گئے۔ الکریم ہوٹل مسلم کھانوں کے لیے مشہور ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ چاندنی چوک گئے اور کریم خان کا کھانا نہیں کھایا تو بڑا موقع ضائع کیا۔ ہم نے وہاں سے کئی بار کھانا کھایا۔ بس واجبی سا تھا۔ ہمیں کوئی خاص معیار نظر نہیں آیا۔ یا تعریف کرنے والوں کا معیار کم ہے یا ہمارا معیار زیادہ اچھا ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ دریا گنج پر اتوار کو پرانی کتابوں کا میلہ بھی دیکھا جو دریا گنج روڈ کے دونوں فٹ پاتھوں پر سجایا گیا تھا۔ چاندنی چوک میں زیادہ تر دکانیں مسلمانوں کی ہیں اور دکانوں کے بورڈ اور نیون سائن اُردو میں تھے۔ دہلی کی میٹرو ٹرین سروس قابلِ تعریف ہے۔ میرے تجربے کے مطابق دنیا کی سستی ترین میٹرو ٹرین سروس دہلی کی ہی ہے اور معیار بھی بہت اچھا ہے۔ دھول، دھواں اور شور دہلی کی سڑکوں کا خاصا ہے۔ سائیکل رکشہ والے، ریڑھی بان، راج مزدور، نائی، موچی، دھوبی اکثر مسلمان ہیں۔ تمام مزدور پیشہ لوگوں کے نام کے ساتھ خان لگا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا پول کھُل جاتا ہے۔

میں نے اپنے قرول باغ میں قیام کے دوران ہی AirTel کی sim خرید لی تھی اور اپنا موبائل فون آپریشنل کرلیا تھا۔ اگر میں پاکستان فون کرتا تو ہر منٹ کے بعد آواز آنی بند ہو جاتی لیکن کریڈٹ چارج ہوتا رہتا۔ آخر تنگ آ کر میں نے ایک شام کسی PCO سے گھر فون کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ سڑکوں پر گھومتا رہا۔ کناٹ پیلس کافی بارونق اور پوش علاقہ ہے۔ رات کے وقت اس کی روشنیاں بہت جاذبِ نظر معلوم ہوتی تھیں۔ ایک PCO سے اپنے گھر بات کی۔ سب کی خیریت معلوم کر کے تسلی ہو گئی اور مزاج کی شوخی واپس آ گئی۔ اس سے پہلے فکرمندی کی کیفیت تھی۔ اب بھوک بھی ستانے لگی۔ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ ایک بڑے ہوٹل پر نظر پڑی۔ دل میں سوچا کہ کھانا کھا لیا جائے اس لئے اندر چلا گیا۔ یہ ایک

خوبصورت سجا ہوا ہال تھا۔ ہندو ناریاں خوبصورت ساڑھیاں لگائے تمام انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھیں۔ایک نازک اندام نے کاروباری مسکراہٹ اچھالتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے ایک میز کی طرف میری رہنمائی کی۔ میری کرسی کو پیچھے دھکیل کر کرسی پر براجمان ہونے میں میری مدد کی۔ میں نے ہال میں چاروں طرف ایک طائرانہ نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ اکثر میزوں پر Booked کے بورڈ آویزاں تھے۔

لوگ آ رہے تھے اور اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ رہے تھے۔ایک طرف آرکسٹرا اپنی جولانیاں دکھانے کے لیے بیقرار تھا مگر ابھی وہ دھیمے سُر بکھیر رہا تھا۔ابھی میں پورا جائزہ بھی نہ لینے پایا تھا کہ ایک ناری ادائیں بکھیرتی میرے پاس آئی اور ڈرنکس کا مینو میری میز پر رکھتے ہوئے بولی کہ سر آپ ڈرنک لینا پسند فرمائیں گے؟ میں نے مینو پر ایک نظر ڈالی تو تمام Hard drinks تھے۔ بے خودی میں میری زبان نے اورنج ڈرنک کہہ دیا۔ دراصل میں اس لڑکی کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو عنایت فرمایا تھا اس نے ربِ کریم کی عطا کو نہایت دریا دلی سے نمائش کے لیے پیش کیا ہوا تھا۔ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک خوبصورت خاتون تھی اس پر قیامت اس لیے ڈھا رہی تھی کہ نیم برہنہ بھی تھی۔ میرے اورنج ڈرنک کہنے پر اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی ''کہاں سے آئے ہیں؟'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا ''لاہور سے''۔ وہ ترنت بولی Wel come اور فضا کو معطر کرتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اورنج ڈرنک میری میز پر پہنچ گیا۔ گہما گہمی بڑھتی چلی گئی۔ ہال میں اب شاید ہی کوئی میز خالی ہو۔ پورے ہال میں نہ جانے کون کون سے برانڈ کی شراب پی جا رہی تھی جس کی ناگوار بدبو پھیل چکی تھی۔

اب آہستہ آہستہ مدہوشی اور بے خودی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ جوڑے ڈانسنگ فلور کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ کچھ جوڑے تو اپنی سیٹوں سے اٹھتے ہی ڈانس شروع کر دیتے اور ناچتے ناچتے ہی ڈانسنگ فلور کی طرف چلتے جاتے۔صرف ہوٹل کی انتظامیہ نے ہی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں،خواتین مہمانوں کی اکثریت ٹائٹ جینز اور ڈھیلے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ چند ایک نے جینز کے ساتھ کرتیاں بھی پہنی تھیں اور ان کرتیوں پر جسمانی موقع محل کے حساب سے پھولوں کی کڑھائی بھی خوبصورت انداز سے کی گئی تھی۔

کچھ نوجوان لڑکیاں تو ملنگ بے سروپا تھیں کیونکہ انھوں نے جینز کے اوپر صرف بَرا ہی پہنا ہوا تھا اور اس پر کڑھائی اور سلمیٰ ستارے کا کام ایک عجب ہی بہار دکھا رہا تھا۔ بس غریب الوطن لٹتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اب شور شرابہ اور ڈانس اپنے عروج پر تھا۔ میں مگن ہو کر نظری انجوائے منٹ کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک سایہ بہت قریب سے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا ہے کیونکہ ڈانس کے دوران مین لائٹس بند کر دی گئی تھیں۔ میں نے حیرانی سے دیکھا تو ایک نوجوان خاتون بہت شستہ انگریزی میں سامنے والی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ میں نے ویلکم کہتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کی اجازت دی۔ اتنے میں ڈانس کا دور ختم ہو چکا تھا اور ہال کی لائٹس جل گئی تھیں۔

میں نے سب سے پہلے ہم نشین کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ سادہ لباس میں ملبوس ایک جاذبِ نظر خاتون تھی۔ مسکرا کر بولی کہ اندھیرا تھا، خالی سیٹ نظر پڑی تو آپ کی اجازت سے بیٹھ گئی۔ آپ ڈسٹرب نہ ہوں جیسے ہی کوئی سیٹ خالی ہوئی میں چلی جاؤں گی۔ میں نے اخلاقاً کہا زہے نصیب آپ کیوں چلی جائیں گی؟ یہ آپ کی ہی ٹیبل ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی نہ پائی تھی کہ ہوٹل انتظامیہ والی خاتون آئی اور اس خاتون سے آرڈر لینے لگی۔ اس نے صرف مینگو جوس کا آرڈر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ خاتون کا لہجہ بہت تحکمانہ ہے جبکہ آرڈر لینے والی خاتون کی آواز میں پہلے جیسی شوخی نہیں تھی اور وہ مودب بھی ضرورت سے زیادہ تھی۔ میں نے آرڈر لینے والی خاتون سے بوفے ڈنر کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ 15/20 منٹ بعد ڈائننگ ہال میں جا سکتے ہیں اور چلی گئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ تو شوخ و شریر لب و لہجے والی تھی اسے کیا ہو گیا۔

اب میں نے ہال میں نظریں دوڑانا بند کر دیا اور اپنی ٹیبل پر بیٹھی خاتون پر توجہ دینی شروع کر دی۔ سکوت توڑتے ہوئے میں نے اس خاتون سے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں سات روز پہلے لاہور سے بطور visitor یہاں آیا ہوں اور اپنے ایک ساتھی سمیت کناٹ پیلس ہوٹل میں قیام پذیر ہوں۔ کھانا کھانے آیا تھا۔ ہوٹل کی رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا کہ آپ نے آ کر چونکا دیا۔ اب اپنے بارے میں کچھ فرمائیں۔ وہ کھردرے لہجے میں بولی کہ میرا نام کے این کوہلی ہے، ایم اے انٹرنیشنل افیئرز ہوں اور ایک مقامی کالج میں لیکچرر ہوں۔ اتنے میں ڈنر کی اناؤنسمنٹ ہوئی اور ہم اکٹھے ہی ڈائننگ ہال کی طرف چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ جیسے یہ نازل ہوئی تھی اسی طرح چلی جائے گی مگر وہ تو چپک کر رہ گئی اور کہتی رہی یہ ڈش بہت مزیدار ہے، یہ تو کمال کا ہے، یہ ذائقہ تو آپ نے چکھا ہی نہیں وغیرہ۔ میں اخلاقاً ہاں ہوں کرتا رہا۔ ڈنر ختم ہو گیا اور ہم اپنی ٹیبل پر واپس آ گئے۔ لوگ ناچتے تھرکتے رہے کیونکہ صبح چھٹی تھی اس لئے رات اپنے

پورے جوبن پر تھی۔ حوا کی بیٹیاں اتنی بے چین، بے پروا اور دیوانہ وار ناچ رہی تھیں جیسے یہ ان کی آخری رات ہو اور جس کی صبح کبھی نہ ہونا قرار پائی ہو۔ میں نے بل لانے کا اشارہ کیا تو کے این کو بلی بولی کہ آپ کیوں تکلف کرتے ہیں۔ میں آپ کا بل بھی بھر دوں گی۔ میں نے خشک لہجے میں جواب دیا کہ نہیں بہت دھنواد۔ میں اپنا بل خود pay کروں گا۔ میں اچھی طرح اس خاتون کی اصلیت جان چکا تھا۔ میں بل pay کر کے ہوٹل سے باہر آیا اور جو پہلی ٹیکسی ملی اس پر اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔

دہلی قیام کے دوران میں جتنی آوارہ گردی کر سکتا تھا وہ میں نے کی۔ پوش مارکیٹیں، سبزی گوشت کی دکانیں، کپڑا مارکیٹیں، کتابوں کی دکانیں، دنیا کی قدیم ترین بزنس کی دکانیں، مارکیٹیں اور دکاندار، فٹ پاتھوں پر رہائش پذیر لوگ اور وہیں بچوں کو جنم دیتی خواتین، کسٹمرز کو اشارے کرتی خواتین، بادشاہی مسجد کے قریب منڈلاتے جیب تراش جو اپنے فن میں یکتا تھے، کریم خان کے ہوٹل میں گائے کے قورمے کے مزے اڑاتے لالے اور گائے کے ذبیحہ پر خون خرابہ کرتے ہوئے لالے، دریا میں بہتی آدھ جلی ان گنت لاشیں جنہیں کتے، چیلیں اور گدھ نوچ رہے تھے۔ یہ تھی دنیا کی سب سے بڑی اور جھوٹی جمہوریت جہاں مسلمانوں کی اکثریت دگرگوں حالات میں اچھوتوں جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جبکہ پوری دنیا میں بھارت اسلحے کا سب سے بڑا خریدار بنا ہوا ہے۔ دیکھنے کے لیے دہلی میں اس جیسا اور بھی بہت کچھ ہے۔

ابھی دہلی میں ہمارے قیام کے مزید 13 دن باقی تھے کہ کراچی سے بھائی فاروق احمد شیخ کا بلاوہ آ گیا۔ انھیں میرا پاسپورٹ چاہیے تھا تا کہ عمرہ ویزا لگ سکے۔ میں نے اور میری زوجہ محترمہ نے ان کے ساتھ عمرے پر جانا تھا۔ دوسرے روز میں اور میاں صاحب ہوشیار پور کا ویزا لینے انڈین فارن آفس کے ویزا سیکشن میں گئے جو کسی مہاراجہ کے بنگلے میں قائم تھا۔ ویزا سیکشن ایک ہال میں تھا جہاں بہت سارے لوگ اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے کاؤنٹر کے پیچھے چند آفیسرز اپنے اپنے کام میں مصروف تھے جن میں ایک سردار جی بھی تھے۔ کئی بار مخاطب کرنے پر بھی وہ متوجہ نہ ہوئے۔ میں نے کبھی کسی کے چہرے پر اتنی فرعونیت نہیں دیکھی جتنی اُن لوگوں کے چہروں پر تھی۔ چند منٹوں میں ہی میرا صبر جواب دے گیا۔ میں میاں صاحب کو باہر لے آیا اور کہا کہ لعنت بھیجو ان لوگوں پر، پھر کبھی چلے جائیں گے جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا۔ اپنی واپسی کی بکنگ کرواتے ہیں۔

ہم بس ٹرمینل پر گئے اور واپسی کی بکنگ کے لیے کہا۔ بکنگ کلرک کہنے لگا کہ آئندہ ڈھائی ماہ تک کوئی

سیٹ دستیاب نہیں ہے۔ ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ فوراً ہوٹل واپس آئے اور لالہ جی سے مدد کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنی کار اور اپنا منیجر ہمارے حوالے کیا جو ہمیں ایک سردار جی کے بنگلے پر لے گیا۔ وہ سابقہ MNA تھے۔ انھوں نے چائے اور برفی سے ہماری تواضع کی اور فرمانے لگے میں آپ کو دہلی کے ٹرانسپورٹ منسٹر کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ بس میں ان کا دو سیٹوں کا کوٹہ ہوتا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کو ضرور دو سیٹیں مل جائیں گی۔ انھوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر سفارشی لیٹر ٹائپ کروا دیا اور ہم بھاگم بھاگ منسٹر صاحب کے بنگلے پر جا پہنچے جو گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جانے ہی والے تھے۔ ان کے سامنے کچھ لوگ ہاتھوں میں درخواستیں لیے کھڑے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر منسٹر صاحب کا لیٹر ان کے سامنے کر دیا اور زبانی بھی مدعا بیان کر دیا۔ انھوں نے اپنے PA سے کہا کہ صبح کی تاریخ کی دو سیٹیں ہمیں دے دی جائیں۔ PA صاحب نے جھٹ پٹ لیٹر ٹائپ کر دیا اور منسٹر صاحب نے کھڑے کھڑے دستخط بھی فرما دیے۔ ہم شکریہ ادا کر کے واپس بس ٹرمینل پر آ گئے اور اپنی بکنگ کنفرم کروائی۔ پھر ہم پاکستان رپورٹنگ سنٹر جا پہنچے۔ اسی انسپکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے اسے اپنی بکنگ دکھائی۔ اس نے ہماری واپسی کا اندراج کیا اور ہمارے پاسپورٹس مع دیگر کاغذات ہمیں واپس کیے۔ صبح تین بجے وہی سکھ ڈرائیور آیا اور اس نے ہمیں دہلی بس ٹرمینل پر پہنچا دیا۔ تمام رسمی کارروائی کے بعد بس صبح آٹھ بجے لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ بس ٹرمینل میں وہی پراسراریت تھی۔ خاموش ڈرے ڈرے چہرے، حد سے زیادہ محتاط۔ کوئی واش روم بھی جاتا تو کئی آنکھیں اس کی راہ میں بچھی رہتی تھیں جب تک کہ وہ واپس آ کر اپنی کرسی پر نہ بیٹھ جاتا تھا۔

ابھی بس امرتسر بھی نہ پہنچی تھی کہ پولیس کو وائرلیس پر اطلاع ملی کہ سکھوں کے دو گروپ جن میں سے ایک کا نام سچا سودا تھا، آپس میں لڑ پڑے ہیں اور بے دریغ فائرنگ ہو رہی ہے۔ پولیس نے کئی راستوں اور شہروں کو By-pass کر کے ہمیں نکودر کے راستے واہگہ پہنچا دیا۔ جہاں امیگریشن اور کسٹم کے بعد ہم اپنی پاک سرزمین میں داخل ہو گئے۔ اب ہمارے فون صحیح کام کر رہے تھے۔ شام کو مغرب کے وقت ہم لاہور لبرٹی میں بس ٹرمینل پر اتر گئے۔ وہاں جن پولیس والوں کی ڈیوٹی تھی وہ بھی نہایت بدتمیز ثابت ہوئے۔ وہ ہر مسافر سے اس طرح بات کر رہے تھے جیسے وہ ان کے ذاتی ملازم ہوں۔

چوتھا باب

قبر سے فریاد

(ایک بدنصیب خاتون کی داستاں)

امجد میرا ہم سکول اور دوست تھا۔ میں اکثر سکول جاتے ہوئے اس کے گھر کی کُنڈی ہلا کر شور پیدا کرتا اور اس کو باہر بلا کر اپنے ساتھ سکول لے جاتا۔ سکول سے واپسی بھی اکثر اکٹھے ہی ہوتی۔ وہ اپنے گھر چلا جاتا اور میں اپنی راہ لیتا۔ یہ روزمرہ کا معمول تھا۔ ایک روز ایس ایم شمیم شاہانی نے جو ہمارے ہم سکول اور امجد کے محلے دار بھی تھے بہت رازدارانہ انداز میں مجھے نصیحت کر کے سمجھانے کی کوشش کی کہ جو عورت اس گھر میں رہتی ہے اس کا نام خالدہ ہے۔ وہ بچے اغوا کر کے فروخت کرتی ہے۔ پورا محلّہ اس سے خوف کھاتا ہے۔ روزانہ اس کے ہاتھ کسی نہ کسی کے گریبان پر ہوتے تھے۔ نیز بدقماش عورتوں کا بھی اس کے پاس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ شراب بھی فروخت کرتی ہے۔ اخلاقی طور پر کمزور کردار پولیس والے بھی اپنی تمام ضروریات یہیں سے پوری کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کے خلاف رپورٹ درج کروانے کی کوشش کرے تو اُس کی درگت بھی بنا دیتے ہیں۔ یعنی تمام الزامات درخواست دہندہ پر لگا کر اُسی کو حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔ آخر کار بات سودے بازی پر ہی جا کر ختم ہوتی ہے۔

شاہانی صاحب نے مزید انکشاف کیا کہ ابھی چند روز پہلے ہی کی بات ہے ہماری یونین کمیٹی کے چیئر مین (اُن دنوں فیلڈ مارشل ایوب خان کی بنیادی جمہوریت کا زمانہ تھا۔ حکومت، عوام کے منتخب شدہ ممبران اور ممبران کے منتخب کردہ چیئر مین کی وساطت سے چلتی تھی) کسی ذاتی وجہ یا رنگین دلچسپی کی وجہ سے خالدہ سے الجھ پڑے۔ خالدہ نے اُن کو پولیس کے انداز میں نہایت گندی گالیاں بکیں اور ان کا گریبان پکڑ کر دن اور رات کی تمام رنگین داستان پورے محلے اور شاہراہِ عام سے گزرنے والے ہر عام و خاص کے سامنے من و عن بیان کر دی۔ چیئر مین صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی اور شرمندہ شرمندہ وہاں سے چلے گئے۔

اُس وقت تو مجھے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی اور میں ہوں ہاں کرتا امجد کو لے کر وہاں سے سکول کی جانب چلا گیا۔ لیکن مجھے اس عورت کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ میں نے اس کا ذکر اپنے دوست امجد سے بھی

کیا مگر وہ بھی ہوں ہاں کر کے چپ ہو گیا۔ ایک روز میں اور امجد اکٹھے سکول سے واپس آئے تو امجد کے گھر کے باہر ایک عورت جس نے پولیس کے یونیفارم سے ملتا جلتا یونیفارم پہنا ہوا تھا، کراس بیلٹ اور پسٹل بھی لگایا ہوا تھا اور سر پر پولیس کی ٹوپی بھی لے رکھی تھی بڑے طمطراق سے اپنی پسلیوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اس کے سینے پر یونیفارم کے اوپر ادارہ خدمتِ خلق بھی لکھا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد دو تین نوجوان لڑکے جو شکل سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے اُسی طرح کا یونیفارم پہنے کھڑے تھے اور بات بات پر اس کو بلا وجہ سیلوٹ بھی کرتے تھے۔ چار بچے بھی بہت ڈرے سہمے، رو رو کر آنکھیں سرخ کیے کھڑے تھے۔ اس عورت نے ہاتھ میں ایک رجسٹر پکڑ رکھا تھا جسے وہ بہت انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی امجد نے خاموشی سے گھر کے اندر جانے کے لیے دروازہ کھولا تو اس ڈائین نما عورت نے نہایت خونخوار نظروں سے پہلے دروازے کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ مجھے کچھ کہتی میں تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی راہ ہولیا۔ مگر دل میں خوفزدہ تھا۔ دوسرے روز میں امجد کو لینے اس کے گھر نہ گیا بلکہ سیدھا سکول چلا گیا۔ سکول میں امجد نے مجھے اپنی کمر اور جسم کے دوسرے حصوں پر تشدد کے نشانات دکھائے۔ میں سوچوں میں غرق ہو گیا کہ ایک گھر میں بھائی ظلم کرتا ہے تو دوسرے گھر میں سگی ماں اور سوتیلا باپ، آخر انجام کیا ہوگا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب میں خود گردشِ ایام میں بری طرح پھنسا ہوا تھا جسکی تفصیل میں اپنی تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' میں بیان کر چکا ہوں۔ اس عورت کو دیکھنے کے بعد میں نے امجد کے گھر جانا چھوڑ دیا۔

جب کئی روز تک امجد سکول نہ آیا تو پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا ہے۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ زمانے کی ٹھوکروں نے مجھے شعور عطا کیا۔ میری جسمانی کمزوری بھی صحت مندی میں بدلتی گئی۔ میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ اُن دنوں میں محلّہ چاہ فتح خاں نزد مسجد فقہ جعفریہ المعروف شیعہ والی مسجد کے قریب ایک گھر میں رہائش پذیر تھا۔ بازار جانے کے لیے اکثر اُسی گلی سے گزر ہوتا جہاں امجد کا گھر تھا۔ وہ مجھے اکثر یاد آتا۔ ایک روز گلی میں سے گزر رہا تھا تو ایک لڑکا میری سائیکل سے جان بوجھ کر ٹکرایا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے امجد نظر آیا۔ ہم بہت جوش وخروش سے گلے ملے اور میں اس کو اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تشدد سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ مگر اس نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ کراچی میں محنت مزدوری بھی کی اور میٹرک بھی پاس کیا۔ میں بھی میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ وہ

اب ملازمت کی تلاش میں تھا۔ہم دونوں نے ایک دوسرے کی داستان سنی۔وہ اکثر میرے پاس آجاتا۔

کچھ دن بعد وہ پھر غائب ہو گیا۔ مجھے تجسس ہوا تو اُس کا پتا کرنے میں خود اسکے گھر چلا گیا۔ کیونکہ اب میں ایک مضبوط لڑکا تھا۔ کسی کا ڈر یا خوف نہیں تھا۔ مدِ مقابل کوئی بھی ہو ہر وقت سامنا کرنے کو تیار رہتا تھا۔ دروازہ پیٹنے پر اس کا سوتیلا بھائی باہر آیا۔ میں نے امجد کا پوچھا تو اُس نے گالی دے کر بہت بُرا جواب دیا۔ میں نے اس کو ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور وہاں سے چلتا بنا۔ سب لوگ مجھے جانتے پہچانتے تھے۔ خالدہ کو پتا چل چکا تھا کہ اس کی دہلیز پر اس کے بیٹے کو تھپڑ مارنے والا کون تھا۔ وہ بہت سُبکی محسوس کر رہی تھی۔

دوسرے روز میں اپنی سائیکل پر کالج سے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ شیعہ مسجد کے پاس خالدہ اور اس کا تھپڑ زدہ بیٹا کسی کو میری شکل وشباہت بتا کر میری رہائش گاہ کا پوچھ رہے تھے۔ اتنے میں اس کے بیٹے نے مجھے آتا دیکھ کر اپنی ماں کو بتایا اور دونوں میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کی نیت سمجھ گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ حالات کچھ بھی ہوں، اس بدمعاش عورت سے گالی یا تھپڑ نہیں کھانا۔ کیونکہ خالدہ کی شہرت ایک لڑاکا اور بدمعاش عورت کی تھی۔ گالی گلوچ، مار کٹائی اس کا شیوہ تھا۔ پسٹل دکھا کر بھی ڈراتی دھمکاتی تھی اور دہشت پیدا کرنے کے لیے فائرنگ بھی شروع کر دیتی تھی۔

میں نے جیسے ہی سائیکل کو بریک لگائی اس نے سائیکل پر ہاتھ رکھ دیا۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ میں نے سائیکل زور سے اس پر پھینکی اور اس کے بیٹے کو پوری قوت سے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ سامنے لکڑی کا ٹال تھا جہاں سے میں بھاگ کر ایک کیکر کا بڑا سا لٹھ لے آیا۔ ابھی میں نے لٹھ اس کی طرف سیدھا ہی کیا تھا کہ وہ بولی تمھارا دماغ خراب ہے۔ میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور تم نے مجھے اور میرے بیٹے کو مارنا بھی شروع کر دیا۔ میں غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ میں نے کہا تم نے مجھے روکا کیوں ہے؟

میں نے تماشا دیکھنے والے اہلِ محلّہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ لوگ تم سے ڈرتے ہوں گے۔ میں ہرگز تم سے نہیں ڈرتا۔ تم تو ایک معمولی سی کتیا ہو، میں ایک بڑے افغان ہاؤنڈ سے مقابلہ کرتا رہا ہوں (جاننے کے لیے پڑھیئے ۔۔۔۔۔ ''فرشتے کی ایف آئی آر'' ۔۔۔۔ ساگر پبلی کیشنز لاہور)۔

اس نے میری سائیکل اپنے ہاتھ سے پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے زور سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا کہ وہ تلملا کر رہ گئی۔ میں نے اب سائیکل اس کے بیٹے پر اچھال دی اور دونوں کی کلائیاں پکڑ کر دو چار جھٹکے دیے تو دونوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ لوگوں سے بولی کہ اللہ کے واسطے مجھے اس سے نجات دلاؤ۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب جو بہت نیک اور شریف انسان تھے اور سب انہیں بابا جی کہتے تھے بھاگم بھاگ، ہانپتے کانپتے تشریف لے آئے اور مجھے اس عورت سے علیحدہ کیا۔ ہلکی پھلکی پیار بھری ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ خالدہ سے کہا کہ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ تو جانے کے لیے تیار ہی تھی۔ جاتے جاتے بولی کہ ادریس تم آج اپنا صدقہ دینا۔ میں اپنا پسٹل ساتھ نہیں لائی تھی ورنہ اب تک تم اوپر جا چکے ہوتے۔ میں نے فوراً سائیکل ہاتھ سے چھوڑی اور گلی میں پڑے اینٹ اور پتھر اُن پر برسانے شروع کر دیے۔ وہ ایک چھوٹی گلی میں جا گھسی اور میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

محلے کے سب لوگ اسے جانتے تھے۔ اُس وقت سب تماشا دیکھتے رہے اور کوئی کچھ نہ بولا۔ بعد میں مجھے شاباش اور نہ جانے کیا کیا خطابات دینے لگے۔ سب نے مجھے تلقین کی کہ تم اس واقعہ کو معمولی نہ سمجھنا۔ آج کی بے عزتی کا بدلہ یہ تم سے ضرور لے گی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ یہ ایک لڑکے کے ہاتھوں ایسے ذلیل ہوگی۔ محلے دار، دکاندار، دوست، ہمسائے، واقف کار، مسجد کے امام صاحب سب کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ میں بے حد چوکنا رہوں اور گندی گلی سے بھول کر بھی نہ گزروں۔ پورے بہاولپور میں یہ بات پھیل گئی کہ آج خالدہ سنارن کے ساتھ کیا ہوا۔ جب ہر شخص بار بار ایک ہی بات دہرائے تو نفسیاتی طور پر دماغ کا متاثر ہونا ایک عام سی بات ہے۔ مگر میرے حالاتِ زندگی ایسے تھے کہ مجھ پر کوئی بات بھی اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں نے ایک فیصلہ کر لیا کہ میں اس عورت کے متعلق ضرور تحقیق کروں گا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنے طور پر اس کے متعلق جو معلومات اکٹھی کیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں:

۱۹۴۷ء میں عبدالشکور نامی ایک شخص جو ریاست پٹیالہ کا رہنے والا تھا مع اپنے اہل و عیال کے ریاست بہاول پور ہجرت کر آیا۔ عبدالشکور کا تعلق ارائیں برادری سے تھا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے زرگر تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے تمام اثاثے محفوظ طریقے سے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے اثاثے خالص

سونے کی شکل میں تھے جو بہاول پور کے کسی بڑے سے بڑے زرگر کے اثاثوں سے بھی زیادہ تھے۔ گندی گلی کی نکڑ پر چار دکانیں اور اُن کی پشت پر ایک بڑا سا مکان اس نے الاٹ کروایا۔ مکان میں رہائش پذیر ہو گیا اور چاروں دکانوں کی کی ایک دکان بنا کر اس نے طلائی زیورات بنانے کا کارخانہ کھول لیا۔

اس سے پہلے کہ میں کہانی کو آگے بڑھاؤں قارئین کرام سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ گندی گلی کا ذکر بار بار آتا ہے اور مزید بھی آئے گا۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ گندی گلی سے مراد کوئی بُری یا غلیظ جگہ ہے بلکہ گندی گلی بہاول پور کی سب سے صاف ستھری گلی ہے۔ بس اس کا نام گندی گلی مشہور ہو گیا جو اب تک ہے اور رہے گا۔ دوئم یہ کہ خالدہ کے علاوہ گندی گلی اور ملحقہ محلّہ سادات پورہ میں بہت نیک اور نامور لوگ بھی قیام پذیر تھے اور ہیں۔ جس میں ایک خاندانِ سادات جو ریاست کپور تھلہ سے ہجرت کر کے آیا، جناب سید نظام الدین کا تھا۔ ان کے صاحبزدگان میں سید سعید الدین مرحوم، سپرنٹنڈنٹ انجینئر محکمہ انہار تھے اور سید علاؤ الدین مرحوم ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ ان دونوں حضرات کے سب سے چھوٹے بھائی سید ناصر الدین وفاقی گورنمنٹ کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ صادق پبلک سکول کے پروفیسر جناب قدرت اللہ شہزاد بھی مع اپنے بزرگوں کے اسی محلّہ سادات میں قیام پذیر رہے۔ ایک تاریخی واقعہ بھی بیان کرتا چلوں کہ گورنر جنرل غلام محمد جب سرکاری دورے پر بہاولپور تشریف لائے تو محلّہ سادات میں بہ نفسِ نفیس اپنے استاد محترم سید نظام الدین کی قدم بوسی کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن اسی محلّہ میں خالدہ سنارن بھی رہائش پذیر تھی۔

واپس اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ زیورات کا کارخانہ دن دگنی رات چگنی ترقی کرتا گیا اور ریاست بہاول پور کا سب سے بڑا کارخانہ تصور کیا جانے لگا۔ بہاول پور کے آج کے بڑے بڑے سناروں کے بزرگ بطور کاریگر اسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ یہ کسی زرگر کی دکان نہیں تھی بلکہ زرگری کا ایک بڑا کارخانہ تھا۔ عبدالشکور ایک خوبصورت آدمی تھا۔ لمبا قد، گورا چٹا سرخی مائل رنگ، درمیانی سرخی مائل غلافی آنکھیں جن پر موٹے موٹے ابرو، تلوار مارکہ مونچھیں، سلیقے سے بنے بال اور ایک لٹ ماتھے پر اٹھکیلیاں کرتی نظر آتی تھی۔ ٹھہرا ہوا مزاج، بوسکی کی قمیص، اس پر چر چر کرتے لٹّھے کی شلوار، پاؤں میں پمپ شوز، ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں، گلے میں سونے کی چین، کبھی کبھی بوسکی کے کرتے کے ساتھ ریشمی لاچا بھی

استعمال کرتا تھا۔ زرگری کا کاروبار روز بروز ترقی پذیر تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ پچاس سے اوپر کاریگر کارخانے میں کام کرتے تھے۔ بہاول پور کے نواب خاندان سے لے کر امیر وزیر تک تمام اس کے گاہک تھے۔ عبدالشکور کا گھرانہ اچھا خاصہ خوشحال گھرانہ تھا۔ اس کی اہلیہ اس کی برادری سے تھیں۔ اولاد میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ تینوں بچے زیرِ تعلیم تھے۔

خالدہ کون تھی؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ طوائف تھی۔ لوگوں نے اس کے رویے اور بود و باش کے طور طریقے کی وجہ سے اپنی اپنی رائے قائم کی ہوئی تھی۔ لیکن آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ وہ ایک نہایت ہی نیک اور نجیب الطرفین سید خاندان کی فرد تھی۔ اگر بہاولنگر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ا کی طرف چلیں تو جیسے ہی پلیٹ فارم ختم ہوگا اس سے مزید آگے جا کر بائیں طرف ایک مسجد نظر آتی ہے۔ اس مسجد کے اندر دائیں طرف ایک کمرہ ہے۔ اس میں ایک مزار ہے جہاں لوگ منتیں مانگتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ جمعرات کو بہت رش ہوتا ہے۔ ماہِ رمضان میں عرس بھی ہوتا ہے۔ یہاں ایک سید بزرگ دفن ہیں جو خالدہ کے والد ماجد ہیں۔ ایک مجذوب بھی وہاں مزار پر بیٹھا ہوتا تھا (مجھے اب علم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا وفات پا چکا ہے)۔ وہ خالدہ کا سگا بھائی ہے۔ بہاول پور کا ایک نیک اور سید خاندان خالدہ کا قریبی خونی رشتہ دار ہے۔

یہ نامور خاندان بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکا ہے، معاشرے میں ان کا ایک مقام ہے۔ وہ خالدہ کو Disown کرتے ہیں اور اس کا نام لینا بھی انہیں گوارہ نہیں۔ ایک محتاط تحقیق کے مطابق خالدہ طلاق یافتہ تھی۔ اس کی دوسری شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب سے اس کے دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا جس کا نام امجد تھا اور ایک لڑکی جس کا نام میں احتراماً نہیں لکھوں گا۔ خالدہ کو اپنے والد کی طرف سے بہاول نگر کے سرحدی دیہات میں دو مربعے زرعی زمین بھی ملی تھی جو آخری وقت تک اس کے پاس رہی۔

بقول شاعر:

ہم جسے اپنا چاند کہتے تھے
اُس نے تارے دِکھا دیئے ہم کو

ایک روز خالدہ دیگر خواتین کے ہمراہ بغرض خریداری زیورات عبدالشکور زرگر کے کارخانے میں تشریف لائی۔اس وقت وہ ایک ڈاکٹر کی بیوی تھی۔کروفر اور نمود و نمائش کے ساتھ ساتھ ملکوتی حسن کی مالک بھی تھی۔مگر حسن بے حجاب تھا۔ایسا بے باک حسن ایک زرگر نے کب دیکھا تھا۔کیوپڈ دیوتا کا تیر بیچارے زرگر کے دل و دماغ میں بہت ہی مہلک انداز میں پیوست ہوگیا۔زرگر بیچارے کا سانس نہ اندر نہ باہر۔وہ اس کے ناز انداز اور ہرنی سی قلانچیں بھرتی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔خالدہ نے اپنی کھنکتی آواز میں عبدالشکور کو زیورات دکھانے کا کہا۔مگر وہ ہونقوں کی طرح صرف آنکھیں پتھرا کر اس کو دیکھتا رہا۔کئی بار مخاطب کرنے پر بھی جب زرگر نہ بولا تو اس قاتل حسینہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ لہرائے اور ہاتھ میں پکڑا پرس اس پر پھینک دیا اور بولی ''اوئے ہوش کر! کبھی عورت نہیں دیکھی''۔وہ جی جی کرنے لگا۔خالدہ نے بہت رعب سے کہا میں اگلے جمعے پھر آؤں گی۔تم میرا آرڈر نوٹ کرلو اور مجھے جدید ڈیزائن کا سیٹ بنا دو۔میں دیکھتی ہوں تم مجھے کتنا خوبصورت سیٹ بنا کر دیتے ہو۔جمعے کے روز آنے کا سن کر سامنے بیٹھے ایک کاریگر نے کہا کہ بی بی جی جمعے کو کارخانہ بند ہوتا ہے۔عبدالشکور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی جوتی اچھال کر کاریگر کو دے ماری اور خالدہ سے بولا کہ سرکار! یہ بکواس کر رہا ہے۔آپ کی خاطر جمعے کے روز بھی کارخانہ کھلا رہے گا۔آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔سیٹ تیار ہوگا۔آپ کو پسند بھی آئے گا اور میں بھی آپ کا منتظر رہوں گا۔

خالدہ جس طمطراق سے آئی تھی اسی طرح اپنی نظروں کے تیر برساتی، ناز انداز دکھاتی، زرگر کو گھائل کرتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔اس کے جانے کے بعد زرگر کو صرف خالدہ کی صورت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا رہا۔خالدہ حسبِ وعدہ جمعہ کو نہ آئی۔زرگر بہت پریشان تھا۔وہ تمام دن کارخانہ کھولے بیٹھا رہا۔جمعہ نماز بھی پڑھنے نہ گیا کہ مبادا سرکار آ کر چلے نہ جائیں۔

نہ وہ آئیں کہ راحت ہو
نہ موت آئے کہ فرصت ہو
بڑا ہے دل کشاکش میں
نہ غم نکلے نہ دم نکلے

پورا ہفتہ انتظار کے بعد اگلے جمعہ عبدالشکور کی مراد بر آئی۔عبدالشکور گردن جھکائے خالدہ کے سراپے کو دل میں سجائے تصور کی آنکھ سے خالدہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا کہ اچانک کاؤنٹر پر ٹک ٹک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو من مراد کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ہلکا سا جلترنگ بجا اور نازک سی آواز آئی۔السلام علیکم!عبدالشکور کو تو جیسے 440 وولٹ کا جھٹکا لگا۔بے بسی کی کیفیت میں وہ وعلیکم السلام سرکار وعلیکم السلام کہتا گیا۔پوچھا گیا کہ میرے زیورات تیار ہیں؟ جواب آیا۔۔جی سرکار۔عبدالشکور ڈبے کھول کھول کر اس کے سامنے رکھتا گیا۔خالدہ بھی زیورات کی چکا چوند سے بہت متاثر ہوئی۔

عبدالشکور بھی آخر زرگر تھا بولا سرکار آپ پہن کر دیکھیں،آپ پر تو اتنا خوبصورت لگے گا کہ خواتین دیکھتی رہ جائیں گی۔وہ ایک سیٹ پہنتی اور قد آدم آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی۔عبدالشکور تعریفوں کے پُل باندھتا پھر وہ دوسرا سیٹ پہنتی۔بار بار سیٹ پہننا،اتارنا پھر دوسرا سیٹ سجانا بے تکلفی اور بے پردگی کا کام تھا۔مکمل سیٹ پہن کر آئینے کے سامنے دائیں بائیں اپنے آپ کو مختلف زاویوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔اس زیوراتی مشق کے دوران عبدالشکور اسکے جسمانی نشیب وفراز کا جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ساتھ تعریفوں کے پُل باندھ رہا تھا۔عبدالشکور کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے زیورات اس کے کانوں،گردن اور ہاتھوں پر سجائے اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔آج خالدہ نے سفید رنگ کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی۔جس پر سلمہ ستارے کا نفیس کام کیا ہوا تھا۔عبدالشکور نے لوہے کی الماری کھول کر اس کے اندر کا قفل کھولا۔پھر اس کے بھی اندر کا قفل کھول کر ایک بہت خوبصورت لال رنگ کا ڈبہ نکالا اور اسے خالدہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔اسے دیکھ کر خالدہ ماہی بے آب کی طرح تڑپی اور پیار بھرے غصے سے بولی کہ یہ سیٹ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں دکھایا۔عبدالشکور بھی پیار سے بولا سرکار یہ آپ کو صرف دکھانا نہیں تھا بلکہ تحفتاً دینا تھا۔یہ خالص سونے سے بنایا گیا ہے اور اس میں یاقوت جڑے ہیں۔اپنی نوعیت کا یہ واحد سیٹ ہے۔۔ایسا سیٹ دوبارہ کبھی کسی کے لیے نہیں بناؤں گا۔اب میں یہ سیٹ آپ کو خود اپنے ہاتھ سے پہناؤں گا۔خالدہ نے جھٹ سے اپنا دایاں کان آگے کر دیا۔پھر بایاں کان پھر چہرہ چھت کی طرف کر کے اپنی صراحی دار گردن آگے کر دی۔عبدالشکور نے گلوبند اس کی گردن پر سجایا اور پھر اس کی پشت پر جا کر اپنے ہاتھ آگے کر کے اس کے گلوبند کو درست کیا اور ریشمی ڈوری باندھ دی۔پھر اس کی انگلیاں ہاتھوں میں لے کر انگوٹھیاں پہنا

دیں اور ہلکے سے بڑبڑایا سرکار ذرا آئینہ تو دیکھیں! مجھ میں تو دیکھنے کی تاب نہیں۔

خالدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مٹکتی ہوئی آئینہ کے سامنے جا کر خود کو توڑ مروڑ کر دیکھنے لگی۔ اتنے میں نہ جانے عبدالشکور کو کیا سوجھی جھٹ سے اس نے اپنی آہنی الماری کا قفل کھولا اور اس میں سے پازیب نکال کر خالدہ سے بولا سرکار ذرا اپنا پیر کاؤنٹر پر رکھنا۔ خالدہ نے فوراً پیر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ عبدالشکور نے پہلے دائیں پھر بائیں پاؤں میں پازیبیں پہنا دیں۔ پازیب پہناتے خالدہ کا پائنچہ کچھ زیادہ ہی اوپر ہو گیا اور عبدالغفور نے اس کی سڈول پنڈلیاں بھی دیکھ لیں۔ عبدالشکور تو پہلے ہی خالدہ کے لمس کے زیر اثر تھا، پنڈلیاں دیکھ کر اور ان کا لمس محسوس کرنے پر وہ برقی جھٹکے کی سی کیفیت میں چلا گیا۔ خالدہ نے مترنم و مدھم آواز میں سیٹ کی قیمت کے بارے میں پوچھا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وہی پتھرایا ہوا بُت سامنے کھڑا تھا۔ خالدہ نے اس کے دونوں کندھے پکڑ کر اس کو زور سے ہلایا اور ٹھہرے ٹھہرے انداز سے بولی کہ عبدالشکور صاحب یہ سیٹ جو میں نے پہنا ہوا ہے کتنے کا ہے؟ عبدالشکور کی نقاہت بھری آواز آئی سرکار! یہ میں نے بہت دل سے آپ کے لیے بنایا ہے۔ یہ انمول ہے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ بس اس کو آپ اپنے پریوں جیسے جسم پر سجائیں۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ خالدہ کی تو باچھیں کِھل گئیں۔ بولی کہ اس کو پیک کر دیں۔ مجھے آپ کا تحفہ دل و جان سے قبول ہے مگر اس کی رسید بنا کر دیں تا کہ میرے پاس جواز ہو کہ میں نے یہ یاقوت لگا سیٹ کہاں سے لیا ہے۔ جیسے ہی خالدہ نے سیٹ اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھائے عبدالشکور بول اٹھا، نہ سرکار ابھی نہ اتاریں۔ پہلے ہم کھانا کھائیں گے پھر میں اپنے ہاتھ سے یہ اتار کر ڈبے میں بند کر کے آپ کو پیش کروں گا۔ کاؤنٹر پر ہی ملازم نے پرتکلف کھانا پروس دیا جو بیکانیری گیٹ کے باہر کسی ہوٹل سے منگوایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد عبدالشکور نے بڑی احتیاط سے تمام زیورات اتارے۔ احتیاط سے مراد ہے کہ یہ سب زیورات یاقوت جڑے تھے اس لیے کوئی جھٹکا یا کھینچا تانی زیورات کے ساتھ نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ ہاں اگر زیورات اتارتے عبدالشکور کی انگلیاں ادھر اُدھر مس ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

آج کا دن عبدالشکور کی سفلی خواہشات کی تکمیل اور اس کی سادگی کے سامنے چکا چوند کا چھا جانا اس کی بدنصیبی اور بربادی کے آغاز کا دن تھا۔ خالدہ جیسے ہوا کے جھونکے کی طرح آئی تھی اسی طرح زیورات کے ڈبے مع رسید لے کر چلی گئی۔ دوبارہ آنے کا وعدہ بھی ہو چکا تھا۔ عبدالشکور فتح کے نشے میں سرشار پھولے نہیں سما رہا

تھا۔اس کے بعد یہ زمین وآسمان ایک ہوئے۔آپ سے تم اور تم سے تُو کا عنوان ہو گئے۔جب زمین وآسمان ایک ہو جائیں تو قیامت آتی ہے۔پہاڑ بھی روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں۔بس یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔

بقول کوثر ثمرین:

وصل کے موسم میں تیری گرم سانس اوڑھ کر
جسم کے سب زاویے دہکا کئے مہکا کئے
رات بھر تکیے میں تیرے لمس کی خوشبو رہی
خواب سی بارش تھی جس میں دیر تک بھیگا کئے

میں محلّہ چاہ فتح خاں سے ترکِ سکونت کر کے دوسرے محلے چلا گیا تھا۔اس طرف آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی خالدہ اور عبدالشکور کی کہانی کی جان کاری بذریعہ عوام الناس ملتی رہی جو کچھ یوں تھی۔ پہلے تو صرف عبدالشکور خالدہ کے تیر کا شکار ہوا جو کہ یک طرفہ تھا۔پھر عبدالشکور نے سونے، زمرد اور یاقوت کے تیروں سے خالدہ کا شکار کر لیا۔اب دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی جس کا انجام کچھ اس طرح ہوا۔دونوں نے مل کر ڈاکٹر صاحب (خالدہ کے شوہر) کو slow poisoning کر کے راہیٔ ملکِ عدم کیا۔اس طرح خالدہ کا راستہ صاف ہو گیا۔عبدالشکور نے بھی اپنی اہلیہ محترمہ کو طلاق دے دی اور مع بچوں کے اس کو گھر سے نکال دیا۔ڈاکٹر صاحب سے بے وفائی اور ان کے قتل کی وجہ سے جبکہ عبدالشکور کی اپنی بیوی سے بے وفائی اور بچوں کے ساتھ ظلم کی وجہ سے قدرت نے کس طرح ان دونوں اور ان کے ہونے والے بچوں سے انتقام لیا وہ سارے زمانے نے دیکھا۔یہ ایک لمحہ فکر یہ بھی ہے اور قابلِ عبرت بھی ہے۔

ہوا کچھ اس طرح کہ دونوں نے اپنے راستے کے پتھر بہت خوش اسلوبی سے ہٹا دیے اور جلد ہی شادی کر لی۔راگ رنگ اور شراب وشباب کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا گیا۔گھر میں سے اللہ تعالیٰ کی عطا کی گئی برکت بتدریج ختم ہوتی گئی۔نحوستوں کے سائے گہرے ہوتے گئے۔دونوں ذلتوں کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔اوپر نیچے لگا تار چار لڑکے پیدا ہو چکے تھے۔اب زرگری کا کارخانہ نہ ہونے کے برابر تھا۔سرمایہ بھی تقریباً ختم تھا۔تمام کاریگر اور ملازم انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔خالدہ کی بدزبانی، گالم گلوچ، ملازموں کو مارنا، گریبان پکڑنا، فحش

گفتگو کرنا اس کی بڑی وجہ تھی۔عبدالشکور بے بس تھا کیونکہ وہ اس کے جرم میں برابر کا شریک تھا اور خالدہ اس کو متواتر بلیک میل کر کے سرمایہ اللوں تللوں میں اڑاتی رہی اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کارخانہ مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔سامان فروخت کر کے کارخانے کی چار دکانیں بنا کر کرائے پر دے دی گئیں۔جب یہ دونوں ننگے بھوکے ہو گئے تو خالدہ نے ایک ادارہ خدمتِ خلق کے نام سے رجسٹرڈ کروایا۔بظاہر یہ ادارہ گم شدہ بچوں کو ڈھونڈھ کر ان کو ان کے والدین تک پہنچانے کا کام کرتا تھا۔لیکن خالدہ کی عام شہرت اغوا کرنے والی عورت کی تھی۔اس کے گھر ہر وقت اسی قماش کے پولیس کے لوگ جمع رہتے۔شراب و شباب کی محفلیں سجاتے تھے۔عبدالشکور دلال کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔یہ پستی کی انتہا تھی۔مجھے یقین کامل ہے کہ ایک باوفا اور باشعار درویش صفت اہلیہ کو مع بچوں کے گھر سے نکال کر زمانے کی ٹھوکروں کی حوالے کر دینے والے کے لیے یہ سزا بہت معمولی تھی۔میں اکثر وہاں سے گزرتے ہوئے عبدالشکور کو دیکھا کرتا تھا۔اُس کے تن پر ایک میلی سی بنیان اور چادر ہوتی تھی۔ایک بچے کو گود میں اٹھائے اور دوسرے کی انگلی تھامے کریانے کی دکان سے خریداری کرتے ہوئے نظریں زمین کی طرف شرمندہ شرمندہ۔اندر کی کیفیت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں لیکن ظاہری کیفیت بھی عیاں ہوتی تھی۔اس دوران خالدہ کے ساتھ ایک واقعہ ہو گیا۔اس کی بیٹی جو امجد کی سگی بہن اور اس کے مرحوم شوہر ڈاکٹر صاحب کے نطفے سے تھی اور جس کی شادی ایک پولیس سب انسپکٹر سے کر دی گئی تھی۔اس کو اس کے شوہر نے سرِ عام اپنے سروس ریوالور سے شوٹ کر دیا تھا۔

اندریں حالات دونوں کا چڑچڑا ہونا ایک قدرتی سی بات تھی۔مگر اس کا ردِعمل اکثر شدید ہوتا تھا۔عبدالشکور اور خالدہ بری طرح آپس میں لڑتے۔عبدالشکور اپنی جان چھڑانے کے لیے باہر گلی میں آجاتا تھا۔خالدہ ہاتھ میں جوتا یا ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے بھاگتی اور فحش گالیاں نکالتی۔محلّہ کے لوگ توبہ توبہ کرتے۔روز کی لڑائیوں کا بچوں پر بھی برا اثر پڑتا۔اب حسن اور جوانی دونوں روبہ زوال تھے۔دماغ کا فتور بھی ختم ہو چکا تھا۔اب لینے کے دینے پڑے ہوئے تھے۔خالدہ کی شکل وشباہت 90% جبکہ جسامت 100% فلم ایکٹریس آشا پوسلے جیسی ہو گئی تھی۔کچھ عرصے بعد اس نے اپنے اگلے دو دانتوں پر سونے کا خول لگوا لیا۔سگریٹ نوشی، تمباکو والے پان اور دیگر خرافات کی وجہ سے دانت بہت خراب ہو چکے تھے اور خوفناک منظر پیش کرتے تھے۔رہی سہی کسر اس کی بدکلامی سے پوری ہو جاتی تھی۔آواز کے مدھر ترنم کی جگہ کرختگی نے

لے لی تھی۔ اپنی مصروفیات کے پیشِ نظر انسان حالات و واقعات کے دھارے پر بہتا چلا جاتا ہے اور اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر رہتا ہے۔ چند سال مزید بیت گئے۔ میں بھی عیال دار ہو گیا اور فکرِ روزگار میں مصروف ہو گیا۔

ایک روز میرے دوست عبدالروف صاحب جو گورنمنٹ کے ایک محکمہ میں ڈائریکٹر تھے میرے گھر واقع ٹرسٹ کالونی میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک گورا چٹا صحت مند لڑکا بھی تھا۔ گپ شپ کے دوران فرمانے لگے کہ یہ میرا کزن ہے اور سعودی عرب میں کام کرتا ہے۔ اب یہ پاکستان سے سعودی عرب کے لیے ایکسپورٹ کا کام کرنا چاہتا ہے۔ آپ رہنمائی فرمائیں کہ یہ امپورٹ ایکسپورٹ رجسٹریشن کیسے کروائے۔ ان دنوں رجسٹریشن کا قانون کافی پیچیدہ تھا۔ میں چونکہ یہ کام کر رہا تھا اس لئے وہ اپنے کزن کو میرے پاس لائے تھے۔ میں نے اس کو تمام قاعدے قانون کے بارے میں آگاہ کیا اور تمام فائلز مرتب کرنے میں اس کی مدد کی جس کی وجہ سے وہ بہت احسان مند ہوا۔ جب اس کا تمام کام ہو گیا تو وہ میرا شکریہ ادا کرنے آیا اور بولا کہ میں مدینے شریف میں اپنے والدین اور بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اگر آپ کبھی تشریف لائیں تو ضرور خدمت کا موقع دیں۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس وقت تو میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور وہ بار بار شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ کچھ دن بعد میں اور عبدالرؤف صاحب اکٹھے بیٹھے تھے۔ مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا کہ کاغذات اور شناختی کارڈ پر اس لڑکے کا ایڈریس گندی گلی کا لکھا ہوا تھا، میں وہاں سب کو جانتا ہوں، وہ کس کا بیٹا ہے؟ اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ عبدالشکور اور خالدہ کا بڑا بیٹا ہے۔ عبدالرؤف صاحب بولے کہ عبدالشکور میرے انکل ہیں۔ میں اُن سے اور اپنے کزن سے میل ملاپ رکھتا ہوں لیکن خالدہ کی وجہ سے ان کے گھر نہیں جاتا۔ میں یہ سب سُن کر چپ ہو گیا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہ بچہ جواب گبرو جوان بن چکا تھا راہِ راست پر تھا۔ اپنے معاشی اور معاشرتی حالات سے تنگ آ کر محنت مزدوری کرنے سعودی عرب چلا گیا۔ پھر ایک ایک کر کے اپنے بھائیوں اور والدین کو بھی بلوا لیا۔ شادی ہوئی، بچے ہوئے۔ ایک بچہ میدانِ عرفات میں پیدا ہوا تو اس کا نام بھی ابراہیم عرفات رکھ دیا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا۔

1981 میں لندن، بن غازی، روم اور کانو سے ہوتا میں جدہ پہنچ گیا۔ متذکرہ بالا ممالک اور شہروں کی

داستان میں اپنی تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ جدہ سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میرا ساتھ اسلم خان صاحب مرحوم، ڈائریکٹر ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے ساتھ ہو گیا۔ ہم جدہ سے مکہ معظّمہ کے لیے ایک ٹیکسی کار میں اکٹھے روانہ ہوئے۔ ہم لوگ احرام میں بہ نیت عمرہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے سائے میں عمرہ کرتے ہوئے ہم مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ دونوں جگہ ہماری رہائش پاکستان ہاؤس میں تھی۔ مدینہ منورہ میں ہمارا دوسرا دن تھا۔ اس وقت کا پاکستان ہاؤس مسجدِ نبوی کے بابِ جبریل کے بالکل سامنے سڑک کے دوسری طرف تھا۔ پاکستان ہاؤس کے مین گیٹ کے ساتھ ہی ایک تنگ سی گلی تھی۔ وہ گلی جنت البقیع کے بالکل سامنے جا کر سوق برشیم والی سڑک سے جا ملتی تھی۔ یہ گلی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ نبی کریم ﷺ مسجدِ نبوی سے جنت البقیع جانے کے لیے یہی راستہ اختیار کیا کرتے تھے کیونکہ یہ نزدیک ترین راستہ تھا۔ اسی گلی میں وہ ناہنجار بڑھیا نبی پاک ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیتی تھی۔ اس وقت تک وہ مکان اور اس کا دروازہ اپنی اصلی حالت میں موجود تھا۔ بعد میں یہ مکان اور گلی مسجدِ نبوی کے توسیعی منصوبے میں ضم ہو گئے۔

آقائے نامدار ﷺ کے حضور ہم دونوں غلاموں نے حاضری دی۔ نماز کے اوقات کے علاوہ ہم مدینہ کی گلیاں اور بازار گھومنے چلے جاتے۔ ایک روز ہم ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک کھلی سی جگہ پر 6/7 درزی اپنی اپنی مشینوں پر کام کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ سرائیکی میں ٹھٹھا مذاق بھی جاری تھا۔ خالص سرائیکی گفتگو سُن کر میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ہمیں دیکھ کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ میں نے سرائیکی میں ہی اُن سے پوچھا کہ آپ لوگ پاکستان کے کس شہر کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے فوراً بہاولپور کا نام لیا۔ میں نے بہاولپور کے محلے گنوانے شروع کئے۔ ایک محلّہ نواباں، دوسرا محلّہ مبارک پورہ اور اسی طرح سب کے محلے گنوا دیے۔ سب نے اُٹھ کر بڑی چاہت سے ہم سے ہاتھ ملائے۔ کھانے اور چائے کی دعوت دی۔ میں نے ایسے ہی باتوں باتوں میں اُن سے پوچھا کہ کیا وہ مشکور حسین نامی شخص کو جانتے ہیں جو بہاولپور سے تعلق رکھتا ہے اور کئی سال سے یہاں مقیم ہے؟ وہ یک زبان بولے کہ وہی تو ہمیں بہاولپور سے یہاں لایا ہے۔ وہ ہمارے کفیل کا منیجر ہے۔ اس وقت وہ رقوم کی وصولی کے لیے گیا ہوا ہے اور نمازِ عصر کے بعد آئے گا۔ میں نے ایک کاغذ پر اپنا نام اور پاکستان ہاؤس کمرہ نمبر ۳ لکھ کر انہیں دیا اور کہا کہ یہ کاغذ مشکور حسین کو

دے دینا۔ ہم سلام دعا کر کے وہاں سے چلے آئے۔ دو روز بعد اسلم خان صاحب نے واپس پاکستان چلے جانا تھا جبکہ میرا قیام مزید ایک ہفتہ وہیں تھا۔ اس لیے ہم جلدی تمام زیارتیں کرنا چاہتے تھے۔

عشاء کی نماز پڑھ کر ہم اپنے کمرے میں آئے تو اٹینڈنٹ نے مشکور حسین کے آنے کی خبر دی۔ اسلم خان صاحب نے کہا کہ ہم لوگ تھکے ہوئے ہیں اس لیے اُسے سٹنگ روم میں بٹھانے کے بجائے یہیں ہمارے کمرے میں بھیج دو۔ اٹینڈنٹ ملاقاتی کو لے آیا۔ بہت پیار اور عزت و احترام سے مشکور ہمیں ملا۔ ہم بھی اس کو شفقت و پیار سے ملے۔ وہ بے حد خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں نے اس کو یاد رکھا اور ڈھونڈ بھی لیا۔ وہ بولا صبح جمعہ ہے اور میری چھٹی ہے۔ میں علی الصبح کار لے کر آؤں گا اور آپ کو تمام زیارتیں کرواؤں گا۔ کل جمعہ نماز کے بعد کھانا میری طرف سے ہوگا۔ وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

دوسرے روز جب ہم حرم پاک سے نماز پڑھ کر لوٹے تو وہ حسبِ وعدہ گاڑی لئے ہمارا منتظر تھا۔ مدینہ شریف کی تمام زیارتیں اس نے ہمیں کروائیں۔ وہ نہ صرف اچھا ڈرائیور ثابت ہوا بلکہ بہترین گائیڈ ہونے کے ساتھ عربی بھی روانی سے بولتا تھا۔ یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ اُس نے ہمیں کھانا بھی پر تکلف کھلایا۔ اسلم خان صاحب اپنے بچوں کے لئے کچھ خریداری کرنا چاہتے تھے۔ اُس نے ہمیں کہا کہ جنت البقیع کے آخری کونے پر جہاں سوقِ برشیم سڑک ختم ہوتی ہے وہاں ایک بہت بڑی سپر مارکیٹ ہے اور میں وہاں ہی ہوتا ہوں۔ آپ جب چاہیں تشریف لے آئیں۔ آپ کو وہاں سے ہر چیز مل جائے گی۔ دوسرے روز عصر کے بعد ہم وہاں چلے گئے۔ وہ واقعی ایک بڑی سپر مارکیٹ تھی جہاں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ کئی قسم کی مشینیں بھی لگی ہوئی تھیں جو نمک مرچ اور مسالحہ جات تیار کر رہی تھیں۔ مشکور بولا یہ سب کچھ ہم سارا سال تیار کرتے ہیں۔ حج کے دنوں میں ہر چیز بک جاتی ہے اور مارکیٹ خالی ہو جاتی ہے۔ ہم پھر سے تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک بڑا کاروبار تھا جس کا انچارج مشکور حسین تھا۔ اس کے علاوہ درزی خانہ، کپڑے کا کاروبار اور اسکے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔

خان صاحب نے 3500 ریال اور میں نے 3000 ریال کی شاپنگ کی۔ مشکور ہم دونوں کو پاکستان ہاؤس تک کار میں چھوڑ گیا۔ ہم نے عشاء کی نماز پڑھی اور کھانا کھانے نیچے ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ اٹینڈنٹ مشکور حسین کو لے کر آ گیا۔ میں نے اس کو کھانے کی دعوت دی تو اس نے

شرما کر انکار کیا۔ میں نے اس کو ذرا سختی سے کہا کہ آرام سے بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔ وہ گومگو کی کیفیت میں بیٹھ گیا اور نظریں نیچی کیے کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد ہم مع مشکور اپنے کمرے میں آ گئے۔ اُس نے اپنی جیب سے مٹھی بھر نوٹ نکالے اور مجھے دینے لگا۔ میں اور خان صاحب اس کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا آپ نوٹ پکڑیں میں بتاتا ہوں۔ میں نے نوٹ پکڑ لیے تو وہ بولا کہ جب آپ شاپنگ کر رہے تھے تو میرا کفیل اوپر والے سیکشن میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جب میں آپ کو چھوڑ کر واپس گیا تو اس نے مجھے اپنے آفس میں بلا لیا اور پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے جن کے گرد تم منڈلا رہے تھے؟ میں نے آپ لوگوں کا مکمل تعارف اسے کروایا۔ اس نے کیشیئر کو بلا کر کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ Teller machine پر چیک کرو کہ انہوں نے کتنے کی شاپنگ کی اور 50% کیش واپس کر دو۔ اور مشکور کو حکم دیا کہ ابھی پاکستان ہاؤس جاؤ اور کیش واپس کر کے آؤ۔ لازمی تھا کہ میں اور خان صاحب مشکور اور کفیل دونوں کا شکریہ ادا کرتے۔ دوسرے روز ہم خود اس کے آفس گئے۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور ذائقہ دار قہوہ نوش کیا۔ اگلے روز خان صاحب ہمیں اداس کر کے کراچی کی فلائٹ کے لیے مدینہ سے بذریعہ بس جدہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ میرا قیام مزید ایک ہفتہ تھا۔ مشکور اکثر فارغ ہونے کے بعد میرے پاس واپس آ جاتا۔ ہم اکٹھے گھومتے پھرتے رہتے۔ اس کی اکثر کوشش ہوتی کہ میرے پیسے خرچ نہ ہوں۔ وہ جلدی جلدی بل دینے کی کوشش کرتا جو مجھے پسند نہیں تھا۔ میں اکثر اس سے گریز کرتا لیکن کبھی کبھی وہ کامیاب بھی ہو جاتا۔

ایک روز میں نے اس سے ذکر کیا کہ جب آپ پاکستان سے سعودی عرب کے لیے روانہ ہو گئے تو عبدالرؤف صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ تب معلوم ہوا کہ آپ عبدالشکور صاحب اور خالدہ صاحبہ کے فرزند ہو۔ آپ کا سوتیلا بھائی امجد میرا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ اس کا آخری خط اور تصویر مجھے لیبیا سے موصول ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اُس کا مجھ سے کوئی رابطہ نہیں۔ مشکور بولا کہ مجھے بھی اس سے بہت محبت ہے۔ اُس نے مجھے بچپن میں گود میں کھلایا ہے۔ وہ مزید بولا کہ جب میں پہلی بار اپنے کزن کے ساتھ آپ کے پاس آیا تھا میں نے آپ کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا مگر کسی انجانے خوف کے تحت خاموش رہا۔ میں نے اس کے والدین کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا کہ دونوں یہاں ہی موجود ہیں اور میرے دیگر بھائیوں کے ساتھ الگ مکان میں رہتے ہیں جبکہ میں اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ الگ مکان میں رہتا ہوں۔ پھر

اُس نے پوچھا کہ کیا آپ میرے والد سے ملنا پسند کریں گے؟ وہ یہاں قریب ہی ہیں۔ میں نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مارااور کہا کیوں نہیں! آؤ ابھی چلتے ہیں۔ میں اُٹھ کر مشکور کے ساتھ چل پڑا۔ مسجدِ نبوی کی حدود سے باہر نکلتے ہی ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں ایک معمولی سی بجلی کی دکان تھی۔ غالباً وائرنگ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ عبدالشکور صاحب بے دلی سے نظریں نیچی کیے ہوں ہاں کرتے رہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے آکر غلطی کی ہے۔ مگر میں نے خوش دلی اور اخلاق کا دامن نہیں چھوڑا اور ہم واپس آگئے۔ واپسی پر میں نے محسوس کیا کہ مشکور کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔ میں نے اس کو حوصلہ دینے کی کوشش کی تو وہ زارزار رونے لگا اور بولا کہ میری ماں یہاں بھی ہمارے لیے عذابِ الٰہی بنی ہوئی ہے۔ میں نے موضوعِ گفتگو بدل دیا کیونکہ ہم حرم پاک کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ذکرِ الٰہی اور اس کے محبوب ﷺ پر درود بھیجنے کے علاوہ میں کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مشکور ہاتھ ملا کر دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا اور میں ریاض الجنہ اپنے آقا کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا۔ نبی پاک ﷺ کے مصلے کی طرف دیکھا اور تصور کیا کہ جب آپ ﷺ امامت فرماتے ہوں گے تو آپ ﷺ کے پیر مبارک مصلے کی اس جگہ پر ہوتے ہوں گے۔ اندازے سے اس جگہ اپنی جبین رکھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

نوافل سے فارغ ہو کر نماز باجماعت ادا کی اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ کھانے کی طلب بھی نہیں تھی۔ بس جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دل و دماغ اور زبان پر درود شریف کا ورد تھا۔ نہ جانے کب خواب میں دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں شامل ہوگیا۔ صبح خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ بھاگم بھاگ حرم پاک میں نماز کے لیے حاضری دی اور جنت البقیع چلا گیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ واپسی کا ٹائم آگیا اور میں جدہ کے لیے بس میں سوار ہوگیا۔ مشکور نے میرا سامان اپنی نگرانی میں بس میں رکھوایا۔ بس روانگی تک کھڑا رہا۔ اور گلے ملتے ہوئے اپنے آنسو نہ روک سکا جس کا مجھے تمام راستے شدت سے احساس بھی رہا۔ میں پاکستان پہنچ کر کارِ زندگی میں مصروف ہوگیا۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا ہوگا کہ ایک روز میرے گھر کے داخلی دروازے کی بیل بار بار بج رہی تھی۔ میں نے دیکھا تو مشکور کو پریشان اور خاموش کھڑے پایا۔ چائے کے بعد جو کہانی اس نے سنائی وہ کچھ اس طرح تھی کہ اس کے والد محترم وفات پا کر مدینہ شریف میں دفن ہو چکے ہیں۔ وفات سے پہلے وہ

میری والدہ کو طلاق دے چکے تھے۔اس نے مزید بتایا کہ اس کے تینوں بھائی ہیروئین پیتے ہیں اور کسی طرح پاکستان سے لے جا کر وہاں فروخت بھی کرتے ہیں۔میری والدہ بھی ان کے جرم میں برابر کی شریک ہے۔ ماں بیٹے مل کر پاکستان سے سعودی عرب کے لیے ہیروئین کے پھیرے لگانے لگے تھے۔ایک روز چھاپہ پڑ گیا۔مال تو برآمد نہیں ہوا کیونکہ وہ سب فروخت کر چکے تھے اور پاکستان جا کر مزید لانے کے لیے تیار تھے کہ مخبر نے چھاپہ پڑوا دیا۔پولیس نے ان سب کو جیل میں بند کر دیا اور ان کے ڈوپ ٹیسٹ کروائے۔اُن کے خون میں ہیروئین کی انتہائی مقدار پائی گئی۔پولیس نے تفتیش کے بعد سب کو ڈی پورٹ کر دیا اور تمام زندگی کے لیے بلیک لسٹ بھی۔اب یہ لوگ کبھی سعودی عرب نہیں جا سکتے تھے۔مشکور ان سب کو اپنے اخراجات پر ایک ایک کر کے لے کر گیا تھا۔انہیں نوکریاں دلوائیں۔کئی سال یہ لوگ مدینہ میں رہے اور خوشحال ہو گئے تھے۔مشکور بھی کافی امیر ہو گیا تھا لیکن سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔پولیس نے سب کو ہتھکڑی لگائی اور جہاز میں سوار کر دیا۔پاسپورٹ بھی جہاز کے اندر واپس کئے گئے۔اگر کوئی اثاثہ تھا بھی تو وہ پیچھے رہ گیا۔

مشکور کی زبانی یہ کہانی سُن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ان لوگوں میں صرف مشکور ہی صحت منداور ہر قسم کے اخلاقی عیوب سے پاک تھا۔شادی شدہ اور بال بچے دار تھا۔اُٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کی تمیز تھی۔بزرگوں کا احترام کرنا بھی جانتا تھا۔اکثر میرے پاس آجاتا۔میں بھی اس کا بہت لحاظ کرتا تھا۔اسکی دلجوئی بھی کرتا۔ پاکستان واپس آکر مشکور تو اپنے روزگار کی فکر اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہنے لگا لیکن اس کے تینوں بھائی ہیروئین پینے اور پشاور جا کر خرید کرلانے میں مصروف ہو گئے۔رہنے کے لیے ایک ہی مکان تھا جواب کھنڈر بن چکا تھا۔کسی کمرے کی چھت گری ہوئی تھی تو کسی کی دیوار۔نوبت یہاں تک پہنچی کے مشکور کے تینوں بھائیوں نے ہیروئین پینے کے لیے گھر کی ہر چیز اونے پونے فروخت کرنے لگے۔یہاں تک کے مسمار شدہ گھر کی اینٹیں، گارڈر اور ٹی آئرن تک فروخت کر دیے۔

خالدہ شدید بیمار ہوگئی۔اس کا رعب و دبدبہ بھی ختم ہو گیا۔ہیروئین فروخت کرنے والوں کی بدنامی بہت جلد ہو جاتی ہے۔اس لئے پولیس کا آنا جانا بھی لگ گیا۔مشکور اس صورت حال سے گھبرا گیا۔میرے پاس آیا اور بہت رویا۔مجھے کہنے لگا کہ میں آپ کو اپنا روحانی استاد مانتا ہوں۔صرف آپ ہی ہیں جو مجھے

عزت دیتے ہیں، میری بات سنتے ہیں اور حوصلہ تسلی بھی دیتے ہیں۔ ورنہ لوگ تو مجھ سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتے کہ کہیں وہ پولیس کی نظروں میں نہ آ جائیں۔ میں نے کہا کہ مشکور سیدھی بات کرو میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ وہ بولا کہ سب سے پہلے تو میرے بھائیوں کو جیل بھجوائیں تاکہ ان کا علاج ہو سکے۔ میں نے کہا کہ جیل بھجوانا تو بہت آسان ہے لیکن وہاں علاج کے بجائے مرض مزید بڑھ جائے گا۔ وہ بولا کہ آپ بھجوائیں کیونکہ گھر میں ہر وقت ہیروئین پینے والوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ والدہ سے بھی گالی گلوچ کرتے ہیں۔ میں مصیبت میں پھنسا رہتا ہوں۔ میں نے الگ مکان کرائے پر لینے کی کوشش بھی کی لیکن کوئی مجھے مکان کرائے پر دینے کو تیار نہیں۔ مزید یہ کہ میں اب کسی یورپی ملک جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کا ایک کام میں ابھی کئے دیتا ہوں۔ میری ہمشیرہ اپنے نئے مکان میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ ان کا پرانا مکان خالی اور بجلی، گیس، فون تمام سہولیات سے آراستہ ہے۔ آپ وہاں شفٹ ہو سکتے ہیں بس آپ کی والدہ اور بھائی کسی بھی حالت میں وہاں نہ آئیں۔ وہ بولا آپ فکر نہ کریں آپ کو ذرا سی بھی شکایت نہیں ہو گی۔ میں گھر کے اندر چلا گیا اور چابی لا کر اس کو دے دی۔ وہ خوش اور مطمئن ہو گیا۔ اُس نے دوسرے کام کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے اسے کہا کہ جب تمھارا بھائی پشاور جانے کے لیے تیار ہو تو میرے پاس آ جانا۔ وہ مع ساتھیوں کے جیل میں ہوگا۔ دوسرے روز ہی وہ اپنی فیملی کے ساتھ نئے گھر میں شفٹ ہو گیا۔

ایک روز بعد نمازِ مغرب مشکور آیا اور رازداری سے بولا کہ اس کا بھائی آج رات سمہ سٹہ ریلوے اسٹیشن سے پشاور کے لیے گاڑی میں سوار ہوگا۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ کبھی سمہ سٹہ اور کبھی لودھراں سے ٹرین میں سوار ہوتا ہے کیونکہ بہاولپور اسٹیشن پر لوگ اسے پہچانتے ہیں اس لیے وہ احتیاطاً ایسا کرتا ہے۔ میں نے اسی وقت اس کو ساتھ لیا اور سمہ سٹہ ریلوے پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔ وہاں عبداللہ خان SHO تعینات تھے جو خود بھی پشتو بولتے تھے۔ میں نے انہیں سارا ماجرا بیان کیا تو وہ بولے کہ صرف اُس کے چہرے کی پہچان کروا دیں ہم اس کو پشاور ریلوے اسٹیشن پر مع ہیروئین گرفتار کر لیں گے۔ ہماری کارگزاری بن جائے گی۔ اسی وقت وہ خود مع پولیس عملہ ریلوے اسٹیشن پر پھیل گئے۔ مشکور کو انہوں نے پہچان چھپانے کے لیے ایک گرم شال اوڑھا دی اور اشارے سے مطلوبہ شخص کی نشاندہی کی تاکید کی۔ ٹرین آنے پر ہی مطلوبہ شخص بہترین لباس زیبِ تن کئے آ گیا۔ AC کمپارٹمنٹ میں قلی نے اس کا سامان رکھ دیا۔ سمہ سٹہ ایک جنکشن ہے جہاں

ٹرین کافی دیر رکتی ہے اس لئے یہ شخص دانستاً دیر سے آیا تھا تاکہ کم سے کم لوگ اسے دیکھیں۔ مشکور پولیس والوں کو اس کی اچھی طرح نشان دہی کروا کر واپس تھانے چلا آیا جہاں میں اس کا منتظر تھا۔ ٹرین روانہ ہونے کے بعد عبداللہ خان بھی واپس تھانے آ گیا اور بولا کہ میں نے اس کے ساتھ دو آدمی نگرانی کے لیے لگا دیے ہیں۔ ایک AC کمپارٹمنٹ کے اٹنڈنٹ کی شکل میں تاکہ بہتر نگرانی ہو سکے اور دوسرا اس کا پیچھا کرنے کے لیے۔

ہم لوگ اس کا شکریہ ادا کر کے واپس بہاولپور آ گئے۔ تیسرے روز اخبار میں خبر آ گئی کہ بہاولپور کا ایک شخص دو کلو ہیروئین سمیت ڈرامائی انداز میں گرفتار کر لیا گیا۔ ہیروئین کی بین الاقوامی قیمت دو کروڑ روپے ہے۔ مشکور کے باقی دونوں بھائیوں کے لیے علی اکبر گجر انچارج CIA نے چھاپا مارا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دونوں بھائی چھتیں کود کر بھاگ گئے اور روپوش ہو گئے۔

ایک روز میں اپنے کچھ کاغذات ٹھیک کر رہا تھا کہ مجھے لیبیا سے آیا ہوا ایک خط مل گیا جو خالدہ کے بیٹے امجد نے لکھا تھا (امجد کا ذکر اس مضمون میں پہلے آ چکا ہے)۔ خط میں اس کی ایک تصویر بھی تھی اور تصویر کی پشت پر ایک شعر لکھا ہوا تھا۔ یہ اس کا آخری خط اور تصویر تھی جو اس نے مجھے 1976/77 میں ارسال کی تھی۔ اسکے بعد اس کا آج تک کوئی پتا نہیں۔ میں نے وہ خط اور تصویر مشکور کو دکھائی تو وہ بولا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ تصویر اپنی والدہ کو دکھا دوں؟ وہ اکثر اس کو یاد کر کے روتی ہے اور کہتی ہے کہ ادریس نامی لڑکا اس کا دوست تھا اسکو تلاش کرو۔ امجد اُسے ضرور خط پتر لکھتا ہوگا لیکن میں خاموش ہو جاتا ہوں اور میں نے اپنی والدہ کو ابھی تک آپ کے بارے میں نہیں بتایا۔ میں نے انسانی بنیاد پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تصویر اور خط دے دیئے۔ اور دونوں چیزوں کی واپسی کی تاکید کی۔ دوسرے روز وہ دونوں چیزیں واپس لے آیا اور بولا کہ میری والدہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں امجد کے بارے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتی تو خود آتی۔ آپ احسان فرمائیں تو تشریف لے آئیں۔ میں سوچ میں پڑ گیا لیکن جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے نہیں گیا۔

مشکور کے یورپ جانے کے سلسلے میں میں نے اپنے اسلام آباد کے دوستوں سے راہنمائی حاصل کی اور اس کی مدد بھی کی۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔ مشکور کو اٹلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، ناروے اور سویڈن

کا ویزہ مل گیا اور وہ سویڈن چلا گیا۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ چار سال پہلے میں اپنی اہلیہ کے ساتھ سویڈن گیا تو میرے دل میں خواہش تھی کہ اگر مشکور یہاں ہے تو ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ نارشوپنگ یونیورسٹی آف سویڈن کے وزٹ کے دوران میں نے اپنے میزبان سے مشکور کو تلاش کرنے کا ذکر بھی کیا۔ انہوں نے بذریعہ پولیس یا انٹرنیٹ سے تلاش کا مشورہ دیا۔ پولیس کے ذریعے تلاش کرنا اخلاقی طور پر اچھا نہیں لگتا تھا۔ انٹرنیٹ سے کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اپنے بیلجئم کے قیام کے دوران بھی اپنے فرزند جو کہ بیلجیم کے رہائشی ہیں سے انٹرنیٹ پر مشکور کو تلاش کرنے کو کہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

مشکور کے یورپ جانے کے کچھ ماہ بعد ایک دوپہر کو ایک رکشے والا میرے گھر واقع ٹرسٹ کالونی آیا۔ اس نے مجھے ایک چٹ دی اور بولا کہ یہ مائی آپ کو بلا رہی ہے۔ میں نے چٹ کی طرف دیکھا تو اس پر لکھا تھا، ''آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا واسطہ صرف ایک بار میری بات سُن لیں' نیچے خالدہ کا نام لکھا تھا۔ میں پریشان ہوا اور سوچتا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ آخر شام کو میں چلا ہی گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے کرخت آواز آئی، کون ہے؟ میں خاموش رہا۔ پھر آواز آئی کہ اندر آ جاؤ۔ میں نے پہلے جھانک کر دیکھا تو اندر صحن میں ایک چارپائی پر خالدہ بیٹھی نظر آئی۔ میں اس کو دیکھتا گیا اور توبہ استغفار کا وِرد کرتا گیا۔ اس کو عورت کہنا عورت کی توہین تھی۔ مکروہ شکل، چلنے پھرنے سے اوازار، پیلا زرد رنگ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، چارپائی پر تکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس ہی پڑی ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی آپ میرے بیٹے کے دوست ہیں، میرے لیے بیٹے کی طرح ہی ہیں۔ ماضی کی تلخیوں کو ذہن سے جھٹک کر خدا کے لیے میری مدد کریں۔ اگر امجد کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو مجھے بتائیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟

میں نے اس کو کہا کہ جو کچھ امجد کے بارے میں جانتا تھا آپ کو پہلے ہی اس کے خط اور تصویر کی صورت میں دکھا چکا ہوں۔ مزید آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ وہ رونے لگی اور بولی کہ خان صاحب میں آپ کو آپ کے بچپن سے جانتی ہوں۔ اس حالت میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے تو وہ آپ ہی ہیں۔ میں نے زور دے کر خشک لہجے میں دوبارہ پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟ وہ روتے روتے ہاتھ جوڑ کر بولی کہ میری بات توجہ سے سنیں اور غصہ نہ کریں۔

وہ دائیں بائیں اور اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولی کہ گذشتہ رات میرا بیٹا بابر چھت سے صحن میں کودا اور مجھے بولا کہ میں نشے کی وجہ سے مجبور ہوں مجھے پیسے دو۔ میں بولی کہ کل جب میں غسلخانہ میں تھی تم میرے پرس سے میری انگوٹھی اور آٹھ سو روپے نکال کر لے گئے تھے۔ اب کہاں سے پیسے دوں؟ گھر کا سامان تم اور آفتاب پہلے ہی فروخت کر چکے ہو (آفتاب اس کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا)۔ کمرے کی چھت سے ٹی آئرن اور گارڈر تک اتار کر فروخت کر چکے ہو۔ تم دونوں کو شرم نہیں آتی۔ یہ سن کر اس نے پاس پڑے ٹیبل لیمپ سے بجلی کی تار نکالی اور سوئچ آن کر کے بولا کہ اگر تم نے مجھے رقم نہ دی تو میں تمھیں کرنٹ لگا دوں گا اور میرے پلو سے بندھے چار سو روپے کھول کر لے گیا۔ یہ اس کا معمول ہے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے روز یہی واردات کرتا ہے۔ پھر اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے اپنے پیٹ پر سے کپڑا ہٹا کر مجھے اپنا ناسور دکھایا اور کہا خان صاحب مجھے دل کی تکلیف بھی ہے اور یہ ناسور آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ بس اب میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں مجبور و لاچار ہوں۔ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو بابر جیسے چھوکرے مجھے لوٹ نہیں سکتے تھے۔ ساتھ ہی اپنے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولی کہ ہائے کاش میں ہل جل سکتی تو اب تک کئی ٹھاکے پھاکے کر چکی ہوتی۔ پھر ہاتھ باندھ کر بولی کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تو مجھے فوراً دفن کر دینا کیونکہ ناسور کی وجہ سے میرا جسم گلنا سڑنا شروع ہو جائے گا۔ مجھ یقین ہے کہ محلے دار، واقف کار، میری اولاد کوئی بھی مجھے دفنانے یا میرے جنازے کے ساتھ نہیں آئیں گے۔ میں آپ سے امید رکھتی ہوں کہ آپ اپنے دوست کی ماں کا پردہ رکھیں گے اور مجھے مرنے کے بعد ذلیل و خوار نہیں ہونے دیں گے۔ آپ وعدہ فرمائیں، کیا میں آپ سے امید رکھوں؟

میں خاموش رہا۔ دراصل اس کی حالتِ زار دیکھ کر میں دل ہی دل میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحم اور معافی کا خواستگار تھا۔ میں بوجھل دل کے ساتھ کھڑا ہوا اور بولا کہ آپ کسی بھی بات کا کوئی فکر نہ کریں جس کا کوئی نہ ہوا سکے لیے اللہ تعالیٰ کوئی وسیلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ دراصل میں ایک زندہ انسان کو یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ آپ فکر نہ کریں میں آپ کو دفن کر دوں گا۔ میں غمگین سی حالت میں اُٹھ کر چلا آیا۔ مجھے اپنی پشت پر اس کی دعائیں دینے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

تین روز بعد وہی رکشے والا دوبارہ آیا اور بولا کہ خالدہ مائی نے بھیجا ہے۔ گذشتہ رات اس کو دل کی

تکلیف ہوگئی تھی۔ میں ہی اس کو ہسپتال لے کر گیا تھا۔ اس کو دل کے وارڈ میں داخل کیا گیا ہے۔ میں اسی وقت ہسپتال کی طرف چل پڑا۔ امراضِ قلب وارڈ کے بیڈ نمبر ۸ پر وہ تھی لیکن مجھے آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ وہ انتقال کر چکی تھی۔ جسم ابھی گرم تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی کی راہ تک رہی ہوں۔ مگر یہاں کس نے آنا تھا۔ جن کا حق تھا وہ تو ہیروئین پی کر کہیں مدہوش پڑے تھے۔ خالدہ کا ایک بازو نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ میں نے پہلے اس کی آنکھیں بند کیں پھر بازو اٹھا کر سیدھا کیا۔ پریشانی میں مجھے دائیں بائیں کا خیال تک نہ رہا۔ ایک صاحب نے السلام علیکم کہہ کر ہاتھ آگے بڑھایا تو مجھے احساس ہوا کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ یہ آصف چوہان ایڈووکیٹ تھے جو خالدہ کے وکیل تھے۔ انہیں خالدہ نے ہی بلایا تھا مگر میری طرح وہ بھی خالدہ سے آخری ملاقات نہ کر سکے۔ خالدہ ہمہ وقت اپنا وکیل ساتھ رکھتی تھی کیونکہ لڑائی جھگڑا و دیگر مقدمہ جات اس کے لیے معمول کی بات تھی۔ آصف چوہان ایڈووکیٹ ٹرسٹ کالونی میں رہتے تھے اور میرے محلے دار تھے۔ ان کے ساتھ اچھی علیک سلیک تھی۔ میں نے اُن سے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے کہا دیکھیں چوہان صاحب یہ خاتون جیسی بھی تھی ہمیں اب اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا حکمِ قرانی ہے کہ کسی پر احسان کر سکتے ہو تو ضرور کرو اس کا صلہ میں دوں گا۔ اب احسان کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں اس میت کی تدفین عزت و احترام کے ساتھ اسلامی طریقہ کار کے مطابق کروں گا اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ میں آپ سے متفق ہوں اور آپ کے ساتھ کھڑا ہوں، مجھے بتائیں کہ کام کہاں سے شروع کیا جائے۔

میں نے کہا کہ پہلے میت کی تلاشی لے کر اس کے اثاثہ جات کی لسٹ بنا کر میڈیکل افسر سے سائن کروالیں اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی بنوالیں کیونکہ ہم دونوں کا میت سے کوئی دنیاوی تعلق نہیں ہے اس لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی۔ وہ خود وکیل تھے بولے کہ آپ درست فرماتے ہیں۔ بذریعہ نرس میت کی تلاشی لی گئی۔ صرف ۷ اروپے کل اثاثہ تھے وہ بھی تکیے کے نیچے ہونے کی وجہ سے بچ گئے۔ نرس اور وارڈ کے رجسٹرار کے مطابق جب مریضہ کے دل کی حرکت بند ہوئی تو الیکٹرک شاک لگانے کے لیے اس کے سونے کے کنگن اور گلے کی چین اتاری گئی۔ اس وقت اس کا بیٹا آفتاب موجود تھا۔ اُسی نے دونوں چیزیں اتاریں اور خالدہ کے پرس میں رکھیں۔ اس کے بعد وہ پرس سمیت غائب ہوگیا۔ پھر اس کی شکل میت کی تدفین تک کسی نے

نہیں دیکھی۔ میں نے آصف چوہان صاحب سے کہا کہ آپ میت لے جانے کے لیے ضابطے کی کارروائی کریں میں ایمبولینس لے کر آتا ہوں۔ میں نے سب سے پہلے میت کو ڈھانپنے کے لیے ایک سفید چادر کا انتظام کیا پھر ایمبولینس والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے امراضِ قلب وارڈ پہنچ گیا۔ چوہان صاحب بھی ضروری کارروائی کر کے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے چادر میت پر دے دی اور وارڈ بوائے کی مدد سے سٹریچر کے ذریعے میت کو ایمبولینس تک پہنچا دیا۔

جب میت محلّہ سادات پور پہنچی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ خالدہ فوت ہوگئی ہے۔ عجیب سماں تھا۔ ایک ویرانی اور خوف کی فضا چھا گئی۔ محلے کی خواتین اپنے کیواڑوں سے جھانکتی اور پوچھتیں کیا سنارن فوت ہوگئی؟ ہاں میں جواب ملنے پر کیواڑ ایک جھٹکے سے بند ہو جاتے۔ پورے محلے میں نہ تو کوئی آدمی نظر آیا نہ کوئی عورت۔ ایک پراسرار خاموشی تھی۔ بہت منت سماجت کے بعد ایک عورت کو میت کو غسل دینے کے لیے راضی کیا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے کنبے کی کچھ عورتوں کو ساتھ لے آئی۔ تمام سامان برائے تیاری میت مع کفن میں نے فوراً ہی بازار سے لا دیا۔ آصف چوہان صاحب ون یونٹ قبرستان تشریف لے گئے اور گورکن کو قبر تیار کرنے کا کہہ آئے۔ ان دنوں شدید سردی تھی۔ مغرب کے بعد بازار اور گلیاں ویران ہو جاتی تھیں۔ کئی آزمائشوں کے بعد آخر کار ہم دونوں جنازہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ میں نے اور چوہان صاحب نے ایمبولینس کے ڈرائیور اور کلینر کی مدد سے میت کو گاڑی میں رکھا اور مرحومہ کی زبانی وصیت کے مطابق مسجد فقہ جعفریہ المعروف شیعہ والی مسجد واقع محلّہ چاہ فتح خاں جا کر میت مسجد کے صحن میں رکھ دی۔ اب عجیب منظر تھا۔ میت مسجد کے صحن میں پڑی تھی اور ہم گلی میں سے گزرنے والوں سے جنازہ پڑھنے کے لیے منت سماجت کر رہے تھے۔ کسی نے صاف انکار کر دیا، کسی نے کہا میں تو سنی العقیدہ ہوں اس لیے شیعہ مسجد میں ایک شیعہ عورت کا جنازہ کیوں پڑھوں۔ کسی نے کہا وضو کر کے آتا ہوں۔ کسی نے کپڑے ناپاک ہونے کا بہانا بنایا۔ میری نظر میں کوئی بھی میت شیعہ یا سنی نہیں ہوتی۔ ایک انسان اپنے سفرِ آخرت پر جا رہا ہوتا ہے اس کو باعزت طریقے سے فرمانِ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مطابق رخصت کرنا چاہیے۔ باقی معاملات میت اور اس کے مالک کے درمیان ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں ایسے نفاق پھیلانے اور مذہب کو نقصان پہنچانے والے؟" شرم ہم کو مگر نہیں آتی"۔ خود بے علم ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھنے والے مذہبی جھگڑے پیدا کر کے غیر مسلموں کو مذاق اڑانے اور طنز کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مذہبی

بھیڑیے بن کر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی امامت میں نماز جائز نہیں کیونکہ اس کا مسلک ٹھیک نہیں۔ فلاں میں یہ کمی ہے، فلاں کافر ہے وغیرہ وغیرہ لیکن انہیں اپنا پتا نہیں کہ خود کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ میں اس قسم کی خرافات سے بہت دور ہوں۔ ہر مسجد میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔ کسی مسلمان کو کافر نہیں سمجھتا اور ختمِ نبوت کا پروانہ ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر مسلمان مرتد ہو جاتا ہے۔ سُنی، شیعہ، وہابی، دیوبندی، بریلوی، ایسے لوگ جو ختمِ نبوت پر یقین کامل اور ایمانِ کامل رکھتے ہیں۔ خواہ کوئی بھی ہوں، میں ان سب کو مسلمان مانتا ہوں۔ ان کے درمیان جو بھی تضادات ہیں وہ ان کے دماغوں کا فتور ہے۔ وہ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ لوگ حکومتِ وقت اور اپنے پیارے وطن پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کر کے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دشمن کی یہ للکار ہے کہ پاکستان مذہب کے نام پر قائم ہوا تھا ہم اسے مذہب کے نام پر ہی ختم کریں گے۔ (نعوذ باللہ۔۔۔ ان کے منہ میں خاک)۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین!

تقریباً دو گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد ہم آٹھ لوگ جمع کر سکے، چار ہم تھے۔ کل بارہ لوگ ہو گئے۔ مولوی صاحب کو بھی پیسوں کا لالچ دے کر لے آیا۔ جنازہ کی نیت کرنے سے پہلے انہوں نے باآواز بلند پوچھا کہ جنازہ سُنی طریقہ سے پڑھایا جائے گا یا فقہ جعفریہ کے طریقے کے مطابق؟ میں نے کہا اللہ کے واسطے جنازہ پڑھائیں جو بھی طریقہ اختیار کریں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ میت پھر بھی ہم چاروں نے ہی ایمبولینس میں رکھی۔ دیگر کسی مسلمان نے ہاتھ نہیں لگایا۔ میت لے کر جب ہم قبرستان پہنچے تو گھپ اندھیرا تھا۔ دراصل رات کا ایک بج چکا تھا اور اُن دنوں ہتھوڑا گروپ کی وارداتیں ہو رہی تھیں، شہر میں خوف کی ایک لہر تھی۔ قبرستان میں داخل ہو کر ہم نے بہت آوازیں دیں۔ ہمارا خیال تھا کہ گورکن وغیرہ ہمارے انتظار میں ہوں گے لیکن یہاں صرف اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے آخر ایک تازہ کھودا ہوا گڑھا تلاش کر لیا۔ میں نے پھر آوازیں دیں کہ کیا کوئی ہے؟ قبرستان کے بالکل آخر میں جو راستہ ون یونٹ کالونی کی طرف جاتا ہے۔ اس گلی کے دائیں بائیں جو مکانات ہیں ان کی کھڑکیاں قبرستان کی طرف کھلتی ہیں۔ میرے آوازیں دینے پر ایک کھڑکی میں روشنی ہوئی تو میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کھڑکی تک جا پہنچا اور پھر آواز دی۔ ایک ٹارچ کی لائٹ میرے چہرے سے ٹکرائی اور ایک مردانہ آواز نے سرائیکی میں کہا ارے آپ! خیریت تو ہے؟ میں

نے کہا آپ باہر آئیں تو بتاتا ہوں۔ وہ شخص اور اس کے ساتھ دو لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے اور کلہاڑی پکڑے باہر آ گئے۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ یہی گورکن ہیں۔ استفسار پر وہ بولے کہ قبر تیار ہے۔ وہ ٹارچیں اور دو لالٹین لے آئے۔ ہم سب نے مل کر جنازہ ایمبولینس سے قبرستان منتقل کیا۔ جیسے ہی جنازہ ایمبولینس سے نکالا گیا ایمبولینس کا کلینر جو ایک 17/18 سال کا لڑکا تھا بے ہوش ہو کر گر گیا۔ غالباً۔ رات کے وقت وہ قبرستان کی خاموشی سے دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈرائیور کو کرایہ دیا اور اسے کہا کہ اس لڑکے کو جلدی سے ہسپتال کے شعبہ حادثات میں لے جائے۔

میں واپس قبر تک پہنچا تو لالٹین اور ٹارچوں کی روشنی میں دیکھا کہ قبر اتنی چھوٹی تھی جیسے 12/13 سال کے بچے کی ہو۔ میں نے ناراضگی سے گورکنوں سے کہا کہ ہم نے اس میت کو عزت واحترام سے دفنانا ہے۔ گڑھے میں زبردستی ٹھوسنا نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اپنی کسی بزرگ خاتون کو دفن کرتے تو کیا ایسی قبر تیار کرتے؟ پھر میں نے آصف چوہان صاحب سے کہا کہ آپ ان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں۔ ہم نے اتنی محنت کی ہے اور یہ آخری مرحلہ ہے اس لیے ہمت نہیں ہارنی۔ ہر مرحلہ خوش اسلوبی اور قدرت کے طریقہ کار کے مطابق طے کیا جائے گا۔ وہ آہستہ سے انگریزی میں بولے کہ میں ہر طرح سے آپ سے متفق ہوں۔ خالدہ ایک بڑے ڈیل ڈول کی عورت تھی اس لیے قبر نئے سرے سے کھدوائی گئی۔ ہر طرح سے ہر معیار پر رکھی گئی۔ پھر میت کو میں نے اور آصف چوہان نے گورکنوں کی مدد سے لحد میں اتارا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ کفن پیٹ کے مقام سے خون میں تربتر ہو چکا تھا۔ غالباً ناسور پھٹ چکا تھا۔ میں نے گورکنوں کو قبر جلدی بند کرنے کی تاکید کی۔ مرحومہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ باندھ کر التجا کی تھی کہ چاہے کفن نہ ڈالیں مگر اس کو جلدی دفنا دیا جائے، قبر بند کر دی گئی۔ میں نے خود دعا کروائی۔ ہم سب نے مل کر دعائے مغفرت کی۔ آخر میں قبر پر چھڑکاؤ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ خالدہ میں نے تم سے زیادہ بدنصیب کوئی نہیں دیکھا۔ تمہارے پانچ کڑیل جوان بیٹے ہیں مگر کوئی تمہاری زیارت کو بھی نہیں آیا۔ مگر میں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ درخت سے توڑی ہوئی سبز شاخ قبر پر رکھ دی اور کہا کہ اب تم اللہ تعالیٰ کے حوالے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے آنسو آنکھوں سے ٹپک کر اس کی قبر کی مٹی میں جذب ہو گئے۔

۔۔۔انا اللہ وانا علیہ راجعون۔۔۔

اس دن کے بعد سے آج تک میں نے اس کے بیٹوں کی شکل نہیں دیکھی۔ سنا ہے کہ سوائے مشکور کے

سب ہی ہیروئن کی نذر ہو گئے اور اپنی اپنی قبروں میں جا سوئے۔ بہاولپور کے ایک نامور وکیل محمد افضل باجوہ جن کا دولت خانہ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے ہوا کرتا تھا، ان کی قبرون یونٹ قبرستان کے وسط میں واقع ہے۔قبر پران کے نام کا تعویز بھی لگا ہوا ہے۔ان کے پہلو کی طرف جو کچی قبر ہے وہ خالدہ کی ہے۔

یہ مضمون پڑھنے والے قارئین سے گزارش ہے کہ خالدہ کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں اور دعائے مغفرت فرماتے ہوئے خالدہ کے کردار کو ذہن میں نہ رکھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احسان کرنے کے حکم کو ذہن میں رکھیں۔ میں اپنی نظم باعنوان ’’قبر سے فریاد‘‘ کو خالدہ کے نام منسوب کرتا ہوں۔

قبر سے فریاد

اے راہرو! تحفہ دعائے مغفرت دیتا جا
آج میں محتاجِ دعا ہوں کل تو بھی ہو گا

جیسا تو آج ہے کل میں بھی ویسا ہی تھا
جیسا میں آج ہوں، تو بھی کل ایسا ہی ہو گا

آج میں رزق خاک و عبرتِ عام ہوں
رحم کر ہاتھ اٹھا کہ تو بھی کل طالبِ دعا ہو گا

آفتاب

پانچواں باب

تم دیکھنا یہ کتے کی موت مرے گا!

(انسانی فطرت کے مختلف پہلو آشکار کرتی ایک بصیرت آموز کہانی)

1953/54 کے لگ بھگ صادق آباد، ضلع رحیم یار خان میں ایک نمازی پرہیزگار حاجی صاحب جو کہ ضلع ہوشیار پور، انڈیا سے ہجرت کر کے آئے تھے رہائش پذیر تھے۔ اُن کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا واجبی سا پڑھا لکھا، بہت محنتی، حسن پرست لیکن شریف النفس انسان تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا میراں شاہ میں قرآن پاک حفظ کر رہا تھا۔ اور منجھلا بیٹا جس کا نام عبدالمالک تھا، میٹرک پاس لیکن FA سے بھاگا ہوا ایک ناکام انسان تھا۔ اُس زمانے میں میٹرک بھی بہت تعلیم ہوتی تھی اور گورنمنٹ کی اچھی خاصی نوکری بھی مل جاتی تھی۔ لیکن موصوف ایک پرائمری سکول ٹیچر کی آسامی پر تعینات تھا۔ مالک کی طبعیت میں کوے کی سی چالاکی، لومڑی کی سی عیاری اور گیدڑ کی سی بزدلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ منافقوں کا سردار تھا۔ لہذا جلد ہی نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ چھوٹی موٹی ٹھگی، لڑائی جھگڑا، مقدمے بازی، غرض کوئی بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ تھا۔ سرکاری جگہ پر قبضہ کر کے لکڑی کا کھوکھا لگالیا اور چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا۔ اپنے بڑے بھائی کو اپنی لن ترانیوں سے بڑے بڑے خواب دکھائے۔ وہ بیچارہ اپنی بے روزگاری کی وجہ سے اس کھوکھا نما دکان پر بطور سیلز مین بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ کچھ دن تو آرام اور سکون رہا لیکن ایک دن پولیس آدھمکی اور لگی تلاشی لینے۔ بہت تلاش بسیار کے بعد لکڑی کے کھوکھے کے خفیہ خانوں سے افیون برآمد ہوئی۔ اور بڑے بھائی صاحب گرفتار ہو گئے۔

قارئین کرام کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ افیون ان دنوں سرکاری طور پر لائسنس یافتہ ٹھیکیداروں کے توسط سے ایک محدود تعداد میں محکمہ آبکاری کی سخت نگرانی میں فروخت کی جاتی تھی۔ افیون اور بھنگ کا ٹھیکہ الگ ہوتا تھا اور اس دکان کو افیون کا ٹھیکہ کہا جاتا تھا۔ شہر میں یہ جگہ بہت مشہور ہوتی تھی اور ہر کس و ناکس اس جگہ سے واقف تھا۔ افیون کے ٹھیکیدار کو اس کے لائسنس کے حساب سے محکمہ آبکاری قیمت وصول کرنے کے بعد افیون اور بھنگ سپلائی کرتا تھا اور اپنی کڑی نگرانی بھی رکھتا تھا۔ ٹھیکیدار اور سرکاری اہلکاروں کو ہر افیونی اور

بھنگی کے کوائف معلوم ہوتے تھے کہ وہ کہاں رہتا ہے، کیا کام کرتا ہے، کتنی افیون استعمال کرتا ہے۔ (یہاں یہ واضح کر دوں کہ ہر افیون کھانے والے کو افیونی اور بھنگ پینے والے کو بھنگی کہا جاتا تھا)۔ کبھی کبھار کسی افیونی کے مہمان آ جاتے تو وہ زیادہ افیون خریدنا چاہتا تو اس کو بتانا پڑتا کہ اس کے مہمان کہاں سے آئے ہیں اور کتنے دن قیام کریں گے۔ ٹھیکیدار اور محکمہ اگر مطمئن ہوتے تو موجودہ مقدار سے زیادہ افیون جاری کر دی جاتی وگرنہ نہیں! یہاں تک بھی سخت نگرانی کی جاتی کہ اگر ایک ریگولر افیونی روزمرہ کی خوراک سے کم افیون خرید کر رہا ہے یا کوئی افیونی غائب ہے اور افیون خریدنے ٹھیکے پر نہیں آ رہا تو خفیہ طور پر اس کا پتہ کرایا جاتا اور دیگر افیون استعمال کرنے والوں سے اس کی مخبری کرائی جاتی کہ آج کل وہ افیون کس جگہ سے خرید کر رہا ہے۔ ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد اس افیونی کو محکمہ آبکاری شک کی بنیاد پر گرفتار کر کے اپنے ساتھ تفتیشی مرکز لے جاتا اور اس سے معلومات لی جاتیں کہ وہ آجکل افیون کہاں سے خرید کرتا ہے؟ تھرڈ ڈگری کا بے دریغ استعمال کرنے پر وہ طوطے کی طرح تمام حالات بیان کر دیتا اور پھر عملہ آبکاری اور پولیس مشترکہ طور پر چھاپہ مار کر غیر قانونی افیون فروخت کرنے والوں کو گرفتار کر لیتی اور تمام افیون یا دیگر نشہ آور اشیاء بحق سرکار ضبط کر لی جاتیں۔ مالک کی چالاکی دیکھیں غیر قانونی افیون فروخت کرنے کے لیے اپنے بڑے بھائی کو بھی بے خبر رکھا اور وہ شریف اور بے گناہ ہونے کے باوجود دھر لیا گیا۔

پولیس نے تمام مال برآمد کر لیا، کھوکھا سیل کر دیا گیا اور کچھ عرصے بعد میونسپل کمیٹی نے وہ کھوکھا بھی اٹھا دیا اور اپنی جگہ واگزار کروالی۔ مالک کو اس نقصان اور بے عزتی کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ اس نے پھر وہی ٹھگی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ مالک کوئٹہ جاتا اور وہاں سے سامان لا کر فروخت کرتا جس میں نشہ آور آئٹم بھی ہوتے تھے۔ اس طرح اُس کے پاس کچھ رقم جمع ہوگئی۔ کوئٹہ آنے جانے سے اس کی ملاقات انٹرنیشنل روٹ پر سفر کرنے والوں سے بھی ہوگئی اور آخر کار یہ بھی By Road لندن جا پہنچا۔

اُن دنوں لندن جانے کو پاکستان میں بہت بڑی بات سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی لندن پلٹ آ جاتا تو لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے آتے۔ لندن سے آنے والا جو بھی بکواس کرتا چلا جاتا لوگ مانتے چلے جاتے۔ لندن جا کر پیسہ کمانے اور میموں سے دوستی رچانے کو سب ہی تیار ہو جاتے۔ وہ خواب دیکھتے کہ شاید لندن پہنچتے ہی انھیں نوکری بھی مل جائے گی اور میم بھی خود ہی چل کر اُن کے پاس پہنچ جائے گی اور کہے گی کہ میں تو تمہاری دیوانی ہوگئی ہوں اور اب تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی، میری کار، بنگلہ اور چیک بک آج سے

سب تمھارا ہے۔ ہر لندن پلٹ جب واپس آتا تو لوگ اس سے یہ سوال ضرور کرتے کہ تم وہاں کیا کرتے ہو؟ اگر وہ لندن میں اخبار فروخت کرتا آیا ہے تو وہ کہتا کہ اُس کی نیوز پیپرز ایجنسی ہے۔ اگر چوکیداری کرتا آیا ہے تو وہ اپنے آپ کو سیکورٹی آفیسر بتائے گا۔ اگر وہ پلمبر، الیکٹریشن، لوہار، کارپینٹر، مکینک، سوئیپر یا دیگر ٹیکنیکل کام کرنے والا ہے تو خود کو انجینئر بتائے گا۔ اگر کسی کے پاس درزی کا کام کرتا ہے یا گھر پر مشین رکھ کر لیدر جیکٹس اور دیگر Outfits کی سلائی کرتا ہے تو وہ کہے گا کہ میں نے اپنی چھوٹی سی فیکٹری لگائی ہوئی ہے۔ اس قسم کی بکواس سن کر بھولے بھالے لوگ تو متاثر ہوتے ہی ہیں شاطر لوگ بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہاں تو یہ آوارہ گردی کرتا تھا، گلیوں میں پھرتا تھا، روز لڑائی جھگڑے میں ملوث ہو کر مار کھاتا تھا اور اس کے خلاف کیس رجسٹرڈ تھے، اب یہ شہزادہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح ایک دوڑ ملک سے باہر جانے والوں کی شروع ہوگئی جو آج تک جاری ہے اور ہزاروں لوگ باہر جانے کے چکر میں اپنے جانوں سے کھیل گئے اور اربوں روپے انسانی سمگلروں نے لوگوں سے لوٹ لیے۔

مالک نے لندن پہنچ کر پہلے مزدوری کرنا شروع کی، قدم جمائے، شراب پی اور نائٹ کلب جانا شروع کیا۔ گرل فرینڈز سے آشنائی ہوئی۔ دیگر تمام خرافات، جعلی عکس اور مفروضوں پر قائم پروگرامِ زندگی پر عمل کرتا رہا۔ جس میں کبھی فائدہ ہوا اور کبھی نقصان۔ اسی دوران اس کی ملاقات اقبال نامی ایک پاکستانی سے ہوگئی۔ وہ بھی صادق آباد کے رہائشی چوہدری برکت کا بیٹا تھا اور اسی قماش کا تھا لیکن ایک معیار رکھتا تھا۔ چھوٹی موٹی ٹھگی سے بہت دور رہتا تھا۔ Intellectual فراڈ کا ماہر اور ایک قابل انسان تھا۔ مدِ مقابل کو اپنی گفتگو سے متاثر کرتا تھا اور لندن میں پاکستانی تاجر کے طور پر مشہور تھا۔ مالک کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات حادثاتی تھی، دوسری اتفاقی تھی، تیسری چوتھی ملاقاتیں بعد میں دوستی میں بدل گئیں۔ اقبال نے لندن میں بہت ترقی کی۔ اس وقت کے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ولسن اسکے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ اس نے وحیدہ رحمان انڈین ایکٹرس پر بھی ڈورے ڈالے۔ وہ بھی اس کی دوستی کا دم بھرنے لگی۔ مالک بھی ان کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ گمان غالب ہے کہ اس معاشقے میں چھوٹے کا کردار مالک ہی ادا کرتا تھا۔ لیکن وحیدہ رحمان جلد ہی دونوں کی اصلیت، ذہنیت اور مقاصد جان گئی اور اپنا پلو بچا کر نکل گئی۔ ان کو بھی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہندو، سکھ، گوری، کالی۔۔۔سب سے تھی ان کی یاری! وقت گزرتا گیا۔ جلد ہی مالک کو British Nationality مل گئی اور برٹش پاسپورٹ بھی۔ صادق آباد ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا پہچانتا تھا۔ مالک کی بہت مشہوری ہوگئی کہ لندن میں بہت مال کما رہا ہے اور بالکل بدل گیا

ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ خود مالک نے اپنے لفنٹر دوستوں کو بذریعہ خطوط لکھا جنہوں نے اپنا فرض سمجھ کر اس خبر کو خوب اچھالا۔ اپنے ہر دوست کو اُس نے چکر دے رکھا تھا کہ میں تمھیں اپنے ساتھ لندن لے کر جاؤں گا۔ تم بس تیاری رکھنا، پاسپورٹ اور زادِ راہ اکٹھا کر لو۔ اس کے تمام دوست اپنے اپنے وسائل اور حیثیت کے مطابق تیاری کر رہے تھے۔

آخر ایک دن مالک صاحب برٹش نیشنل کے طور پر دو گاڑیوں میں By Road لندن سے صادق آباد پہنچ گئے۔ لندن سے آتے ہوئے سامان کے ساتھ ساتھ سواریاں بھی لے کر آئے، جن سے کرایے کے طور پر ہزاروں روپے وصول کئے گئے۔ دونوں گاڑیاں ویگن کی طرح کی تھیں۔ ہر ایک گاڑی میں 20 مسافر آ جاتے تھے۔ سامان چھت پر لگے جنگلے پر باندھا جاتا تھا۔ غالباً 1962/63 کا زمانہ تھا۔ مالک کی واپسی کی پورے شہر صادق آباد میں دھوم مچی تھی۔ لوگ آ رہے تھے، رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، اپنے اپنے نالائق بیٹوں کا رونا رو رہے تھے اور مالک صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کر رہے تھے کہ اُن کے نکمے اور نکھٹو بیٹوں کو بھی ساتھ لندن لے جاؤ۔ بس پھر کیا تھا۔ چلو چلو لندن چلو کا نعرہ گونجنے لگا اور بکنگ شروع ہو گئی۔ لندن جانا تو مقدر کا کھیل تھا، بکنگ کر کے رقم جمع کرنے میں کیا ہرج تھا۔ مالک صاحب کے پاس بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں تھا۔

آخر کار ایک حادثہ ہو گیا۔ وہ یہ کہ مالک کو اُس شخص نے اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا جو یہ کہا کرتا تھا کہ اگر مالک ہاتھ ملائے تو فوراً اپنی اپنی انگلیاں گِن لینی چاہئیں۔ دوسری طرف ان کی سپتری نے بھی ہاں کر دی جو FA تک تعلیم یافتہ تھی اور اپنے آپ کو بے حد خوبصورت تصور کرتی تھی۔ بہت ناز نخرہ تھا اور پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ مالک کی پوری فیملی کے سخت خلاف تھی۔ ہائے رے لندن تیرے کمالات، تیری چمک، تیری سج دھج، تیرے جھوٹے مفروضے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دور کے ڈھول سہانے۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ کچھ روز قیام کے بعد مالک اپنی سواریوں سمیت لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔ کچھ لوگ ساتھ چلے گئے کچھ رہ گئے لیکن رقم سب کی ساتھ لے گیا۔۔۔ کسی کو وعدۂ فردا اور کسی کو وعدۂ دی روز۔ لندن جا کر لوگوں کو آٹے دال کا بھاؤ پتہ چلا۔ جب فیکٹریوں میں ڈبل شفٹ کام کرنا پڑا اور دیگر مصیبتیں الگ جھیلنا پڑیں اور یہ راز بھی کھل گیا کہ مالک کی دونوں گاڑیاں سکھوں کی ملکیت ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد دلہن کے کاغذات بھی بن گئے اور وہ بھی لندن آ گئیں۔

لندن آ کر اُن کے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے مگر اب کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ اکثر

حالات وواقعات کی وجہ سے آپس میں جھگڑا رہتا تھا۔ یہ کس قماش کا تھا وہ پہلے سے جانتی تھی لیکن اب تصویر کے دونوں رُخ اس کے سامنے تھے۔ جیسے تیسے وقت گذرتا گیا۔ بچے پیدا ہوتے گئے اور نازنخرے والی تین بچوں کی ماں بن گئی۔ چند سال بعد وہ بھی پاکستان اپنے والدین سے ملنے آئی۔ یہ لوگ لندن پاکستان آتے جاتے رہے۔ مالک ایک بار پھر By Road پاکستان آیا۔ اس بار اس کے پاس ایک انگلش کار Zodiac تھی۔ یہ ایک بڑی 6 سلنڈر کار تھی۔ کچھ عرصہ اس نے پاکستان میں گذارہ اور بیوی بچوں کو پاکستان ہی چھوڑ کر خود لندن کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن جانے سے پہلے یہ بہاولپور آیا اور کچھ روز بہاولپور میں قیام کیا۔ اس دوران اس کی مصروفیات کافی مشکوک رہیں جس کا راز بعد میں کھلا۔

بہاولپور میں مالک نے اپنے ایک دوست کے توسط سے بیکانیری گیٹ کے اندر ایک ہوٹل کے مالک پٹھان سے چرس خریدی۔ ایک کاریگر سے گاڑی کی ٹینکی کٹوا کر چرس اس میں چھپائی اور مع اپنے دوست کے عازمِ سفر ہوا۔ جب یہ لوگ افغانستان پہنچے تو مالک کا دوست اپنی بیٹی کی علالت کی وجہ سے کابل سے By Air لندن چلا گیا اور مالک دیگر سواریوں کو لے کر کابل سے ہرات اور یوسف آباد کا بارڈر پار کرتے ہوئے ایران میں داخل ہوگیا۔ دورانِ سفر کار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور مالک ایرانی پولیس سے الجھ پڑا۔ پولیس کو بطور برٹش نیشنل دھمکیاں دینے لگا۔ مگر ایرانی پولیس نے کسی دھمکی کی پرواہ نہیں کی۔ بڑی تفصیل سے گاڑی کی تلاشی لی اور چرس برآمد کرلی۔ جوتے مارے اور سب کچھ اُگلوالیا۔ قانونی کاروائی کے بعد جیل بھجوا دیا گیا۔ دیگر سواریاں روتی پیٹتی بسوں میں RCD روڈ سے ترکی، جرمنی، فرانس اور لندن کے لیے روانہ ہو گئیں۔ ان دنوں ایران، ترکی، جرمنی اور برطانیہ کا ویزا پوائنٹ آف انٹری سے مل جاتا تھا۔ دیگر کمیونسٹ بلاک کا ٹرانزٹ ویزا بھی ضروری فیس اور انشورنس کرانے کے بعد مل جاتا تھا۔ صرف فرانس کا ویزا لینا پڑتا تھا جو جرمنی کے فرانسیسی سفارت خانے سے مل جاتا تھا۔

کچھ دن بعد جیل سے پہلا خط اس نے اپنی بیوی کو لکھا کہ کار کا ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے میں جیل میں ہوں۔ فی الحال یہیں رہنا پڑے گا، میرے لیے دعا کرنا۔ مگر دو تین روز کے بعد ہی اخبار میں یہ خبر شائع ہوگئی۔ دوسری طرف ایرانی پولیس نے برٹش ایمبیسی تہران سے رابطہ کر کے ملزم کے تمام کوائف ایمبیسی کو فراہم کیے۔ پاسپورٹ پر دیے گئے ایڈریس پر لندن میٹروپولیٹن پولیس کے ذریعے تحقیقات کروائی گئیں تو تمام راز طشت از بام ہوگئے۔ جس پر انہوں نے قانونی کاروائی کرتے ہوئے مشہد سنٹرل جیل کے نارکوٹکس سیل میں بھیج دیا جہاں اس قسم کے ملزم رکھے جاتے تھے۔ بذریعہ خط وہ اپنی بیوی کو مجبور کرتا رہا کہ میری مدد

کی جائے اور مجھے ہر مہینے خرچے کے لیے رقم بھی بھجوائی جائے۔ مالک کے باپ نے صاف جواب دے دیا کہ میں غلط کام کرنے والے کے ساتھ نہیں ہوں۔ سسر نے بھی بے حد ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ تو پہلے بھی اس کے خلاف تھا لیکن لندن کی چمک دمک سے متاثر ہو گیا تھا۔

آخر جیل سے بہت غصے بھرا خط موصول ہوا کہ میری اس مصیبت میں تم نے بطور بیوی اور تمھارے والد نے بطور سسر میرا ساتھ نہیں دیا۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ جس دن پاکستان آ گیا سب سے پہلے تمھیں طلاق دوں گا۔ بیوی بھی بھڑ گئی اور خوب جلی کٹی لکھ کر بذریعہ ڈاک مراسلہ روانہ کر دیا کہ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو، میں اب بھی خوبصورت ہوں، تم مجھے طلاق دو میں دوسری شادی کر لوں گی۔ کافی عرصہ ایرانی پولیس نے چالان عدالت میں پیش نہ کیا۔ ضمانت ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ منشیات سمگل کرنے کی سزا موت تھی۔

وقت کے ساتھ یہ واقعہ پرانا ہوتا گیا۔ نانا نے بچوں کی کفالت اپنے ذمے لے لی تھی۔ بیوی نے اپنی سروس بطور سکول ٹیچر، جو وہ شادی سے پہلے کرتی تھی، پھر جوائن کر لی۔ اسی دوران مالک کی ہمشیرہ کی شادی شیخ محمد یحیٰی سے ہو گئی جن کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ یحیٰی صاحب کسی زمانے میں گجرات ڈسٹرکٹ کونسل کے ڈسٹرکٹ انجینئر رہے تھے۔ اُس وقت ڈسٹرکٹ کونسل کے چیئرمین فضل الٰہی چوہدری تھے۔ دونوں مرحومین کے آپس کے تعلقات بے حد اچھے تھے اور آخر تک رہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ پرانے لوگ رواداری سے کام لیتے تھے، تعلقات کا خیال رکھتے تھے اور حتیٰ الوسع کوشش کرتے کہ تعلقات کا لحاظ او احترام کیا جائے۔

مالک کی ضمانت کے لیے بہت کوششیں کی گئیں لیکن ایران کی ہر عدالت سے اس کی درخواست ضمانت خارج کر دی گئی۔ ہر آرڈر میں یہ لکھا ہوتا کہ اس کے جرم کی سزا موت ہے اس لیے لہٰذا اس کی ضمانت منظور نہیں کی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات سب کے لیے پریشان کُن تھی۔ ماں تڑپتی تھی، بہنیں بے حد پریشان تھیں۔ آخر کار ایک روز شیخ محمد یحیٰی صاحب نے اپنے دیرینہ دوست چوہدری فضل الٰہی، صدرِ پاکستان سے اُن کے سیکرٹری کے توسط سے ملاقات کا ٹائم مانگ لیا جو کہ بہت جلد مل گیا۔ یحیٰی صاحب نے تمام کتھا صدرِ پاکستان کو سنائی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولے کہ چیف جسٹس مشہد ہیں تو میرے دوستوں میں سے لیکن عدالتی معاملہ ہے اور ہے بھی سزائے موت کا، معلوم نہیں وہ کیا جواب دیں۔ لیکن پھر بھی میں آپ کو اُن کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ خود جا کر درخواست کریں۔ صدرِ پاکستان نے ازراہِ کرم اور تعلقات کو

تسلیم کرتے ہوئے بہت پرزور سفارشی خط لکھ دیا۔ یحییٰ صاحب ایوانِ صدر کی ہائی ٹی سے لطف اندوز ہوتے مع مراسلے کے کامیاب و کامران واپس آئے۔ گھر آ کر انہوں نے اپنی بیوی اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ بذریعہ کار حج پر جانے کا پروگرام بنایا اور عازمِ سفر ہوئے۔ سب سے پہلے مشہد گئے۔ صدرِ پاکستان کا خط چیف جسٹس صاحب کے سیکرٹری کے حوالے کیا اور خود انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد طلبی ہوئی۔ پہلے ناراضی کا اظہار کیا گیا پھر کچھ سوچ کر بولے کہ میں نے یہ کیس تقریباً فائنل کرلیا ہے۔ میں اس کو سزائے موت دینا چاہتا تھا کیونکہ یہ بہت قبیح جرم ہے۔ ساتھ ہی بولے کہ تم حج کر کے کب تک لوٹ آؤ گے؟ یحییٰ صاحب نے اپنا شیڈول بتایا جو کچھ دنوں کا ہی تھا۔ وہ بولے کے جاتے ہوئے مجھ سے مل کر جانا، میں دیکھتا ہوں کہ کیا کرسکتا ہوں۔ تاکہ میں اپنے دوست سے شرمندہ نہ ہوسکوں۔

یحییٰ صاحب کچھ سمجھے، کچھ نہ سمجھے اور عازمِ سعودی عرب ہوئے۔ چیف جسٹس صاحب سے مالک کی سزا کا عزم سن کر دونوں میاں بیوی بے حد پریشان تھے۔ حج سے فارغ ہوئے تو بھاگم بھاگ پھر مشہد پہنچے۔ اس بار ملاقات جلد ہوگئی اور چیف جسٹس مہربان بھی نظر آرہے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے اس کے لیے ملک بدری کا آرڈر کر دیا ہے اور خصوصی حکم دیا کہ مالک پاکستانی کو ابھی ابھی Produce کیا جائے۔ کچھ ہی دیر میں ایرانی پولیس ملزم کو ہتھکڑی لگائے عدالت میں حاضر تھی۔ جہاں کیس کی سرسری سماعت کرنے کے بعد پولیس کو حکم دیا گیا کہ ملزم کو جیل لے جا کر اس کا پاسپورٹ اور گاڑی واپس کی جائے اور ایرانی بارڈر پر لے جا کر ہتھکڑی کھول کر آزاد کر دیا جائے اور پھر کبھی ایران میں داخلے کی اجازت نہ دی جائے۔ پوری جیل پریشان ہوگئی اور سب قیدی یہ کہنے لگے کہ مالک پاکستانی رہا شُد۔۔ رہا شُد۔ سوائے چرس کے ہر چیز واپس کر دی گئی۔ مالک کو پولیس کی تحویل میں پاک ایران بارڈر پر لا کر رہا کر دیا گیا۔ یہ مالک کے لیے قدرت کا بہت بڑا انعام تھا مگر اُس نے اس کی قدر نہ کی۔

کیونکہ مالک کی رہائی ممکن نہیں تھی اور جیل میں بھی پہلی اور آخری ملاقات اسکی بہن اور بہنوئی کی آئی تھی جس کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا لٰہذا جیل والے اس سے بہت متاثر تھے کہ یہ کوئی بہت بڑی توپ چیز ہے۔ جیل میں اس کی دوستی ایک انڈین نژاد برٹش نیشنل سے ہوگئی جو کہ مذہب کے لحاظ سے ہندو تھا۔ ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ ذرا سا سہارا بھی اسے بہت آس امید دیتا ہے۔ دوستی تو ان کی پہلے سے ہی تھی کچھ وعدے بھی تھے کہ جو پہلے رہا ہوگا وہ دوسرے کی مدد کرے گا اور رہا کرانے کی کوشش کرے گا۔ اس ہندو نے مالک کو ایک خط لکھ کر دیا جو اس کی بیوی ریکھا کے نام تھا۔ وہ بھی برٹش نیشنل تھی۔ اس لیٹر میں اس نے

مالک کی تعریف لکھی کہ یہ میرا دوست اور دکھ سکھ کا ساتھی ہے اور اپنے ملک میں صدر تک سے تعلقات رکھتا ہے۔اس کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے اور مجھے رہا کرانے کے لیے یہ جو بھی کوشش کرے اس کا تمام خرچ برداشت کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مالک یہ خط لے کر پاکستان آ گیا اور اپنی پرانی ڈگر اختیار کی۔ کچھ لڑائی جھگڑے کے بعد بیوی اور سسرال سے صلح ہوگئی۔ والدین بھی بیچارے مجبور ہوتے ہیں وہ بھی مان گئے۔ صادق آباد میں اپنے والدین کے ساتھ ہی رہائش پذیر ہوگیا اور مستقبل کے منصوبے بنانے شروع کیئے۔

اسلام آباد برٹش ایمبیسی سے اپنا نیا پاسپورٹ بنوایا اور انڈیا چلا گیا۔ ریکھا سے ملاقات کی اور نہ جانے اس کو کیا سبز باغ دکھائے کہ وہ اپنے تمام زیورات اور رقم کے ساتھ، اپنی نئی کیپری کار میں بیٹھ کر، مالک کے ساتھ واہگہ کے راستے لاہور آ گئی۔ یہ اس کو لے کر پنڈی یحییٰ صاحب کے گھر چلا گیا اور کچھ عرصہ وہیں رہا۔ پھر اس کو لے کر لاہور آ گیا اور شہر شہر گھومتا ہوا صادق آباد آ گیا اور ریکھا سمیت اپنے والدین کے گھر قیام پذیر ہوا۔ ریکھا کی وجہ سے گھر میں پہلے کشیدگی ہوئی جو لڑائی کی صورت اختیار کر گئی۔ ریکھا کافی عرصہ پاکستان میں رہی۔ میں خود بھی ریکھا کو دیکھنے بہاولپور سے صادق آباد گیا۔ وہ ایک پڑھی لکھی خوبصورت خاتون تھی۔ مسکراتے چہرے سے گفتگو کرتی، حالاتِ حاضرہ، سیاست، فلمی دنیا، یا کسی بھی موضوع پر مدلل گفتگو کرتی۔ گفتگو بحث کی صورت اختیار کر جاتی تو وہ body talk سے کام لیتی۔ میں ریکھا سے مل کر متاثر ہوا لیکن اس کا مالک جیسے شخص کے چکر میں آ کر پاکستان آنا مجھے ایک آنکھ نہ بھایا اور مجھے اس سے زیادہ بدصورت اور بدقسمت کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔ آخر کار ریکھا کی کار اور تمام زیورات بِک گئے، اور وہ ناکام و نامراد لندن چلی گئی۔

اب مالک فارغ تھا۔ اس کے شیطانی دماغ میں اپنے والدین کی زرعی زمین اور مکان جس میں وہ رہائش پذیر تھے، ہتھیانے کا منصوبہ پنپنے لگا۔ اب وہ لندن نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس نے وہاں کئی فراڈ کیئے تھے اور خطرہ تھا کہ اگر وہ لندن جائے گا تو بینک اور لیزنگ کمپنیاں اس کے درپے ہو جائیں گی اور اس کو عدالتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اس نے اب پاکستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔

اس دوران اس کا چھوٹا بھائی لندن پہنچ چکا تھا، شادی بھی ہوگئی تھی اور بہت اچھا سیٹ بھی ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے والدین کو لندن وزٹ پر بلایا۔ والدین جو مالک کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے کافی پریشان رہتے تھے، اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس لندن چلے گئے۔۔ اب مالک آزاد تھا۔ اس نے اپنے والد کی زرعی زمین پر بھی جانا شروع کر دیا اور اپنے شیطانی ذہن میں پروگرام ترتیب دیتا رہا۔ آخر ایک دن اس نے اپنے

والد کے کمرے کا تالا توڑ کر وہاں سے اُن کا صندوق اٹھالیا۔ پھر اس صندوق سے جائیداد کے تمام کاغذات نکال لیے۔ ان کاغذات کی مدد سے اس نے جعلی طور پر تمام زمین اور مکان اپنے نام کروانے کے لیے جعلی اقرارنامہ بیع تیار کروالیا۔ زمین پر جو لوگ بطور مستاجر کام کرتے تھے ان کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ کسی کو جیل بھجوانا اور پھر پیسے لے کر اس کو رہا کروانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ عدالتی ٹاؤٹ اور پولیس ٹاؤٹ کے طور پر اس کا بزنس ترقی کرتا گیا۔ اتنے مقدمے کسی اچھے وکیل کے پاس نہ تھے جتنے اس کے پاس تھے۔ کسی کی پگڑی اچھالنا، کسی کی جائیداد پر قبضہ کرنا، جائیداد کے جعلی کاغذات تیار کرنا اسکے لیے معمولی بات تھی اور وہ بہت کامیابی سے یہ فل ٹائم بزنس کر رہا تھا۔

اس بزنس کی شروعات اس نے اپنے والد صاحب اور بڑے بھائی کی پراپرٹی سے کی تھی۔ زرعی زمین پر جا کر یہ کاشتکاروں سے لڑائی جھگڑا کرتا، انہیں مارتا پیٹتا اور کہتا کہ اب اس زمین کا مالک میں ہوں اور میرے حکم کے بغیر اگر کسی نے کوئی کام بھی کیا تو اس ک خلاف مقدمہ قائم ہوگا اور اسے جیل جانا پڑے گا۔ آخر کسی نے تنگ آ کر تمام حالات لکھ کر لندن اس کے والد صاحب کو بھیج دیئے۔ وہ فوراً واپس آ گئے۔ یہاں کے حالات بے حد پریشان کن تھے۔ اس نے اپنے والد سے بھی بدتمیزی شروع کر دی۔ انھیں پولیس اور مقدمے بازی کی دھمکیاں دینے لگا۔ ایک موقع پر ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ان کے خلاف مقدمہ قائم ہو گیا۔ پولیس آفیسر ایک ایماندار اور قانون کا احترام کرنے والا انسان تھا۔ اس نے کہا کہ بزرگوار! آپ تشریف لے جائیں اور کل عدالت سے ضمانت کروالیں، باقی مقدمے کو میں خود دیکھ لوں گا۔ اس طرح عزت بچ گئی۔ پولیس آفیسر نے مالک کو حوالات میں بند کیا اور اس کے خلاف کیس رجسٹرڈ کیا۔ پھر اس کو بے حد سمجھایا کہ تمھارے والد محترم ہیں۔ اب بھی وقت ہے معافی مانگ لو، میں ان سے تمھاری سفارش کروں گا کہ یہ بھی آپ کا بیٹا ہے، زمین میں اس کا جو بھی حصہ بنتا ہے اس کو ابھی اسی وقت دے دیں۔ مگر اس نے پولیس آفیسر کو جواب دیا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، تم نے میرے ملزم (والد صاحب) کو چھوڑ کر بہت زیادتی کی ہے اور مجھے حوالات میں بند کر دیا ہے۔ میں تمھارے خلاف قانونی کاروائی کروں گا۔ پولیس آفیسر نے طیش میں آ کر 8/10 جوتے مارے اور پھر حوالات میں بند کر دیا۔

حالات دن بدن خراب ہوتے گئے۔ ماں باپ اور بڑے بھائی کی عزت اور جان کو خطرات دن رات بڑھتے گئے۔ آخر تنگ آ کر لندن والے چھوٹے بیٹے نے اپنے والدین کو لاہور میں ایک مکان خرید کر دیا اور انہیں صادق آباد سے لاہور لے آیا تا کہ اس ضعیف العمری میں آرام وسکون کی زندگی بسر کریں۔ دوسری

طرف مالک کے بڑے بھائی نے عدالتوں اور تھانوں کے چکر لگا کر بے دریغ پیسہ خرچ کر کے تمام جعلی کاغذات ختم کرائے اور زمین دوسرے لوگوں کو ٹھیکے پر دے دی۔ لیکن مکان پر مالک ہی قابض رہا۔ اب وہ اپنے باپ اور بڑے بھائی کا جانی دشمن بن چکا تھا۔ زمین پر جانا، کاشتکاروں سے لڑنا، انہیں نئے نئے مقدمات میں پھنسانا اس کا محبوب ترین مشغلہ بن چکا تھا۔ اس دوران مالک کے والد صاحب نے اس کے خوف سے کچھ زمین فروخت کر دی اور مالک کے بڑے بھائی نے اپنی بیوی کی زمین بھی فروخت کر دی جو انہیں اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی۔ اس کی وجہ سے مالک اور طیش میں آ گیا۔

اپنے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ بنا کر مالک لاہور چلا آیا۔ پہلے اپنی بہن اور بہنوئی سے ملا جو راولپنڈی سے لاہور منتقل ہو چکے تھے۔ اسی آبادی میں 3/4 سٹریٹ چھوڑ کر وہ گھر تھا جہاں مالک کے والدین رہائش پذیر تھے۔ مالک بہن اور بہنوئی کو دھمکاتا رہا کہ آپ والد صاحب کو سمجھائیں کہ زمین میرے نام کر دیں ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ بہنوئی نے کہا کہ ہم سے غلطی ہوئی جو تمہیں برے انجام سے بچایا ورنہ تم اب تک انجام پذیر ہو چکے ہوتے۔ مالک جھگڑا کر کے مایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا اور رات کے کسی حصے میں اپنے والد کے گھر کی کمپاؤنڈ والی دیوار کود کر اندر داخل ہو گیا۔ اپنی والدہ کو کھڑکی سے آواز دے کر بولا کہ میں آپ کے لیے بہت اداس تھا اور آپ سے ملنے آیا ہوں۔ ماں تڑپ اٹھی اور اس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ والد صاحب دوسرے کمرے میں تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اس نے ماں سے کہا کہ میں اپنے والد سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ مجھے آپ کے سامنے شرم آتی ہے، والد مجھے ماریں یا ڈانٹ ڈپٹ کریں آپ نے باہر نہیں آنا۔ ماں کو کچھ تسلی سی ہو گئی کہ چلو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت عطا فرما رہے ہیں۔ ماں نے منہ سر چوما، دعائیں دیں اور کہا کہ جاؤ بیٹا باپ کے پاؤں پکڑ لو!

مالک نے ماں کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور باپ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ والد اس وقت مصلے پر بیٹھے زاروقطار روتے ہوئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ جب اس پر نظر پڑی تو چونک پڑے اور بہت حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گیا اور کچھ کاغذات نکال کر بولا کہ اس پر دستخط کر دیں اور جہاں دستخط کریں انگوٹھا بھی لگا دیں، یہ stamping pad ہے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کی منت کی کہ میں تمھاری وجہ سے صادق آباد چھوڑ آیا ہوں مجھے سکون سے یہاں رہنے دو اور یہاں سے چلے جاؤ، مجھے نہ دستخط کرنے ہیں نہ انگوٹھے لگانے ہیں۔ مالک نے ٹیبل لیمپ سے بجلی کی تار ایک ہی جھٹکے سے نکال لی اور بولا کہ آپ کو علم ہے کہ بجلی بولنے اور چلانے کی مہلت نہیں دیتی، آپ کے

مرنے کے بعد بھی تو یہ سب مجھے ملے گا، ابھی اپنے ہاتھ سے ہی مجھے دے دیں اور اپنی جان بچالیں۔ساتھ ہی اُٹھ کر ٹیبل لیمپ کا بٹن آن کر دیا۔وہ بزرگ اس وقت عمر کے لحاظ سے 85 کے پیٹے میں ہوں گے۔وہ خوف سے کانپنے لگے اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔اس نے غصے سے ان کا ہاتھ کھینچ کر انگوٹھے لگوا لیے اور پین ان کے ہاتھ میں دے کر نہایت غصے میں غرایا کہ یہاں دستخط کریں۔جہاں اس نے کہا انھوں نے دستخط کر دیے۔اور یہ وہاں سے باہر نکل گیا۔اپنی ماں سے بھی نہ ملا نہ ہی ان کے کمرے کا دروازہ کھولا جو بند کیا تھا۔

۸ بجے کے قریب دونوں بزرگوں کا ناشتہ اُن کی بیٹی کے گھر سے ایک آدمی لے کر آیا۔اُس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا جو ان بزرگوں کا نواسہ تھا۔جب کئی بار کال بیل دبانے پر بھی دروازہ نہ کھولا گیا تو اس آدمی نے بچے کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور دیوار پر چڑھا دیا۔بچہ اندر کود گیا اور گیٹ کھول دیا۔اندر کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے رونے گڑگڑانے کی آواز آرہی تھی۔کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ بزرگ جائے نماز پر بیٹھے ہیں، زاروقطار رو رہے ہیں اور تسبیح کا ورد کر رہے ہیں۔جب غور سے سنا گیا تو جو الفاظ سمجھ میں آئے وہ یہ تھے:۔۔۔اللہ کرے، یہ کتے کی موت مرے!۔۔۔اور یہ ورد بہت تیزی سے جاری تھا۔جب دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا گیا تو مالک کی والدہ گہری نیند سو رہی تھیں، جنہیں پھر ناشتے کے لیے اٹھایا گیا۔ناشتہ لانے والے آدمی نے پوچھا کہ تایا جان یہ آپ کیا ورد کر رہے تھے؟ تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور تمام واقعہ من و عن سنانے لگے اور پھر کہا ۔۔۔۔۔ تم دیکھنا یہ ضرور کتے کی موت مرے گا۔۔۔۔۔۔۔مالک کاغذات لے کر واپس آ گیا اور ان کی مدد سے پھر زمینوں پر قبضے کی کوششیں شروع کر دیں۔سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ اپنے بڑے بھائی کے مکان کی دیوار گرا دی اور اس کو اپنی رہائش والے مکان میں شامل کر لیا۔وہ مکان عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا۔وہ سب لوگ لندن چلے گئے تھے۔مالک کے والد نے کچھ زمین چاچڑ قبیلے کے لوگوں کو فروخت کر دی تھی۔وہ اب اس زمین کو کاشت کرتے تھے۔باقی زمین ان کے پاس لیز پر تھی۔

مالک نے ان لوگوں سے کئی بار لڑائی جھگڑا کیا، گالم گلوچ ہوئی، مقدمے کروائے، ایک دوسرے کو زخمی کیا لیکن انہوں نے زمین پر اس کا قبضہ نہ ہونے دیا کیونکہ انہوں نے اپنا سب کچھ فروخت کر کے وہ زمین اصل مالک سے خرید کی تھی۔3/4 سال مسلسل لڑائی ہوتی رہی۔کبھی چاچڑ قبیلے کے لوگ جیل میں ہوتے، کبھی عدالت میں پیشیاں بھگت رہے ہوتے۔وہ لوگ بھی زچ ہو چکے تھے۔انھوں نے اکٹھے ہو کر اس کو

سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ ہم نے یہ زمین تمھارے والد صاحب سے خرید لی ہے۔ہم جانیں تو قربان کر دیں گے لیکن زمین نہیں دیں گے۔اب بھی وقت ہے تم باز آ جاؤ۔ مالک نے جواب دیا کہ کل میں اپنی زمین پر قبضہ کرنے آوں گا،تم نے جو کرنا ہو کر لینا۔جب انسان کی بدقسمتی شروع ہوتی ہے تو پھر سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اس کی مدد نہیں کرسکتا۔اور پھر بزرگوں کی بددعا بھی تو پوری ہونی تھی۔آخر ایک روز اخبار میں یہ خبر چھپ ہی گئی۔۔۔

۔۔۔۔۔ مالک نامی ایک شخص رُوڑی کے ڈھیر پر مردہ پایا گیا جس کی لاش کو کتے نوچ رہے تھے۔۔۔۔۔۔

(رُوڑی: گوبر اور بستی کے گند کا وہ ڈھیر جس کو دیہاتی لوگ رُوڑی کہتے ہیں اور اس کو بستی کے باہر جمع کرتے رہتے ہیں۔پھر بطور کھاد اسے کھیتوں میں ڈالتے ہیں)

بعد میں جو حالات و واقعات سامنے آئے وہ کچھ اس طرح تھے۔دوسرے روز عصر اور مغرب کے درمیانی وقت مالک ایک شاٹ گن لے کر رقبے پر جا پہنچا۔پہلے اس نے ڈیرے پر قبضہ کیا، ہوائی فائرنگ کی، پھر کاشتکاروں کو جن کے قبضے میں زمین تھی گالیاں دیں۔زمین پر ٹریکٹر چلانے کی کوشش کی۔جس پر کچھ نوجوان لڑکوں نے آگے بڑھ کر اس کو پکڑ لیا اور بندوق چھین لی۔دھینگا مشتی میں بندوق چل گئی اور گولیاں مالک کو لگیں جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔کاشتکاروں نے اس کو ایک ٹانگ سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے بستی سے باہر رُوڑی کے ڈھیر پر پھینک دیا جہاں تمام رات لاش کو کتے بھنبھوڑتے رہے۔دوسرے روز دوپہر 2/3 بجے پولیس نے آ کر لاش کو قبضے میں لیا۔مئی جون میں گرمی کی وجہ سے لاش کا جو حشر ہوا ہوگا وہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

الیکٹرک شاک لگانے کی دھمکی دے کر کاغذات پر دستخط اور انگوٹھے لگوانے کے واقعے کے کچھ دن بعد ہی نیک اور تہجد گزار والد وفات پا گئے تھے لیکن یہ وِرد اُن کے ہونٹوں پر ہر وقت موجود رہتا تھا کہ۔۔۔۔۔تم دیکھنا یہ کتے کی موت مرے گا۔۔۔۔۔۔نعوذ باللہ من ذالک۔۔۔

چھٹا باب

اور۔۔بِن گو BINGO مر گیا

(ایک کتے کی کہانی جس کا واسطہ کسی انسان سے پڑ گیا تھا)

بہاولپور کی گرمی تو ویسے بھی بہت مشہور ہے اور میں مئی ۱۹۹۵ کی ایک دوپہر میں جب کہ درجہ حرارت ۴۹ ڈگری تک پہنچ چکا تھا، اپنے گھر واقع ملتان روڈ سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے بغداد الجدید کیمپس کی طرف کار بھگائے جا رہا تھا۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے کار کا AC بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ یعنی کہ ٹھنڈک برائے نام تھی۔ جب میں بغداد روڈ، رینجرز ہیڈ کوارٹر کے پاس سے گزر رہا تھا تو اچانک میری نظر بائیں طرف والے سڑک سے ملحقہ پارک پر پڑی جہاں ایک کتا لیٹا ہوا تھا اور بے تحاشا مکھیاں اُس پر بھنبھنا رہی تھیں۔ اچانک میں نے خود کلامی میں اپنے آپ سے کہا کہ یہ تو جرمن شیفرڈ لگتا ہے پھر میں سوچنے لگا کہ یہ کُتا لاوارث کیوں ہے اور اِس حالت میں پارک میں کیوں پڑا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کار واپس کرنے کا ارادہ کرلیا تا کہ پتہ کیا جا سکے کہ یہ کُتا کس کا ہے اور پارک میں اسے کون پھینک گیا ہے۔ اِسی ذہنی کشمکش کے دوران میں بغداد الجدید ریلوے اسٹیشن تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے وہاں سے گاڑی واپس ٹرن کی اور کتے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے غور سے کتے کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے اور تمام زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ کیڑے اُبل اُبل کر زخموں سے باہر گر رہے تھے جنہیں کوے مزے لے لے کر کھا رہے تھے جبکہ دیگر حشرات العرض بھی کتے کے زخموں پر دعوت اُڑا رہے تھے۔ میں نے مختلف زاویوں سے کُتے کا معائنہ کیا اور اپنے تجربے کے زور پر مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا سی دیر لگی کہ یہ کتا جرمن شیفرڈ کی خالص بریڈ سے ہے اور ہو نہ ہو یہ آرمی ڈاگ سینٹر کا کتا ہے مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی میرے ذہن میں آیا کہ یہ کتا ایسے یہاں کیوں پڑا ہے؟

میں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں تو پارک سے ملحقہ گھروں کی لائن کے ایک گھر پر نظر ٹھہر گئی

جس پر ایک بریگیڈئیر صاحب کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اِس کتے کا تعلق ضرور اسی گھر سے ہے۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج چکے تھے۔ گھر کے مکین اعتراض بھی کر سکتے تھے جبکہ سورج بھی سوا نیزے پر تھا اور اپنا قہر برسا رہا تھا۔ کتے کی تکلیف دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ نتائج کچھ بھی ہوں میں اس کتے کو لے کر جاؤں گا اور اس کا علاج کروں گا۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو ممکن ہے یہ بچ جائے، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے!

اسی جذبے کے تحت میں نے گھر کی کال بیل پر ہاتھ جا رکھا۔ ایک سے زیادہ بار کوشش کرنے کے نتیجے میں ایک خاتون نے باہر جھانکا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے سوال کیا کہ کیا یہ کتا آپ کا ہے؟ اس نے جواب سر ہلا کر ہاں میں دیا۔ میں پھر بولا کہ اگر کوئی آدمی گھر میں ہو تو باہر بھیج دیں، مجھے اُن سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ وہ خاتون واپس چلی گئی۔ میں پندرہ بیس منٹ انتظار کرتا رہا پھر ایک صاحب سفید شلوار قمیض میں باہر تشریف لائے۔ سلام دُعا کے بعد میں نے اس گرمی میں اُن کو تکلیف دینے کی معذرت چاہی۔ انہوں نے رسماً بڑی مشکل سے کہا کہ کوئی بات نہیں، آپ بتائیں کیسے آنا ہوا؟ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کا کتا قریب المرگ ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کو لے جا کر اس کا علاج کروانا چاہتا ہوں، شاید یہ بچ جائے۔ انہوں نے پہلا سوال کیا کہ آپ کے پاس اور کتے بھی ہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس لیبرا ڈاگ، جرمن شیفرڈ، ڈوبرمین وغیرہ ہیں۔ پھر انہوں نے میرا ایڈریس پوچھا، میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اُنہیں تھما دیا۔ وہ اندر چلے گئے اور مزید دس منٹ کے بعد باہر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ کتا آپ لے جا سکتے ہیں مگر اس کے خرچ اخراجات آپ خود کریں گے اور ہم سے کوئی کلیم نہیں کریں گے۔ میں نے طنزاً جواب دیا کہ وہ تو میں کتے کو یوں لاوارث اور مرنے کے قریب حد تک بیمار اور زخمی حالت میں پارک میں پڑے ہوئے دیکھ کر ہی سمجھ گیا ہوں کہ اب جو بھی کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اس شدید گرمی میں ان کے آرام میں مُخل ہونے پر دوبارہ معذرت کی۔ وہ سُنی ان سُنی کر کے جلدی سے گھر کے اندر واپس چلے گئے۔

میں فوراً حُسینی چوک میں ایک کریانہ کی دُکان پر گیا اور اس سے ۲۰ روپے کے عوض ایک خالی بوری خریدی پھر ایک آٹو رکشے والے سے ۱۰۰ روپے طے کرنے کے بعد اس کو کتے کے پاس لایا۔ ہم دونوں نے کتے کو زمین

سے اُٹھا کر بوری پر لٹایا اور بوری کو کتے سمیت آٹو رکشے پر لٹا دیا۔ میری کار کے پیچھے آٹو رکشہ نے اپنا سفر شروع کر دیا اور اس طرح میں اس کتے کو اپنے زیرِ تعمیر گھر میں لے آیا جہاں میں نے دیگر کتے بھی رکھے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے اس کے زخموں میں سرنج کے ذریعے T.T. OIL ڈالا۔ آئل ڈالنے کے ایک منٹ بعد ہی کیڑے زخموں سے نکل کر باہر گرنے لگے۔ پھر اس کے زخموں میں Negasent پاؤڈر ڈالا گیا اور پینے کے لیے اُونٹ کا دودھ دیا گیا مگر کتا تو بے ہوشی کی کیفیت میں تھا اور بری طرح Dehydrated بھی تھا۔ اس نے دودھ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ رات اسی طرح گزر گئی۔

صبح میں ڈاکٹر شفیق صاحب جو کہ اس وقت ڈپٹی ڈائریکٹر اینیمل ہسبنڈری تھے، کے پاس گیا۔ اُن سے کچھ دوستی بھی تھی۔ انہوں نے مہربانی فرمائی اور اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ خود تشریف لے آئے۔ کتے کا معائنہ کرنے کے بعد بولے کہ یہ مرنے کے قریب ہے اور اس کا بچنا مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ جب تک یہ زندہ ہے میں اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرتا رہوں گا، آپ میرا ساتھ دیں میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اسی دوران میرے عزیز دوست محمد ضیاء خان شامی جو کہ اس وقت ڈسٹرکٹ لودھراں میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے اور محمد نصر اللہ خان خاکوانی جو کہ ایک ریٹائرڈ بینک آفیسر تھے میری ٹیم میں شامل ہو گئے۔ دونوں میرے قابلِ احترام دوست ہیں اور میری طرح Animal Lovers بھی ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر شفیق صاحب اور ان کے اسسٹنٹ سمیت ہم پانچ لوگوں کی ٹیم بِن گو BINGO کی جان بچانے کے لیے سرگرم ہو گئی (بِن گو کتے کا نام تھا جو اس کے سابق مالک نے مجھے بتایا تھا)۔

بِن گو ابھی تک بیہوش تھا۔ اس کا منہ زبردستی کھول کر دودھ اور پانی اس کے منہ میں ٹپکایا جاتا تھا لیکن وہ بھی باہر نکل آتا۔ ڈاکٹر شفیق صاحب نے کہا کہ اگلے چوبیس گھنٹے بِن گو کے لیے بہت اہم ہیں، یہ کسی وقت بھی مر سکتا ہے۔ آج میں دفتر سے سیدھا آپ کے پاس آ جاؤں گا اور ہم سب مل کر بِن گو کو ڈرپ لگائیں گے۔ اگر ڈرپ مکمل طور پر لگ گئی تو اس کے بچنے کے چانسز 20% ہیں۔ اسی اثناء میں میرے دوست شامی صاحب کا لودھراں سے فون آ گیا کہ بِن گو کا کیا حال ہے۔ میں نے تمام حالات سے اُن کو تفصیلاً مطلع کیا۔ وہ بولے آفس سے فارغ ہوتے ہی میں آپ کے پاس آ جاؤں گا، کوشش کریں گے، انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔ اسی بات چیت کے دوران خاکوانی صاحب بھی تشریف لے آئے اور اپنے ساتھ کھانے کا ٹفن بھی لائے کہ کھانا اکھٹے کھائیں گے اور بِن گو کا علاج بھی کریں گے۔ تمام ادویات پہلے سے ہی ڈاکٹر شفیق

صاحب کی ہدایات کے مطابق منگوائی جا چکی تھیں۔ اب ہم پانچ لوگ ٹیم ورک کر رہے تھے۔

ڈھائی بجے ڈاکٹر صاحب نے اینٹی بائیوٹک، ملٹی وٹامنز اور دیگر ادویات ڈرپ میں انجیکٹ کر دیئے اور ڈرپ کتے کو لگا دی گئی۔ اس دوران لائیٹ بند ہو گئی۔ ہم باری باری ڈاکٹر صاحب اور اُنکے مریض کو ہاتھ والا پنکھا جھلتے رہے اور ان کی مدد بھی کرتے رہے۔ دو گھنٹے بعد ڈرپ ختم ہو گئی۔ پھر اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے پہلے اس کو Negawan کے محلول سے صاف کیا گیا اور مرہم پٹی کر دی گئی۔ ہم لوگ مغرب تک بن گو کے پاس رہے پھر ایک ملازم کی ڈیوٹی رات بھر کے لیے لگا دی گئی اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ مگر فون پر رات بھر پہلے ملازم سے بن گو کی رپورٹ لی جاتی پھر سب ٹیم ممبرز کو update کیا جاتا۔

دوسرے روز اسی طرح پھر ڈرپ لگائی گئی۔ کچھ ادویات کو نئی ادویات سے تبدیل کر دیا گیا۔ مرہم پٹی بھی جاری رہی۔ روزانہ ۲ بجے کے بعد سب لوگ اکھٹے ہو جاتے۔ کھانے کے ٹفن گھروں سے آ جاتے اور زیرِ تعمیر مکان کے گیراج کو مریض کے لیے ICU روم میں تبدیل کر دیا گیا۔ سب لوگ ایک ہفتے تک گومگو کی کیفیت میں رہے۔ کبھی کبھی بن گو کی زندگی کی آس ختم ہو جاتی مگر ہم سب ایک جوش اور ولولے کے ساتھ ایک عزم کے ساتھ پھر اپنی اپنی کوشش شروع کر دیتے۔ آخر ۱۰ روز کی جان توڑ کوشش کے بعد بن گو نے آنکھیں کھول دیں اور تھوڑا سا دودھ از خود پی لیا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو مبارکبادیں دیں اور اپنی کوششیں اور تیز کر دیں۔

گیارھویں دن بن گو کو Savalon کے محلول اور شیمپو سے نہلایا گیا۔ اس کے زخم جو کہ کھلے تھے ان کو ٹانکے لگائے گئے اور مختلف قسم کے انجکشنز بھی لگائے گئے۔ اب بن گو صاف ستھرا ہوتا جا رہا تھا اور زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ وہ موت کو شکست دے چکا تھا۔ احسان مندی کا اظہار کرنے کے لیے دُم ہلاتا اور اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیتا۔ میں جدھر بھی جاتا مجھے دیکھتا رہتا۔ علاج بہت ہی احتیاط سے جاری تھا۔ تمام ٹیم دو بجے کے بعد اکھٹی ہو جاتی اور ٹیم کا ہر ممبر اپنی اپنی کوشش انفرادی اور اجتماعی طور پر شروع کر دیتا۔

آخر کار بن گو نے آہستہ آہستہ خود بخود کھڑے ہونا اور خود کھانا شروع کر دیا۔ کبھی چہل قدمی کر لیتا اور کبھی گر پڑتا لیکن ہمیں تسلی تھی کہ اب یہ خطرے سے باہر ہے۔ اب اس کے لیے بڑے جانور کے کلیجی گُردے اور کبھی چکن کے کلیجی، پوٹا، سری اور پنجے الگ سے پکائے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس نے کھانا شروع کر دیا اور صحت مند ہوتا چلا گیا۔ صبح ناشتے میں اس کو اُونٹ کا دودھ چینی ڈال کر مع ڈبل روٹی دیا جاتا

پھر دو پہر کو سبزی چکن یا گوشت میں پکا کر دی جاتی۔ رات کو پھر دودھ ڈبل روٹی دی جاتی۔

۴۵ یوم مکمل علاج اور ٹھوس غذا کے بعد بن گو نے دوڑنا بھاگنا اور شرارتیں شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ جسے زندگی دیں اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ اس دوران اسے صرف ایک بار بخار ہوا جس کا فوراً علاج کیا گیا اور وہ صحت یاب ہو گیا۔ اب وہ اپنے اصلی رنگ ڈھنگ میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا علاج اب بھی جاری تھا اور اس کی غذا بڑھائی جا رہی تھی۔ دو ماہ بعد کوئی اس کو پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی کتا ہے جسے ایک بوری میں اکھٹا کر کے لایا گیا تھا۔

مزید کچھ ہی ہفتوں کے بعد بن گو نے ایک نہایت خوبصورت اور جوان کتے کی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ قد بُت بھی بہت اچھا تھا۔ دُم بھی موٹی ہو گئی تھی، چھاتی بھی خوبصورت نظر آتی تھی۔ کووں کے پیچھے بھاگنا اس کا محبوب مشغلہ تھا مگر کیا مجال کہ گھر کے کسی پرندے کو میلی نظر سے دیکھ جائے۔ تیتر، مور، چکور، مرغیاں اور ان کے چوزے کھلے عام اس کے ارد گرد دانہ دُنکا چگتے پھرتے۔ البتہ کووں اور بلیوں کا دشمن تھا۔ دن ہو یا رات بہترین چوکیدار ثابت ہوا۔

میں چونکہ گھر خود بنوا رہا تھا، نگرانی کے لیے سارا دن خود سائٹ پر موجود رہتا۔ میں جدھر بھی جاتا وہ میرے ساتھ ساتھ ہوتا۔ جب لان میں آ کر میں کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ جاتا۔ بہت توجہ اور پیار سے میری طرف دیکھتا رہتا۔ بیل گاڑی والے اینٹیں لے کر آتے تو وہ بھاگ کر گیٹ میں کھڑا ہو جاتا۔ گیٹ سے باہر سڑک پر کوئی اینٹ گر جاتی تو وہ اپنے منہ میں اٹھا کر جہاں بھی میں ہوتا لا کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ بیل گاڑی والے بہت حیران ہوتے۔ اب وہ شرارتاً بھی دو چار اینٹیں سڑک پر پھینک دیتے۔ بن گو ایک ایک کر کے ساری اینٹیں اٹھا کر لاتا اور غصے میں غراتا رہتا۔ ذرا گیٹ کھڑکا یا گھنٹی بجی تو ایک لمبی بھوں کی آواز نکالتے ہوئے بڑے غصے سے گیٹ کی طرف بھاگتا جاتا۔ ایک روز چند بے تکلف دوست ملنے آ گئے۔ ایک دوست کو بار بار ہاتھ مارنے کی عادت تھی۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا کتا ایک چھلانگ لگا کر اُس کی طرف جھپٹا۔ میں نے مشکل سے اُسے قابو کیا۔

میرے فرسٹ کزن اور عزیز دوست عبدالرحمٰن صاحب مرحوم لندن سے تشریف لا رہے تھے۔ انہوں نے فون پر مجھے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے پاکستان آ رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ بھی کام مجھے بتائے۔ میں نے کہا حکم کی تعمیل ہو گی، آپ میرے کتے کے لیے بسکٹ، بہت خوبصورت Collar and Chain، اور

medicines worm killer لے کر آئیں۔ وہ واقعی بہت خوبصورت چیزیں لے کر آئے۔ میں اپنے مرحوم دوست عبدالرحمن صاحب کا بے حد ممنون اور احسان مند ہوں۔ جب بھی میں نے انہیں فون کر کے لندن سے بن گو کی ادویات لکھوائیں انہوں نے فوراً مجھے بھجوائیں۔ جس کی وجہ سے بھی بن گو تیزی سے زندگی کی طرف پلٹ آیا تھا۔ بن گو نے اب لیبراڈور کتیا سے عشق جھاڑنا شروع کر دیا تھا اور اس کو بہت تنگ کرتا تھا لہٰذا میں نے اب اس کو باقاعدہ باندھنا شروع کر دیا تھا اور رات کے وقت کتیا کو چھت پر چڑھا دیا جاتا اور دروازہ بند کر دیا جاتا۔ مگر یہ عاشق ساری ساری رات شیڈ پر بیٹھی کتیا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا۔

میں نے گھر کے باہر سڑک کے دونوں طرف گلاب کے پودے لگائے ہوئے تھے جن پر بہت خوبصورت گلاب لگے ہوئے تھے۔ کچھ لڑکے جو لڑکپن کی عمر میں تھے سڑک پر سے گذر رہے تھے جبکہ میں بن گو کے ساتھ سڑک پر سیر کر رہا تھا۔ لڑکے جاتے جاتے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈوں سے پھولوں پر تلوار بازی کر رہے تھے اور پھول گراتے جا رہے تھے۔ میں اُن سے تھوڑا دور تھا۔ میں نے انہیں ڈانٹ کر پھولوں کو ڈنڈے مارنے سے منع کیا تو وہ اور زور سے مارنے لگے اور ساتھ ساتھ تیزی سے بھاگنے لگے۔ بن گو کی زنجیر میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس کے کالر سے زنجیر نکال دی اور زور سے کہا شُو (shooo) اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ان کو لے کر ہی آنا۔ بس پھر کیا تھا بن گو سخت طیش میں آ گیا اور بڑی تیزی سے لڑکوں کی طرف بھاگا۔ جب لڑکوں نے دیکھا کہ بھیڑیئے کی شکل کا کتا آ رہا ہے تو انہوں نے بھی تیزی سے چوکڑیاں بھرنی شروع کر دیں۔ مگر بن گو تو بن گو ہی تھا۔ اس نے بہت جلد تمام لڑکوں کو گھیرے میں لے لیا اور میرے پاس لے آیا۔ اس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ میں نے اس کو واپس زنجیر پہنائی مگر اس کا غصہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکوں کی طرف اچھل رہا تھا۔ لڑکوں نے کہا کہ اگر آپ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، آپ لوگ جا سکتے ہو مگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔

عرصہ سات ماہ وہ کتا میرے پاس ایک بہترین اور جانثار دوست کی طرح رہا۔ مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں نے اس کو لا کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ میں اس سے بے حد خوش تھا اور وہ مجھ سے خوش تھا۔ ایک روز میرے مالی ملک کریم بخش صاحب (مرحوم) نے مجھے بتایا کہ ایک پجارو گاڑی میں ایک صاحب کئی بار

تشریف لائے ہیں اور آپ سے ملنے کے لیے بے حد بے چین ہیں۔ وہ جب بھی آئے آپ موجود نہیں تھے ۔آج میں نے انہیں شام ۵ بجے کا ٹائم دیا ہے۔ میں نے بات سنی ان سنی کر دی اور اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہو گیا۔ٹھیک ۵ بجے ملک کریم بخش صاحب بھاگتے ہوئے آئے، سانس چڑھا ہوا تھا، کہنے لگے کہ وہ پجارو والے صاحب آ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ لان میں کرسیاں رکھو اور انہیں بٹھاؤ۔ میں بھی مستری مزدوروں سے فارغ ہو چکا تھا۔ان صاحب سے مِلا تو انہوں نے اپنا تعارف ایک فیوڈل لارڈ کے طور پر کروایا۔ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنے مطلب پر آ گئے۔ بولے کیا میں آپ کا کتا دیکھ سکتا ہوں؟ میں نے گھر آئے ہوئے مہمان کو عزت دیتے ہوئے رواداری سے کام لیا اور ملک کریم بخش صاحب کو آواز دے کر کہا کہ بِن گو کی زنجیر کھول دو۔ بِن گو بھاگتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور غور سے آنے والے مہمان کو دیکھنے لگا۔مہمان بھی اُسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔آخر وہ صاحب بولے، کیا آپ کتا فروخت کریں گے؟ میں نے کہا No, absolutely not وہ بولے اگر آپ فروخت کرنا چاہیں تو میں ایک لاکھ روپے دینے کو تیار ہوں۔ میں نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔ وہ پھر مجھے واپس اپنے مطلب پر لانے کی کوشش کرنے لگے لیکن میں یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا کہ مجھے گھر جانا ہے میں مزید نہیں بیٹھ سکتا۔آخر وہ چلے گئے۔

دو تین روز بعد کریم بخش مرحوم نے مجھے ایک چیک دیا اور کہا کہ وہ صاحب دوبارہ آئے تھے اور کہہ گئے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ چیک دے کر کہنا کہ اپنی مرضی سے اس چیک میں رقم لکھ لیں اور کتا مجھے دے دیں۔ میں نے غصے میں چیک پھاڑ کر کریم بخش کو واپس دیا اور کہا کہ اگر وہ صاحب دوبارہ آئیں تو اندر مت آنے دینا اور یہ پھٹا ہوا چیک دے کر کہنا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا جواب ہے۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر شفیق صاحب نے مجھے کہا کہ کتے کی معقول رقم مل رہی ہے۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس لیے کتا نہیں رکھا تھا کہ اچھی قیمت ملنے پر اپنے دوست کو فروخت کر دوں۔

مزید کئی روز گزرنے کے بعد وہ آدمی آ گیا جس سے میں کتا لایا تھا۔سلام دعا کے بعد کہنے لگا کہ میں اپنا کتا واپس لینے آیا ہوں۔ میں نے half heartedly کہا کہ بے شک لے جائیں۔ اُس نے بِن گو کو بلایا مگر بِن گو نے اسے بالکل لفٹ نہیں کرائی اور خاموشی سے بیٹھا رہا۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ آپ بے شک اس کو لے جائیں، یہ خوشی سے آپ کے ساتھ نہیں جائے گا۔اگر آپ زبردستی اس کو لے بھی گئے تو

یہ مر جائے گا۔ وہ کہنے لگے اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے بن گو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ ہمارا اتنا ہی ساتھ تھا، تمہارے پرانے مالک مردہ تھے، اب زندہ ہو گئے ہیں۔ تم ایک اچھے کتے کی طرح ان کے ساتھ جاؤ۔ میں نے کتے کی زنجیر آنے والے ابن الوقت اور لالچی انسان کے حوالے کر دی۔ بن گو گردن نیچی کئے میری طرف مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چلا گیا۔ جب بن گو کو باہر کھڑے آٹو رکشہ میں بٹھایا گیا تو وہ چھلانگ مار کر باہر آ گیا اور بھاگ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں نے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور رکشے تک خود ساتھ گیا۔ اس کو اندر جانے کا کہا تو اس نے فوراً میرا حکم مانا اور رکشے میں سوار ہو گیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال یہ انسانی لالچ اور طمع کی بدترین مثال تھی۔ یہ لوگ خود کو راجپوت کہتے تھے لیکن عمل کے لحاظ سے انہوں نے اپنے آپ کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ثابت کیا۔

بن گو کے پرانے مالک جس فیوڈل لارڈ کو یہ کتا فروخت کرنا چاہتے تھے یہ وہی شخص تھا جو مجھے چیک دے گیا تھا پھر اُس نے ڈاکٹر شفیق صاحب کے ذریعے کتے کے پرانے مالک سے رابطہ کیا اور وہ اسی لالچ کے تحت کتا لے گئے تھے۔ جب انہوں نے فیوڈل لارڈ سے رابطہ کیا کہ ہم کتا لے آئے ہیں تو اسی دوران فیوڈل لارڈ کو پندرہ بیس روز کے لیے کہیں باہر جانا پڑ گیا اور وہ فوراً کتا نہ لے جا سکا۔ پندرہ بیس دن بعد جب وہ کتا لینے آیا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتا تو لاغر اور بیمار ہو چکا ہے کیونکہ کتے نے کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ اُس نے کتا لینے سے انکار کر دیا کہ یہ تو وہ کتا ہی نہیں ہے اور اپنی رقم اُن صاحب سے واپس مانگ لی۔

مزید پندرہ بیس روز کے بعد مجھے ڈاکٹر شفیق صاحب نے ہی بتایا کہ جس روز سے کتا آپ کے پاس سے وہاں گیا ہے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ آخر ایک روز بن گو مر گیا۔ ایک نسلی جانور انسانوں کی لالچ اور خود غرضی کا شکار ہو گیا۔

ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔بن گو مر گیا۔

ساتواں باب

تاریخِ تمباکو اور تمباکو سے علاج

(تمباکو......دوست بھی دشمن بھی)

تمبا کو کی ابتداء کے بارے میں ابھی تک تحقیق جاری ہے۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ تمبا کو سب سے پہلے کہاں کاشت ہوا۔ کیا اس کی ابتدائی شکل ایک خودرو پودے کی تھی؟ اگر ہم پرانی کُتب کا مطالعہ کریں تو حکیم مومن کی تصنیف تحفہ المومنین کے مطابق بقراط کے زمانے میں ایک قسم کی بوٹی تھی جس کا نام فلموتی تھا جس میں آج کے تمبا کو کی سب خصوصیات موجود تھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تمبا کو ہی تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی شہرۂ آفاق تصنیف آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ تمبا کو سنسکرت کے لفظ تامرکٹ سے بگڑ کر بنا ہے۔ ان بھوت چکتا سا کر میں تمبا کو کا نام تامرکوٹہ لکھا گیا ہے۔ وہ مزید رقم طراز ہیں کہ امریکہ کی دریافت کے بعد ہی یورپ کے لوگ تمبا کو سے واقف ہوئے۔

تاریخ کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پندرہویں صدی میں Spencer Deal جو کہ Pazak By میں مقیم تھا نے لکھا ہے کہ جب اُن پر ریڈ انڈین حملہ آور ہوئے تو وہ تمبا کو کا استعمال کرتے تھے۔ اُس وقت کا ایک اور writer لکھتا ہے کہ امریکہ کے اصل باشندے (ریڈ انڈین) تمبا کو پیتے تھے۔ ان کے تمبا کو پینے کا طریقہ کچھ اس طرح تھا کہ وہ تمبا کو کا ڈنٹھل جلا کر اس کا دھواں ایک نلکی کے ذریعے اپنے نتھنوں میں داخل کرتے تھے۔ یہ آج کے حقے کی ابتدائی شکل تھی۔ کارتھیج کا پادری اپنی تصنیف کنگ مانیٹر میں لکھتا ہے کہ بادشاہ نہ صرف تمبا کو کا رسیا تھا بلکہ تمبا کو پر ٹیکس بھی وصول کرتا تھا اور تمبا کو استعمال کرنے کے بعد خوشبودار پانی سے اپنا منہ دھوتا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ تمبا کو پر سب سے پہلی ایکسائز ڈیوٹی کنگ مانیٹر نے وصول کی۔

مؤرخین کے مطابق یورپ میں تمبا کو کو متعارف کروانے والا پہلا شخص ٹیچر تھا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کولمبس سے ایک صدی پہلے یعنی کہ 1392ء میں جہاز رانی کرتا امریکہ جا نکلا اور اپنے لوگوں کو سونا، چاندی اور دیگر قیمتی اشیاء تلاش کرنے کے لیے مختلف اطراف میں روانہ کیا۔ ان ہی میں سے ایک شخص

نے واپس آ کر بیان کیا کہ جنگلی لوگ یعنی ریڈ انڈین ایک قسم کے پتے کو لپیٹ کر، اس کو آگ لگا کر دوسری طرف سے لمبا سانس لے کر پیتے ہیں۔ ٹیچر نے اس پتے کو منگوا کر خود پیا۔ واپسی پر بڑی مقدار میں ساتھ یورپ لے کر آیا اور یورپ کے لوگوں کو اس کا تجربہ کروایا۔ یہ سگریٹ یا سگار کی ابتدائی شکل تھی۔ جو بیج وہ ساتھ لایا تھا اس کو کاشت کیا اور اس طرح یورپین لوگ تمباکو سے آشنا ہوئے۔

کولمبس کے بیان کے مطابق اس نے بھی ریڈ انڈینز کو ایک پتے کی شکل کی بُوٹی پیتے دیکھا تھا۔ کولمبس بھی جزیرہ ٹمبکٹو سے یہ بُوٹی اور اس کے بیج سپین لے گیا اور وہاں اس کی کاشت شروع کروائی۔ ٹمبکٹو کی مناسبت سے اس بوٹی کا نام ٹمبکٹو پڑ گیا جو بعد میں بگڑ کر ٹوبیکو ہو گیا۔ ٹمبکٹو سپین سے پرتگال جا پہنچا اور لوگ اسے کاشت کرنے لگے۔ پرتگال میں فرانس کے سفیر مسٹر میو جان نیکوٹ نے اس کے بیج فرانس میں اپنے باغیچے میں کاشت کرنے کے لیے بھیج دیے جس کے بعد اس کی کاشت عام ہوگئی اور ہر شخص کاشت کرنے لگا۔ 1582ء میں سر والٹر ریلے تمباکو کے بیجوں کو برطانیہ لے گئے اور اس کی کاشت شروع کروادی۔ 1585 میں سر فرانسس ڈریک نے ورجینیا سے واپسی پر اس کی کاشت کروائی۔ ابتداء میں بدہضمی میں اس کا عرق پیا جاتا تھا۔ ایران میں اس کا استعمال شاہ عباس ثانی کے عہد میں شروع ہوا۔

سولہویں صدی کے ابتداء میں یہ تمباکو دربارِ اکبری میں پیش کیا گیا اور لوگ اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔ اکبری دور میں تمباکو نہایت شاندار حقوں کے ذریعے استعمال کیا جاتا تھا۔ حقے کی ابتداء بھی اکبری دور میں ہوئی۔ شہنشاہ جہانگیر تزکِ جہانگیری میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے تمباکو دربارِ اکبری میں تحفتاً پیش کر کے بہت سی مراعات حاصل کیں۔ مولف دارشکوہی نے بھی اس امر کی تصدیق کی۔

تمباکو سے سگریٹ بنانے کی ابتداء اٹھارویں صدی میں جنوبی امریکہ سے ہوئی۔ اس سے پہلے سگار عام پیا جاتا تھا۔ سگار کا پہلا کارخانہ 1788 میں ہیمبرگ میں قائم کیا گیا۔ سگریٹ سب سے پہلے سپین میں عام ہوا اور پھر پوری دنیا میں پھیل گیا۔ آج کل دنیا میں تمباکو نوشی کا سب سے بڑا ذریعہ سگریٹ ہی ہے۔ دنیا میں تمباکو کو مختلف نام دیے گئے ہیں۔ انگریزی میں Tobacco، لاطینی میں Tobaccum، عربی میں تمباک، ہندی میں تماکو اور بھنگ وغیرہ، سنسکرت میں چھار پسترا۔

تمباکو ایک جھاڑ دار پودا ہے۔ اس کے پتے بیضوی شکل کے موٹے اور کھردرے ہوتے ہیں۔ ان کی بُو تند و تیز، ذائقہ تلخ اور خراش دار ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر حصے اور خاص طور پر گرم ممالک میں زیادہ کاشت کیا جاتا ہے۔ تمباکو کی بہت سی قسمیں ہیں۔ پاکستان میں اس کی چار قسمیں کاشت کی جاتی ہیں جو دیسی، کلکتی،

پوربی اور سورتی کہلاتی ہیں۔تمبا کو میں مندرجہ ذیل زہر پائے جاتے ہیں:

ا۔نکوٹین: یہ سنکھیا سے بھی زیادہ زہریلا اور مہلک زہر ہے۔صرف ایک رتی نکوٹین ایک صحت مند آدمی کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ایک سیر تمبا کو میں ایک تولہ نکوٹین ہوتی ہے۔ایک قطرہ نکوٹین سے کتا ہلاک ہو جاتا ہے۔

۲۔پروسک ایسڈ: یہ بھی ایک مہلک زہر ہے جو سگریٹ میں زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔دردِ سر پیدا کرتا ہے۔

۳۔ایکسرولین: دماغی طاقت میں خلل ڈالتا ہے اور بصارت یعنی نظر کو کمزور کرتا ہے۔

۴۔فرفیورل: یہ زہر الکوحل سے کئی گنا زیادہ تیز ہوتا ہے اور ایک سگریٹ میں ایک چھٹانک وسکی کے زہر کے برابر ہوتا ہے۔

تمبا کو کسی بھی شکل میں استعمال کیا جائے اس کا زہر پٹھوں کو کمزور کرتا ہے، دماغی اور اخلاقی کمزوریاں پیدا کرتا ہے۔

تمبا کو کے بارے میں ڈاکٹروں کی عالمانہ رائے

۱۔ خون میں کثافت پیدا کرتا ہے۔

۲۔ معدہ کو کمزور اور قوتِ مدافعت کو ناکارہ کرتا ہے۔

۳۔ دل میں فتور پیدا کرتا ہے۔

۴۔ دیکھنے، سونگھنے، محسوس کرنے، ذائقہ محسوس کرنے اور قوتِ باہ کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔

۵۔ دماغ میں ضرر رساں مادے پیدا کرتا ہے جو بے حد نقصان دہ اور فالج، برین ہیمرج کا باعث بنتے ہیں۔

۶۔ رگوں اور پٹھوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۷۔ حلق اور نتھنوں میں خشکی پیدا کرتا ہے۔

۸۔ پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔

جنگ کریمیا میں ایک سپاہی کہیں چھپا ہوا تھا کہ اس کے سر کے اوپر کسی مقام سے ایک کوبرا سانپ نکل آیا۔سپاہی چھپ کر پائپ پی رہا تھا۔جیسے ہی سپاہی نے اپنا ہاتھ جھٹکا تو اتفاق سے پائپ کی نالی سانپ کے منہ میں چلی گئی جس سے سانپ آناً فاناً ہلاک ہو گیا۔

برٹش میڈیکل جرنل میں درج ہے کہ تمبا کو طالب علموں کی دماغی ترقی کو روکتا ہے۔ایک پروفیسر نے

ذہانت کے اعتبار سے اپنے شاگردوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا اور ان پر تحقیق کی۔ اوّل آنے والوں میں کوئی بھی تمبا کو نوش نہ تھا اور سب سے نچلے درجے میں سب تمبا کو نوش تھے۔ صرف خالص دودھ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو سگریٹ نوش کو تمبا کو کے نقصانات کے مقابلے فائدہ دے سکتا ہے۔ میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اگر سفید کپڑے پر تمبا کو یا اس کے دھویں سے نشان پڑ جائے وہ کسی صابن یا کیمیکل سے صاف نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس نشان کو دودھ سے صاف کر لیا جائے تو کپڑا صاف ہو جاتا ہے۔

ایک حالیہ تحقیق کے مطابق نارتھ ویسٹ یونیورسٹی آف انگلینڈ کے پروفیسر بوگڈین پیٹر رقم طراز ہیں کہ تمبا کو نوشی دل کے ساتھ ساتھ دماغ پر اثر انداز تو ہوتی ہی ہے لیکن یہ شدید کمر درد کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ تمبا کو بہت سی ادویات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یونانی طریقہ علاج میں اس کا بہت اہم مقام ہے لیکن اگر اس کا کسی بھی شکل میں بے دریغ استعمال کیا جائے تو قاتلِ بے رحم ہے۔

تمبا کو کے فوائد

استاد الحکما حکیم طبیب کامل محمد عبداللہؒ جہانیاں والے فرماتے ہیں کہ۔۔۔

۱۔ جب منہ، آنکھ اور ناک میں ورم ہو جائے جس کی وجہ سے دماغ بھاری اور بوجھل محسوس ہو تو مندرجہ ذیل معجزہ نما علاج کریں:

تمبا کو تلخ ۶ ماشہ

مرچ سیاہ ۳ ماشہ

دونوں کو پیس کر خاک کی طرح کر لیں اور بطور نسوار استعمال کریں۔

۲۔ دردِ سر (Headache)، نزلہ (Coryza) اور زکام (Catarrh) کی صورت میں:

تمبا کو ایک تولہ

لونگ ۱۴ عدد

زعفران ایک ماشہ

کستوری ایک ماشہ

تمام ادویہ کو پیس کر اور چھان کر نسوار بنا لیں۔ رات کو سونے سے پہلے ۳ بار بطور نسوار سونگھیں اور تمام رات پانی نہ پئیں۔ صبح تک بیماری کا نام نہ ہوگا۔

۳۔ دردِ شقیقہ (Migrain) جسے آدھ سر کا درد بھی کہا جاتا ہے۔ اس درد کی شدت سے مریض محسوس کرتا

ہے کہ اس کا سر پھٹ جائے گا اور وہ شدتِ درد سے بے تاب ہو کر لوٹ پوٹ ہونے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں تمبا کو اور لونگ ہم وزن پیس کر ماتھے پر لیپ کریں، انشاء اللہ تعالیٰ آرام ہو گا۔

۴۔ اگر دردِ شقیقہ کا مریض مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہو تو حقہ کی میل لے کر پانی میں گھسا کر مریض کی ناک میں مخالف جانب صرف ایک قطرہ ڈالیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسی وقت شفا ہو جائے گی، یہ نسخہ مجرب اور آزمودہ ہے۔

۵۔ اگر ناک میں کیڑے (Wromesnasi) ہوں اور شدید نزلہ زکام ہو تو مندرجہ ذیل علاج فرمائیں

تمباکو	۳ ماشہ
نک چھکنی	۳ ماشہ
برگِ شبت	۳ ماشہ
دانہ الائچی خورد	۲ ماشہ
قلمی شورہ	۲ ماشہ
لونگ اور جائفل	ایک ایک ماشہ
مُشک خالص	ایک رتی
پوٹاشیم پرمیگنیٹ	۵ رتی

تمام ادویات کا سفوف بنا کر شیشی میں ڈھکن کس کر بند کر لیں اور ضرورت کے مطابق بطور نسوار استعمال میں لائیں۔ یہ بہت زود اثر دوا ہے۔

۶۔ مرگی (Epilepcy) ایک موذی مرض ہے جس کا آسان اور تیر بہدف علاج بھی بذریعہ تمبا کو موجود ہے، ملاحظہ فرمائیں:

۲ ماشہ برگِ تمبا کو لے کر پاؤ بھر تیز کھولتے ہوئے پانی میں ایک گھنٹہ تک بھگوئیں۔ پھر چھان کر 1/2 چھٹانک کے قریب صبح شام مریض کو پلائیں۔ 15 روز کا کورس مکمل کریں اور کلی طور پر صحت پائیں۔

۷۔ کزاز یعنی تشنج (Convulsion) میں مریض کسی جانب حرکت نہیں کر سکتا۔ گردن سے لے کر پشت تک سب اکڑ جاتا ہے۔ کزاز کا دورہ شروع ہونے سے پہلے پیٹ درد، ہچکی اور دونوں کندھوں کے درمیان درد شروع ہو جاتا ہے اور پھر شدید دورے کی صورت میں مریض اکڑ جاتا ہے۔ دیسی تمباکو کے پتے اور بھنگ ملا کر چھوٹی چلم میں ڈال کر حقہ کی طرح پلائیں۔ تشنج ختم ہو کر مریض کو نیند آ جائے

گی۔ جیسے ہی مریض میں دورے کے آثار ختم ہوں یہی عمل بار بار دوہرائیں۔ 15 روز ایسا کرنے سے مریض انشاءاللہ مکمل صحت یاب ہوجائے گا۔

۸۔ اگر کان میں درد ہو اور کیڑے پڑ گئے ہوں تو مریض کسی حقہ نوش کے پاس جا کر اُسے کہے کہ حقے کے زور زور سے سُوٹے لو اور دھواں میرے کان میں پھونکتے جاؤ۔ 10/12 سوٹوں کا دھواں چھوڑنے سے نہ صرف کیڑے باہر گرنا شروع ہوجاتے ہیں بلکہ درد بھی فوراً بند ہوجائے گا۔

۹۔ (Gingititis) اگر مسوڑھے پھول جائیں اور ان میں انفکشن ہو تو سبز تمبا کو خشک کریں اور باریک پیس کر سفوف تیار کرلیں اور بطور منجن استعمال کریں۔ نہ صرف درد ختم ہوجائے گا بلکہ مسوڑھے صحت مند ہوجائیں گے، نزلی رطوبت بھی ختم ہوجائے گی۔

۱۰۔ لاجواب منجن مندرجہ ذیل کا صبح شام استعمال کریں تو دانت میل کچیل سے صاف ہوکر موتیوں کی طرح چمکنے لگیں گے، درد ختم ہوگا، دانت ہلنے بند ہوجائیں گے اور دانتوں سے خون آنا بھی بند ہوجائے گا۔ منجن مَلنے کے بعد آدھ گھنٹے تک منہ کی رال (slavia) باہر ٹپکاتے رہیں، اس کے بعد پانی سے منہ صاف کرلیں۔ روزانہ استعمال سے بے شمار فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ دانت درد کے لیے یہ نسخہ طبِ یونانی کا زندہ معجزہ ہے۔ صرف ایک ہفتے کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انعام دیکھیں۔ یہ بات یاد رہے کہ جب بھی آپ دانتوں پر کوئی دوا استعمال کریں تو کم از کم آدھ گھنٹے تک منہ میں بننے والی رال (slavia) باہر ٹپکاتے رہیں پھر دوا اثر کرے گی ورنہ نہیں۔

نسخہ:

تمبا کو خشک	ایک تولہ
مرچ سیاہ	ایک تولہ
گیرو	ایک تولہ
نمک لاہوری	ایک تولہ
سعد کوفی	ایک تولہ
پھٹکڑی (توّے پر بنی ہوئی کھِیل)	ایک تولہ
دھنیا خشک	ایک تولہ
پیپرمنٹ	۶ ماشے

ست اجوائن	۶ ماشے
کافور بھیم سینی	۶ ماشے

تمام ادویہ کا سفوف تیار کریں اور بطور منجن دانتوں اور مسوڑھوں کو ملیں۔ آزمودہ ہے، فوری اثر کرے گا۔

۱۱۔ (Asthma) دمہ ایک نہایت ہی موذی مرض ہے۔ یہ مرض موروثی بھی ہوتا ہے۔ نزلہ، زکام، کھانسی سے بے پروائی بھی اس مرض کا موجب بن سکتی ہے۔ پھیپھڑوں میں بلغم پیدا ہو کر خشک دمہ پیدا کرتا ہے۔ پھیپھڑوں کی باریک ہوائی نالیوں میں تشنج ہو کر سانس تنگی سے آتا ہے۔ دورہ پڑنے سے پہلے قبض بھی ہو سکتی ہے۔ بار بار رقیق اور سفید رنگ کا پیشاب بھی آنے لگتا ہے۔ جب دورہ شدت اختیار کر جائے تو مریض جان کنی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہی سنا ہے کہ دمہ دم کے ساتھ لیکن یہ بات غلط اور بے علمی پر مبنی ہے۔ مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے کہ بجز موت کے ہر مرض کا علاج ہے۔ البتہ کئی امراض کے علاج مشکل ضرور ہیں۔ اگر کسی دمے کے مریض کے ناخن سبز ہو جائیں اور آواز باریک ہو جائے تو ایسے مریض کو چند روز کا مہمان سمجھنا چاہیے۔

(ا) اب دمہ کے علاج کے بارے میں عرض ہے کہ سورتی تمباکو کے بہت اچھی کوالٹی کے تخم لے کر اس کا تیل نکلوائیں۔ صرف شیشے کی بوتل میں رکھیں۔ پلاسٹک کی بوتلوں سے پرہیز کریں اور بوتل کا ڈھکن کس کر بند کریں۔ دمے کے مریض کے سینے پر اس تیل سے مالش کریں اور پھر قدرت اللہ کا مشاہدہ کریں۔

(ب) دم کشی کا آسان علاج۔ کڑوا تمباکو درجہ اول آدھا کلو لے کر رات کے وقت دو کلو پانی میں بھگو دیں۔ صبح کو بہت دھیمی آنچ پر جوش دیں۔ جب نصف پانی رہ جائے تو چھان لیں اور پرانا گُڑ ملا کر قوام تیار کریں۔ دم کشی کے مریض کو دو تولہ روز کھلائیں۔ آزمودہ اور مجرب ہے۔

(ج) پرانے سے پرانے دمے کے لیے سبز تمباکو کا پانی ایک کلو اور پرانا گُڑ ایک کلو اچھی طرح ملا کر چنے کے برابر گولیاں بنا لیں۔ روزانہ دو گولیاں صبح ایک شام کھلائیں۔ گولیاں کھلانے کے کچھ دیر بعد بلغم کا گچھا نکلے گا تو سمجھ لیں کہ شفا ہونا شروع ہو گئی۔ جب بلغم نکل جائے تو گائے کا خالص گھی دو چمچ پلا دیں۔ (مجرب ہے)

(د) دمہ کا اکسیری اور نہائیت ہی زود اثر علاج جناب حکیم محبوب عالم، مجسٹریٹ درجہ اول، لداخ لکھتے ہیں کہ ایک پاؤ دیسی تمباکو لے کر شام کے وقت ایک کلو پانی میں بھگو دیں۔ صبح کے وقت خوب

ہاتھوں سے مل کر پانی کو کپڑے سے چھان لیں اور ایک کلو ادرک کا پانی اس میں شامل کریں۔ اب اس تمبا کو اور ادرک کے پانی کو ہلکی آگ پر پکائیں۔ جب قوام گاڑھا ہو جائے تو چنے کے برابر گولیاں بنا کر محفوظ کریں۔ ضرورت پڑنے پر ایک گولی تازہ پانی سے روزانہ کھلائیں۔ متواتر 15 روز کھلانے سے آرام ہوگا اور 40 روز متواتر کھانے سے دمہ جڑ سے ختم ہو جائے گا۔

۱۲۔ اگر زخم میں کیڑے پڑ گئے ہوں اور زخم خطرناک صورت اختیار کر کے جان کو خطرہ لاحق کر رہا ہو تو حقے کا زرد اور بدبودار پانی لے کر روزانہ زخم کو صبح شام اس بدبودار پانی سے دھوئیں۔ انشاء اللہ ایک ہفتے میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔

۱۳۔ اگر ناسور کا مریض حقے کی نڑی (نے) کا میل لے کر اسکی بتی بنا کر ناسور میں متواتر رکھے تو صحت یاب ہو جائے گا۔

۱۴۔ اگر زہریلا سانپ کاٹ لے تو حقے کی میل جو نالی میں لگی ہوتی ہے فوراً کھلائیں۔ اِدھر دوا حلق سے اتری، اُدھر مار گزیدہ زہر کے اثر سے نجات پا کر تندرست ہو جائے گا۔ اگر حقہ فوری طور پر دستیاب نہ ہو تو ایک تولہ تمبا کو لے کر ایک گلاس پانی میں اچھی طرح ہاتھوں سے خوب ملیں، یہاں تک کے پانی کا رنگ سرخی مائل ہو جائے۔ پھر ململ کے کپڑے میں سے چھان کر مریض کو دن میں چار بار پلا دیں۔ مریض کو قے آ کر زہر خارج ہو جائے گا۔ صرف تین روز میں مریض مکمل صحت مند ہو جائے گا۔ دورانِ علاج مریض کو غذا نہ دی جائے۔ تیسرے روز مریض کو گرم دودھ میں ۳ ماشہ سوڈا بائی کارب ڈال کر پلائیں۔ اگر پہلے ہی روز زہر کا اثر کم ہو جائے تو پھر روزانہ ایک گلاس پلانا کافی ہے۔ مریض کے زخم پر تمبا کو کی ٹکیا بنا کر باندھیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ شفا ہوگی۔ مجرب المجرب ہے۔

اس کے علاوہ بھی تمبا کو بے شمار امراض میں کارآمد ہے لیکن شیشہ نوش، تمبا کو نوش، تمبا کو والا پان کھانے والے، نسوار، بیڑے اور دیگر طریقے سے تمبا کو استعمال کرنے والے سراسر گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ اپنے ہی پیسے سے اپنی موت کے خریدار ہیں۔ اگر آپ سگریٹ یا تمبا کو نوشی چھوڑنا چاہتے ہیں تو دوائی Tobaccum 30 ہر ۳ گھنٹے بعد 6/7 قطرے استعمال کریں۔ انشاء اللہ اس قبیح عادت سے چھٹکارہ مل جائے گا۔

آٹھواں باب

گوشت، گدھے اور قصاب

(گوشت خوروں کے لیے ایک دلچسپ اور جدید تحقیق)

۱۔ ۴ دسمبر بروز جمعرات ۸ بجے شام جیو پر ایک خبر کی پٹی چل رہی تھی جس کے مطابق ذبیح گدھوں کا گوشت اوکاڑہ سے لاہور لے جاتے ہوئے چوہنگ کے قریب پکڑا گیا اور قصاب کو گرفتار کرلیا گیا۔

۲۔ ۴ دسمبر کو ہی روزنامہ خبریں میں یہ خبر پڑھی گئی کہ ڈیڑھ من مضرِ صحت گوشت سمیت قصاب کو گرفتار کرلیا گیا۔

۳۔ روزنامہ جنگ اور خبریں کے مطابق پنجاب کے کسی شہر میں قصاب چار عدد ذبیح گدھوں سمیت گرفتار۔

۴۔ روزنامہ خبریں ہی کے مطابق ذبیح گدھا برآمد لیکن قصاب فرار۔

۵۔ روزنامہ خبریں ملتان کی اشاعت ۱۹ دسمبر 2014 کے مطابق تحصیل احمد پور شرقیہ، ضلع بہاولپور، کوٹلہ موسیٰ خان روڈ پر چکی موڑ کے قریب بشیر احمد نامی قصاب گدھا ذبیحہ کرنے کے بعد کھال اتار رہا تھا کہ پولیس پہنچ گئی۔ تھانہ سٹی احمد پور شرقیہ میں کیس رجسٹرڈ کرنے کے بعد قصاب کو جیل بھیج دیا گیا۔ گدھے کا گوشت مع کھال کے تلف کر دیا گیا۔

۶۔ سیکرٹری لائیوسٹاک پنجاب کے مطابق گذشتہ ۲۲ دنوں ۶۵ ہزار من مردہ جانوروں کا گوشت قبضے میں لے کر ۱۳۷۰ افراد کے خلاف مقدمات درج کیئے گئے۔

۷۔ لاہور کی ٹولنٹین مارکیٹ سے چھاپہ مار ٹیم نے ۹۸۰ کلو مردہ مرغیوں کا گوشت قبضے میں لے کر مقدمات درج کیئے گئے۔

۸۔ اخبار کے مطابق کراچی میں بھی یہ مکروہ دھندا عروج پر ہے۔ ہزاروں من گوشت جو کہ مردہ گدھوں، گھوڑوں اور مرغیوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ سستے داموں فروخت ہوتا ہے۔ سہراب

گوٹھ، نادرن بائی پاس، شاہ فیصل کالونی، گلستانِ جوہر، لانڈھی، کورنگی، جمشید ٹاؤن، صدر، ماڑی پور، کلفٹن، سی ویو، اس مکروہ کاروبار کے گڑھ ہیں۔

یہ ایک لمحہ فکر یہ اور بے حسی کی انتہا ہے۔اس سے پہلے بھی قصاب جانوروں کی اوجھڑیاں اکٹھی کر کے، ان کی آلائشیں صاف کر کے قیمے والی مشین میں ڈال کر ساتھ ساتھ تِلیاں بھی ڈالتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے سُرخ رنگ کا قیمہ تیار ہو جاتا ہے۔اناڑی گاہک اس کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے اور قصاب کی تعریفیں کرنے لگتا ہے۔اسی قسم کا قیمہ شہر کے ہوٹلوں میں سستے داموں فروخت ہوتا ہے۔گوشت کی ایک قسم جسے قصاب شبینہ کہتے ہیں دراصل باسی گوشت ہوتا ہے۔اگر کسی قصاب کا سارا گوشت فروخت نہ ہوا اور کچھ بچ گیا تو وہ اسے کبھی باسی نہیں کہے گا بلکہ شبینہ کہے گا جو عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہے۔کبھی بھی قصاب کی چرب زبانی اور قسموں پر اعتبار نہ کریں۔کیونکہ قصاب کے بقول یہ سب اس کی دکانداری کا حصہ ہے۔قصاب کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اس کو صرف اپنا گوشت فروخت کرنے سے مطلب ہے چاہے اس کے فروخت شدہ گوشت سے کوئی بھی بیماری پھیلے یا گوشت کھانے والا ہسپتال سے ہوتا راہی ملکِ عدم ہو جائے۔قصاب کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جانور گندا پانی پیتے ہیں جس کی وجہ سے 90% جانوروں کے پھیپھڑے parasites سے بھرے ہوتے ہیں اور ان کی کلیجی (Liver) پر سفید دانے نکلے ہوتے ہیں یا سکے کے برابر گول نشان ہوتا ہے جہاں سے کلیجی گلی سڑی ہوتی ہے اور اس سے بدبو بھی آ رہی ہوتی ہے۔بعض اوقات اوجھڑی پر بھی دانے یا گومڑیاں بنی ہوتی ہیں۔لیکن کیا مجال کہ قصاب ان پھیپھڑوں، کلیجی یا اوجھڑی کو ضائع کر دے بلکہ وہ انہیں دھو کر، ان میں پانی اور منہ سے ہوا بھر کر اپنی دکان پر لٹکا دیتا ہے جہاں سے گاہک خرید کر لے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب خراب چیزیں ہرگز ہرگز کھانے کے قابل نہیں ہوتی اور کسی بھی صحت مند کو بیمار کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔انسانی بے حسی کی یہ بدترین مثال ہے۔دوسری طرف اکثر لوگ صرف گوشت کھانے کے شوقین ہیں لیکن انہیں یہ علم نہیں کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔بس وہ خوش ہیں کہ گوشت کھا رہے ہیں۔

قصابوں کی اقسام، مزاج اور کارکردگی:

لاہوری قصاب، سرائیکی قصاب، گوجرانوالہ کے قصاب، روہتک حصار گُڑ گاؤں اور انڈیا کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے قصاب جو کہ اپنے آپ کو شیخ قریشی کہلواتے ہیں اپنے اپنے مزاج، پیشے اور روایات کے لحاظ سے نہائیت جھگڑالو، شور شرابہ کرنے، مرغ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی اور دیگر

بازی کرنے میں مشہور ہیں۔ان کی اکثریت اسی قماش کی ہے لیکن ان میں سے چند کے بچے اور بچیاں پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ بھی ہیں مگر بہت کم۔ بہت سے قصاب اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر دیگر کاروبار کر رہے ہیں۔ مثلاً کپڑے، فروٹ، پرندوں، کریانہ، آڈیو اور ویڈیو سی ڈیز و دیگر چھوٹے بڑے کاروبار۔ اس کے علاوہ ہیروئین اور بدمعاشی بھی ان کے کاروبار میں شامل ہیں۔ ملتان میں ہنوں کا چجہ ان کا گڑھ ہے جس کو عرفِ عام میں ملتان کا شکاگو بھی کہا جاتا ہے۔ پولیس بھی یہاں ناکام ہے۔ کیونکہ یہاں ہر قسم کا کاروبار کروڑوں اور اربوں میں ہے لہٰذا ماہانے بھی لاکھوں میں ہوتے ہیں اور جائز ناجائز تمام کاروبار دن رات ترقی پذیر ہیں۔

ہمارے ملک کے ہسپتالوں کو گنجان آباد بلکہ over-booked کرنے میں قصابوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ قصاب ذبیح گدھے سمیت گرفتار کرلیا گیا۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں کہیں نہ کہیں ایسا واقعہ ضرور ہوتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیلاً بتاتا چلوں کہ قصاب ہمیں کس قسم کا گوشت فروخت کرتے ہیں اور ہم گوشت خوری کے شوق میں ناقص ترین گوشت کھا کر خوفناک بیماریوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۔ اکثر قصاب بیمار اور لاغر جانور سستے داموں خرید کر ذبحہ کرتے ہیں۔ کچھ قصاب درمیانے درجے کا جانور خرید کرتے ہیں۔ ذبحہ کرنے کے بعد جانور کے دل میں سوراخ کر کے پانی کا پائپ اس میں داخل کرتے ہیں۔ پانی پریشر کے ساتھ دل سے ہوتا خون کی مانند جانور کی ایک ایک شریان میں داخل ہوتا ہے۔ جس جانور کے گوشت کا وزن ۱۰ کلو ہو وہ پریشر دینے کے بعد ۱۶ کلو ہو جاتا ہے مگر اس کا ذائقہ مردار گوشت کی طرح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گوشت اگر پانی میں ڈوبا رہے تو جلد ہی گلنے سڑنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس گوشت کو ٹب کے اندر برفیلے پانی میں ڈبو کر اوپر سے اور برف ڈال دی جاتی ہے۔ اس کو پریشر والا گوشت کہا جاتا ہے۔

۲۔ اگر قصاب بھیڑ ذبیح کرے تو اس کو بکرا بنا کر فروخت کرتا ہے۔ بھیڑ کی دُم اتار کر ایلفی سے بکرے کی دُم لگا دی جاتی ہے۔ مزید بھیڑ کی اگلی پچھلی ٹانگوں پر بھی بکرا ہونے کی نشانیاں ایلفی سے لگا دی جاتی ہیں۔

۳۔ کوئی بھی جانور ذبحہ کرنے کے بعد کیسا بھی نکلے قصائی اس کو فروخت ضرور کرتے ہیں۔ میرے مشاہدے میں کئی بار یہ بات آئی ہے کہ ذبیح جانور کو کینسر کا پھوڑا تھا یا جانور کینسر کی growth سے بھرا ہوا تھا یا جانور کو ہیپاٹائٹس تھا۔ اس کے جگر پر سفید دانے بنے ہوئے تھے یا جگر پر ۵۰ پیسے کے سکے کے

برابر گول نشان تھا اور جگر گلا سڑا تھا۔ کیونکہ ذبح ہونے کے بعد ہر چیز صاف صاف نظر آ رہی ہوتی ہے۔ جگر کا پیلا پن اور جگر میں بھری پیلی جھاگ نظر آتی ہے۔

۴۔ بعض نر جانوروں کو اپنا پیشاب پینے کی عادت ہوتی ہے ان کے گوشت سے پیشاب کی بدبو آتی ہے۔

۵۔ ذبح کرنے کے بعد مادہ جانور کے پیٹ سے بچہ نکل آتا ہے۔ قصائی گوشت کو دھو کر ورق وغیرہ سے سجا کر دکان پر لٹکا دیتے ہیں اور اپنی چرب زبانی سے فروخت کرتے ہیں۔ یہ گوشت بھی بے حد ناقص اور بدبودار ہوتا ہے۔

۶۔ جانور زیادہ تر دریاؤں، نہروں، کھالوں اور جہاں بھی پانی جمع ہوتا ہے وہاں سے پانی پیتے ہیں۔ ہمارے شمالی علاقہ جات سے کراچی تک پانی محوِ سفر رہتا ہے۔ اس تمام سفر میں تمام آبادیوں، فیکٹریوں اور ہر قسم کے کارخانوں کا outletاس پانی میں شامل کیا جاتا ہے۔ جس میں گٹر کا پانی اور کیمیکل ملا پانی بھی شامل ہے۔ جب جانور یہ پانی پیتے ہیں تو ان کا دودھ اور گوشت خوفناک اور موذی بیماریاں پھیلانے کا موجب بنتا ہے۔ یہ نہ صرف معصوم جانوروں کے ساتھ ظلم ہے بلکہ عوام الناس کے ساتھ بھی نہایت بہیمانہ ظلم ہے اور اس ظلم کے ذمے دار نہ صرف ہمارے منصوبہ ساز ہیں بلکہ خود گورنمنٹ آف پاکستان بھی ہے۔

۷۔ مویشی منڈیوں میں جانور لانے کے لئے ٹرکوں میں بہت ظالمانہ طریقے سے ٹھونسے جاتے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف کمزور بیمار جانور بلکہ بعض اوقات سفر کی تکلیف کی وجہ سے صحت مند جانور بھی مر جاتے ہیں یا مرنے کے قریب ہوتے ہیں۔ ان کو فوراً چھری پھیر دی جاتی ہے اور مقامی قصائی سستے داموں فوراً ہی خرید لیتے ہیں۔ پھر ان کا گوشت اور قیمہ ہوٹل والوں کو سستے داموں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ سب کے علم میں ہے اور کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے چیک کرنا ہے ان کو اپنی monthly سے غرض ہے۔ عوام اگر مردار یا حرام گوشت کھا کر بیمار ہوں گے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ قبرستان موجود ہیں، آباد ہیں پھر کیا غم ہے۔۔۔۔؟

۸۔ عوام الناس کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاکستان بھر میں ہزاروں گوشت کی دکانیں ہیں۔ ہر قصاب کم از کم ایک ہزار روپے تک ہر ہفتے ادائیگی کرتا ہے۔ اس کے عوض وہ اپنے گھر میں جیسا جانور چاہے ذبح کر کے بیچ سکتا ہے، اسے مذبحہ خانے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے

بس ہفتہ دینا نہ بھولے ورنہ قانون حرکت میں آ جائے گا۔ جب لاکھوں روپے آمدن ہوگی تو تقرری اورٹرانسفر کرنے والے بھی اس گنگا میں اشنان کرتے ہوں گے۔ صرف عوام نے اپنے لیے قبر کی جگہ پسند کر کے رکھنی ہے۔

۹۔ جو مرے ہوئے جانور ذبح کیے جاتے ہیں ان کا گوشت شہر کے ہوٹلوں میں نہایت سستے داموں سپلائی کیا جاتا ہے۔ اوران جانوروں کا left over چڑیا گھر کے جانوروں کے لیے سپلائی کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ جانور مختلف بیماریوں کا شکار ہیں۔ ہر شہر کی یہی کہانی ہے۔ لاہور، کراچی اور دیگر شہروں میں یہ سب زیادہ منظّم طریقے سے کیا جاتا ہے اور کروڑوں کے حساب سے لین دین ہوتا ہے جس سے bottom to top تک کے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ قصابوں کی ایک خفیہ زبان بھی ہے۔ آپ ان کے پاس کھڑے رہیں آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا اور یہ اپنا کام دکھا جائیں گے۔ مثال کے طور پر۔۔۔۔

۱۔ داسر	۱۰ روپے
۲۔ بوڑی	۲۰ روپے
۳۔ آدھ لانگ	۵۰ روپے
۴۔ لانگ	۱۰۰ روپے
۵۔ جوڑ لانگ	۲۰۰ روپے
۶۔ خمس لانگ	۵۰۰ روپے
۷۔ پکی لانگ	۱۰۰۰ روپے
۸۔ خمس پلیاں	۵۰۰۰ روپے
۹۔ بوڑھی بکری	پری
۱۰۔ لاپیا ہوا گوشت	مرے ہوئے جانور کا گوشت
۱۱۔ کالکا	کلیجی
۱۲۔ پھیپھڑا	لاکھواں
۱۳۔ پائے	گونے
۱۴۔ سری	راسی

۱۵۔اوجھڑی	خلجی
۱۶۔کھل	لپڑی
۱۷۔سپالا گوشت	بہت اچھا گوشت
۱۸۔ کھِسہ گوشت	بیمار جانور کا گوشت
۱۹۔ بُٹ	اناڑی

لاہور کے قصاب ترقی پذیر ہیں۔اب ملک میں محصول چونگی کا رواج نہیں ہے۔پہلے محصول چونگیوں کے ٹھیکے ہوا کرتے تھے اور لاہور میونسپل کارپوریشن نیلامی کے ذریعے ان کو نیلام کیا کرتی تھی۔لاہور میونسپل چونگیوں کے ٹھیکے بھی قصابوں کے پاس تھے جو سالانہ کروڑوں روپے میں نیلام ہوتے تھے۔ایک عدالتی حکمِ امتناعی کی آڑ میں کئی سال وہ عیش کرتے رہے اور گورنمنٹ کے اربوں روپے گورنمنٹ کے ہی نمائندوں کی مدد سے ہڑپ کر گئے۔اگر اس کی تفصیلات لکھنے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔بڑے بڑے پردہ نشینوں اور انصاف کے علمبرداروں کے پردے ان کے چہروں سے سرک جائیں گے اور ان کا بے حیا حسن عوام پر ظاہر ہو جائے گا۔اس وطنِ عزیز کو لوٹنے میں اپنی اپنی حیثیت میں کوئی ذرا سی بھی بھول چوک نہیں کرتا۔گزشتہ ۷۲ سالوں سے متواتر اس ملک کو حیلے بہانوں سے لوٹا جا رہا ہے۔ہمیں اور ہماری آئندہ نسلوں کو غیر ملکی کمپنیوں کے پاس گروی رکھ دیا گیا ہے۔ہم کیا کریں،کونسا دروازہ کھٹکھٹائیں؟لاکھوں خرچ کر کے انصاف دہلیز پر دینے والوں کے پاس جاتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں کہ تمھارا کیا حق ہے۔ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ جمہوری دور ہے اور میں جمہور ہوں۔مجھے پورا حق ہے پوچھ پریت کرنے کا۔بجائے ہماری التجا کو قانونی نقطہ نگاہ سے پرکھنے کے خود اور اپنے دیگر ماہرین سمیت اس حق کو کچلنے کے لیے اپنی پوری قابلیت استعمال کی جاتی ہے۔ہر کسی کو اپنے اپنے حصے کی فکر ہے جبکہ وطن لہولہان ہے۔۔۔

گوشت کے فوائد اور نقصانات

گوشت بطور غذا اور دوا دونوں صورتوں میں مفید ہے۔اس کی تاثیر گرم تر ہے۔خون اور وزن بڑھاتا ہے۔بادی کو دور کرتا ہے۔طاقت دیتا ہے۔بدن کو موٹا کرتا ہے۔ممسک ہے۔چربی پیدا کرتا ہے۔دماغ کو کُند کرتا ہے۔جن ممالک میں گوشت زیادہ کھایا جاتا ہے وہاں کے لوگ جنگ جو ہوتے ہیں۔سب سے

زیادہ گوشت افغانی اور آفریدی کھاتے ہیں۔ جدید سائنسی رپورٹ کے مطابق گوشت میں خون، گوشت، نمک اور پانی پیدا کرنے والے اجزاء ہوتے ہیں۔ گوشت کی چربی میں وٹامن A پایا جاتا ہے جس سے ہڈیاں اپنی غذا حاصل کرتی ہیں۔ گوشت معدے میں سبزیوں کی طرح سادہ طریقے سے ہضم نہیں ہوتا۔ اس کی پروٹین اور چربی نظامِ ہضم پر بہت دباؤ ڈالتی ہے۔ جس کی وجہ سے گردوں کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات گوشت زیادہ کھانے سے یورک ایسڈ زیادہ ہو جاتا ہے جس کو گردے با آسانی خارج نہیں کر سکتے۔ گوشت بدن میں صفرا بھی پیدا کرتا ہے۔ کثرتِ گوشت خوری سے مثانے اور گردوں کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جگر اور دل کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے گوشت کا استعمال کم کرنا چاہیے۔ گوشت میں ساگ سبزی وغیرہ ڈال کر پکانا زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اس طرح اس کے فاسد مادے کم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا دف ختم ہو جاتا ہے۔

گوشت کی اقسام وفوائد

ا۔ بکرے کا گوشت: گرم تر اور طاقت بخش ہے۔ خون پیدا کرتا ہے۔ مقوی باہ ہے۔ تپ دق اور کمزوری میں اس کی یخنی بہت مفید ہے۔ بکرے کے جس عضو کا گوشت کھایا جائے انسان کے اسی عضو کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن بکرے کی کلیجی مرگی کے مریض کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

۲۔ بھیڑ کا گوشت: بھیڑ کا گوشت گرم تر اور بکری کے گوشت سے دوسرے درجے پر ہے۔ باقی فوائد و نقصانات بکرے جیسے ہیں۔

۳۔ گائے کا گوشت: گرم اور خشک ہے۔ موادی امراض پیدا کرتا ہے۔ خون کو خراب اور اپھارا پیدا کرتا ہے۔ دماغ میں زہریلے مواد پیدا کرتا ہے۔ گنٹھیا اور دیگر دردوں کے مریض کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ ہونٹوں اور مسوڑھوں میں سوجن پیدا کرتا ہے۔ دیر ہضم ہے۔ حکماء کے مطابق گائے کا گوشت وبا لیکن دودھ شفا اور مکھن دوا ہے۔

۴۔ مرغ کا گوشت: گرم تر اور زود ہضم ہے۔ خون، گوشت، چربی، ہڈی دیرج کی طاقت بڑھاتا ہے۔ بھوک کو تیز کرتا ہے۔ جسم کی طاقت بڑھاتا ہے۔ جسم کو خوبصورت بناتا ہے۔ اسکا شوربہ گرمی کے علاوہ ہر قسم کے بخار میں مفید ہے۔ تپ دق میں بھی بے حد مفید ہے۔ کم عمر مرغ کا گوشت ذائقہ دار اور طاقت بخش بھی

ہوتا ہے۔

۵۔ بٹیر کا گوشت: گرم معتدل ہے۔ بدن کو موٹا کرتا ہے۔ طاقت دیتا ہے۔ کمزوری معدہ میں بہت مفید ہے۔ بھوک لگاتا ہے۔ ہلکا قابض ہے۔

٦۔ تیتر کا گوشت: خواص میں بٹیر کے گوشت سے بہتر ہے۔ باقی تمام خوبیاں بٹیر کے گوشت سے ملتی جلتی ہیں۔

گوشت انسانی جسم کو پروٹین، وٹامن اے، وٹامن بی، وٹامن سی (گوکہ گوشت میں وٹامن سی کم ہوتی ہے)، وٹامن ای، فولاد، کیلشیم، فاسفورس وغیرہ فراہم کرتا ہے مگر پہلی شرط یہ ہے کہ گوشت جس بھی جانور یا پرندے کا ہو وہ صحت مند ہونا ضروری ہے۔ دیگر صورت میں نہ صرف انسانی جسم پر اس کے برے اثرات ہوں گے بلکہ جان کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

بات گدھے کے گوشت سے شروع ہوئی تھی۔ گدھے کے گوشت کی تاثیر ملاحظہ فرمائیں:

جناب علامہ محمد نجم الغنی رام پوری اپنی مایہ ناز تصنیف خزائین الادویہ میں فرماتے ہیں کہ گدھے کا گوشت گرم، خشک، نہائیت غلیظ اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ جبکہ جالینوس نے اپنی کتاب الاغذایہ میں لکھا ہے کہ گدھے کا گوشت نہایت غلیظ اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ اس سے جو خون بنتا ہے وہ بہت خراب ہوتا ہے۔ معدے کے لیے یہ گوشت بے حد برا ہے۔ جو لوگ یہ گوشت کھاتے ہیں اُن کا مزاج قریب قریب گدھے جیسا ہو جاتا ہے۔ دوسرے چوپایوں کے مقابلے میں گدھے کا گوشت سب سے زیادہ خراب ہے کیونکہ یہ امراضِ سودائی پیدا کرتا ہے۔ حکیم جالینوس مزید لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص گدھے کا گوشت کھا کر بدن میں کھچاوٹ محسوس کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دست آور جوارشات استعمال کرے یا فوراً انیما (حقنہ) کرائے اور فوراً اس کو اپنے معدے سے نکالے کیونکہ یہ ہضم ہونے میں تلخ ہے۔ صفرا اور بلغم پیدا کرتا ہے۔ البتہ اس کی کلیجی مرگی کے مریض کے لیے شفا ہے۔ جالینوس نے ایک فائدہ اور بھی لکھا ہے جسے میرا قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے آپ علامہ نجم الغنی رام پوری کی تصنیف خزائن الادویہ، جلد نمبر 6، صفحہ ١٦ تا ١٧ پڑھیں۔

قارئین کے علم کے لیے عرض ہے کہ ملک چین میں گدھوں کی باقاعدہ فارمنگ ہوتی ہے اور بہت شوق سے اس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ کیا گدھے کا گوشت حلال ہے یا حرام۔۔۔؟ میں اس بحث میں نہیں الجھنا

چاہتا۔ آپ صحیح بخاری کی حدیث نمبر 1196 اور حدیث نمبر 5492 ملاحظہ فرمالیں۔ اور اگر آپ آن لائن ہیں تو Islam QA.Info سے تفصیلاً معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ نبی کریمؐ کا فرمان ہے کہ اگر کسی بھی کھانے والی چیز سے کراہت محسوس ہو تو وہ تمھارے لیے مکروہ ہے۔ وہ چیز ہر گز نہ کھاؤ۔

گوشت کس طرح کا کھانا چاہیے؟

اگر آپ بازار سے ذبیح گوشت خریدتے ہیں تو گوشت مندرجہ ذیل صفات کا حامل ہونا چاہیے۔

۱۔ اگر گوشت نَر کا ہے تو بدبودار نہ ہو۔

۲۔ اگر مادہ کا ہے تو وہ بال بچے دار نہ ہو بلکہ جوان اور صحت مند ہو۔

۳۔ گوشت پریشر والا یا پانی میں ڈوبا نہ ہو۔

۴۔ جانور کے جوڑ کی ہڈی ہلکے نیلے رنگ کی ہونی چاہیے جیسا blue flame ہوتا ہے۔

۵۔ جانور کے لب اور پب دیکھ کر گوشت خریدنا چاہیے۔ اگر لب اور پب پر صحت مند چربی نہیں ہے تو یہ گوشت بیماری کا گھر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایسا جانور شدید بیمار اور قریب المرگ تھا یا مر چکا تھا۔

۶۔ قصاب کا بنا بنایا قیمہ کبھی نہ خریدیں بلکہ اپنے سامنے بنوائیں اور قصاب پر کڑی نظر رکھیں۔ کیونکہ قیمہ بناتے بناتے بھی وہ مشین میں کچھ آلائشیں ڈال دیتا ہے۔

۷۔ قصاب کی قسموں پر ہر گز یقین نہ کریں کیونکہ اُن کے نزدیک دکانداری میں قسموں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لیے گاہک کو متاثر کرنے کے لیے بڑی بڑی قسمیں کھا جاتے ہیں اور شریف آدمی اپنی شرافت میں اس کی بات کو سچ سمجھ لیتا ہے۔

۸۔ گردن، چانپ، پُٹھ، دُبچی اور جوڑ کا گوشت حکماء کے نزدیک مریض کے لیے بہترین ہے۔

۹۔ نبی کریمؐ کو جانور کی دستی یعنی اگلی ٹانگوں کا گوشت پسند تھا۔

۱۰۔ جانور کی اگلی دائیں ٹانگ کا گوشت بائیں ٹانگ کے گوشت سے افضل ہے جبکہ اگلی ٹانگوں کا گوشت پچھلی ٹانگوں کے گوشت سے افضل ہے۔

۱۱۔ اگلی دائیں ٹانگ کا گوشت کنجی دستی کہلاتا ہے اور اگلی بائیں ٹانگ کا گوشت جیٹھی دستی کا گوشت

کہلائے گا۔ کنجی دستی وزن میں جیٹھی دستی سے ہلکی ہوگی۔

۱۲۔ گوشت ہمیشہ ہڈی والا کھانا چاہیے۔ بغیر ہڈی کا گوشت ذائقے اور nutritional value میں ہڈی والے گوشت سے کم ہوتا ہے اور صرف قیمے کے لیے موزوں ہے۔

۱۳۔ چوپائے زمین پر بیٹھ کر آرام کرتے ہیں جبکہ اس وقت ان کا سینہ زمین سے لگا ہوا ہوتا ہے۔ جانور کے جسم کا جو حصہ بھی زیادہ تر زمین سے لگا رہے اس کا گوشت دوسرے حصوں کے گوشت سے کوالٹی میں کمتر ہوتا ہے۔ کیونکہ زمین پر اس کا گوبر اور پیشاب ہوتا ہے اور جانور اسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔

آخر میں قارئین کرام کی خدمت میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ گوشت ضرور کھائیں مگر یاد رکھیں کہ مُردہ جانوروں کا گوشت، گھوڑے، گدھے، کچھوے اور بیمار جانوروں کا گوشت قصابوں کی دکانوں، ہوٹلوں اور کڑاہی گوشت کی دکانوں پر کھلے عام فروخت ہو رہا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ گوشت کی پہچان رکھیں اور خود کو مع اپنے خاندان کے موذی امراض سے بچائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔۔۔ آمین!

نواں باب

چائے کہانی

(فوائد ونقصانات)

چین میں چائے کی پیدائش کی کہانی:

مؤرخ کچھ اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ 2737 BC میں شہنشاہ Shen Nung ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھا۔اور اسکا ملازم اسکو ایک پیالہ گرم پانی دے رہا تھا کہ ہوا کی دوش پر اڑتے ہوئے چند سوکھے پتے گرم پانی کے پیالے میں گر گئے جس کی وجہ سے پانی رنگین ہو گیا۔ چونکہ شہنشاہ بذاتِ خود ایک مشہور ماہرِ نباتات وطب تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان پتوں کو HERBAL ادویات کے طور پر آزمائے گا۔ نتیجتاً اسکے تجربات نے ثابت کیا کہ نباتاتی طور پر چائے ایک comellia sinensis ہے جسکا مطلب کچھ یوں نکلتا ہے:

It is a species of ever green shrub whose leaves are used to produce tea.

مزید اسکی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوئی کہ اسکے پتے Infusion ہیں یعنی:

A drink prepared by soaking tea leaves or herbs in liquid

2737 B.C میں چائے کا یہ پہلا پیالہ تھا جو شہنشاہ شین ننگ نے نوش فرمایا۔اُس چائے کی شکل اُس وقت کیسی بھی ہوگی مگر یہ ایک حقیت ہے کہ چائے نوش کرنے والا وہ دنیا کا پہلا شخص تھا۔اس سے پہلے 206BC میں چین پر حکومت کرنے والے شہنشاہ ہان اور پھر 220AD میں حکومت کرنے والے شہنشاہ تانگ کے مقبروں میں بھی چائے پائی گئی ۔ان وجوہات کی وجہ سے آپ چائے کے قدیم ترین ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چائے کا بطور نباتاتی دوا استعمال شہنشاہ تانگ کے دور حکومت میں ہوا اور اسکی دریافت جنوب مغربی چین سے ہوئی۔اسی دور کے ایک نباتاتی ماہر Mr.Hua Tuo نے چائے کی خصوصیت پر ایک طبی مضمون بھی لکھا۔جس میں مصنف نے اسکو بطور دوا استعمال کرنے اور اسکے فوائد اور

نقصانات پر سیر حاصل بحث کی۔ دنیا میں چائے پر لکھی جانے والی ایک مکمل اور جامع کتاب بھی چین میں ہی Mr. Luyu نے لکھی۔ (Cha ching) /Tea Classic کتاب کے شائع ہوتے ہی چائے جاپانی Buddhist monks کے ذریعے جلد ہی جاپان میں مقبول ہوگئی اور جاپان کا قومی مشروب بن گئی۔

چین میں چائے ہربل دوا کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ جہاں سے پرتگیزی مبلغوں اور تاجروں نے 16th صدی میں اسکو پرتگال میں متعارف کرادیا اور 17th صدی میں انگریز اسکو برطانیہ لے گئے۔ آخرکار انہوں نے ہندوستان میں چین کی اجارہ داری ختم کرنے کے لئے اسکو ہندوستان میں متعارف کرادیا۔ 17th صدی کے شروع میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک بحری جہاز چین سے ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) کے لئے گرین ٹی کے پتے لے کر پہنچا جبکہ اس سے پہلے ہی 1636ء میں فرانس اس کے بارے میں جان چکا تھا اور چین سے چائے کے پتے فرانس پہنچ چکے تھے۔

سولہویں صدی کے وسط میں چائے نوشی ایک فیشن بن گئی لیکن صرف امیر لوگ اسکو اپنے استعمال میں لاسکتے تھے۔ کیونکہ اس وقت کا یہ مہنگا ترین مشروب تھا۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے اسکو تجارتی بنیادوں پر چین سے درآمد کرنا شروع کیا کیونکہ وہ مشنری اور سوداگروں کے بھیس میں مشرق میں قیام پذیر تھے۔ مگر سولہویں صدی کے آخر میں ولندیزیوں (ڈچ) نے پرتگالیوں کی مشرق کی سمت والے بحری راستوں کی اجارہ داری ختم کرنے کے لئے براستہ جاوا ایک کاروباری چوکی قائم کرلی اور اپنے ملک ہالینڈ کیلئے پہلا بحری جہاز چین سے چائے کا روانہ کیا۔ یہ دنیا کی پہلی بڑی چائے کی تجارت تھی۔ چائے نوشی ہالینڈ کا فیشن ایبل ڈرنک بن گئی لیکن ابھی بھی صرف امیر لوگ ہی اسکو خرید سکتے تھے۔ 1600ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی دنیا بھر سے ہر قسم کا مال برطانیہ میں درآمد کرنے والی بہت بڑی کمپنی تھی اور اس کی اجارہ داری تھی۔ لیکن برطانیہ میں چائے شروع شروع میں زیادہ مقبول نہ ہوسکی۔ برٹش بحری جہازوں کے ملاح اپنی ذاتی حیثیت میں چین سے اپنے عزیز و اقارب کے لئے چائے بطور تحفہ لے کر آتے رہے۔

ستمبر 1658 میں Mercureus Politic US نامی ایک اخبار میں اشتہار چھپا کہ وہ چینی مشروب جسکو چین میں Teha اور دوسرے ممالک میں Tay اور Tee کے نام سے پکارا جاتا ہے لندن

کے پہلے کافی ہاؤس جو 1652ء میں قائم کیا گیا تھا میں برائے فروخت ہے۔ اب بھی لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی اور چائے لندن میں دیگر ممالک کی طرح شہرت نہ پا سکی۔ برطانیہ میں چائے لوگوں میں اس وقت مقبولیت کی معراج پا گئی جب Charles II of Britian کی شادی پرتگال کی شہزادی Catherine Braganza سے ہوئی۔ چائے شہزادی کی پہلی محبت تھی اور وہ بہت اہتمام سے چائے نوشی کرتی تھی کیونکہ پرتگال میں چائے شاہی مشروب سمجھا جاتا تھا۔ امیر، وزیر، درباری سب اسکو فیشن سمجھ کر نوش کرتے تھے۔ برطانیہ میں شہزادی کے شوق اور اسکے سٹائل کی نقل کرتے ہوئے چائے لوگوں میں مقبول ہوتی چلی گئی۔ آخر کار ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانیہ میں چائے کی امپورٹ شروع کر دی۔ پہلا آرڈر 1664ء میں 100 ٹن چائنا ٹی کا دیا جو جاوا سے Book ہونا قرار پائی۔ اب آہستہ آہستہ چائے برطانیہ میں مقبول ہوتی گئی اور اسکا استعمال امیر لوگوں سے مڈل کلاس لوگوں تک پہنچ گیا۔ اسکی درآمد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار 1689ء میں گورنمنٹ آف برطانیہ نے اسپر 25 پنس فی پاؤنڈ ٹیکس عائد کر دیا جسکی وجہ سے یہ مزید مہنگی ہو گئی اور اسکی فروخت نہ ہونے کی برابر ہو گئی۔ گورنمنٹ آف برطانیہ نے اپنے لگائے ہوئے ٹیکس پر نظر ثانی کی اور 25 پنس سے کم کر کے 05 پنس کر دیا۔ Tea اب ہر کافی ہاؤس میں دستیاب تھی۔ لوگ اس کو حرارت، آرام اور سکون کے لئے ایک اچھا مشروب خیال کرتے تھے۔ ورکنگ کلاس میں Tea بہت مقبول تھی۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے اسکی مانگ میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ برطانیہ میں چائے کی مقبولیت کا اندازہ آپ ان اعداد و شمار سے لگا سکتے ہیں کہ 5-Million پاؤنڈ سالانہ گورنمنٹ امپورٹ کرتی تھی جبکہ سمگلر 7-Million پاؤنڈ سالانہ سمگل کرتے تھے۔

چائے کی غیر قانونی سمگلنگ پر گورنمنٹ کا کوئی کنٹرول نہیں ہو سکتا تھا۔ سمگلر زیادہ منافع کے لالچ میں دیگر درختوں کے پتے بھی استعمال کرتے جنہیں پہلے رنگ میں ڈبویا جاتا اور پھر سکھا کر پتی میں شامل کر دیئے جاتے۔ لیکن یہ جلد ہی پکڑے گئے کیونکہ رنگے ہوئے پتے چائے کے قدرتی پتوں جیسا رنگ نہیں دے سکتے تھے۔ پھر سمگلروں نے بھیڑوں کی مینگنوں اور زہریلے Copper Carbonate کا آمیزہ ملانا شروع کر دیا تا کہ چائے جیسا رنگ پیدا ہو جائے۔

آخر کار 1784ء میں Prime Minister William Pitt اسمبلی میں چلا اٹھے اور ہاتھ کھڑا کر

کے بولے، ''بس بہت ہو گیا میں مزید لوگوں کی صحت کو برباد اور ہسپتالوں کو آباد نہیں دیکھ سکتا''۔ ٹیکس 119% سے کم کر کے 12.5% کر دیا گیا۔ فوراً ہی قانونی طریقے سے امپورٹ کی گئی چائے کا ریٹ گر گیا۔ اب ہر عام و خاص اسکو خرید سکتا تھا۔ ایک ہی رات میں چائے کی سمگلنگ ختم ہو گئی۔ یہ 05% ٹیکس بھی 1964ء میں ختم کر کے چائے کی امپورٹ کو فری کر دیا گیا۔ آج تک چائے برطانیہ میں ٹیکس فری آئٹم ہے۔ برطانیہ کے لوگ کافی پر چائے کو فوقیت اسلئے بھی دیتے ہیں کہ کافی کے مقابلے میں چائے میں کیفین (Caffeine) بہت کم ہوتی ہے۔ چائے Stressful Feelings کو کم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چائے دل کے امراض اور کینسر کے خلاف انسانی جسم کی مدد کرتی ہے۔ اس میں مختلف Anti oxidants ہوتے ہیں جو انسانی جسم کو unwanted substances سے صاف کرتے ہیں۔ برطانیہ کے تحقیق کاروں نے جہاں چائے کو انسانی جسم کے لئے مفید پایا ہے وہاں کچھ نقصانات بھی بتائے ہیں۔ مثلاً تحقیق کار کہتے ہیں کہ چائے استعمال کرنے والے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ان کے پے در پے استعمال سے Gastric Ulcers ہو سکتا ہے۔ چائے میں Tannic Acid نامی مادہ ہوتا ہے۔ زیادہ چائے استعمال کرنے سے Iron Deficiency اور Anemia ہو سکتا ہے۔ احتیاط کے طور پر کھانا کھانے کے ایک گھنٹہ کے بعد چائے کا کپ لینا چاہیے۔ چائے کا بے دریغ استعمال کرنے والوں کو kidney Diseases اور Liver Diseases ہو سکتی ہیں۔

چائے کے مندرجہ ذیل فوائد بھی ہیں:

1۔ چائے کے Anti oxidants آپکے جسم کو کسی حد تک بڑھاپے کے اثرات سے محفوظ کرتے ہیں اور خوراک کے پائپ سے ماحولیاتی آلودگی کو صاف کرتے ہیں۔

2۔ کافی کے آٹھ اونس کپ میں 135 mg کیفین پائی جاتی ہے جبکہ چائے کے آٹھ اونس کپ میں 30 to 40mg کیفین پائی جاتی ہے اس لئے چائے کافی سے بہتر ہے۔

3۔ چائے نہ استعمال کرنے والوں کے مقابلے میں روزانہ تین کپ Black Tea استعمال کرنے والے لوگوں میں جان لیوا ہارٹ اٹیک کا خطرہ 70% کم ہو جاتا ہے

4۔ تحقیق کے مطابق ایسے اشخاص جو گذشتہ 10 سال یا اس سے زیادہ عرصہ سے تین کپ Black

Tea روازنہ استعمال کر رہے ہیں انکی ہڈیاں زیادہ مضبوط اور صحت مند ہوتی ہیں۔ یہ چائے کے Phyto Chemical کی وجہ سے ہوتا ہے۔

5۔ انگلستان میں لوگ سمجھتے ہیں کہ انکے دانت چائے نے خراب کئے ہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ چائے میں چینی کی وجہ سے دانت خراب ہوتے ہیں۔ چائے تو دانتوں کیلئے بہت فائدہ مند ہے۔ کیونکہ یہ دانتوں کو Tannins and Flouride مہیا کرتی ہے۔ جسکی وجہ سے Plaque سے دانت محفوظ رہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے دانت اور مسوڑھے صاف اور مضبوط رکھنے کے لئے بغیر چینی والی Black Tea استعمال کریں۔

6۔ Researchers نے اپنی 6 سالہ Research کے نتیجے میں چائے کو Immune Defense کے لئے بہت کارآمد پایا۔ وہ مزید کہتے ہیں جب انہوں نے 21[1] مریضوں کو 6 کپ روزانہ Black Tea چار ہفتوں تک متواتر استعمال کروائی تو وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ ان کے خون میں High activity of immune system کی وجہ سے Infection بالکل ختم ہو گیا ہے۔

7۔ اگر آپ اپنے مشروبات میں Black Tea کا اضافہ فرمالیں تو یہ آپکو کینسر سے بھی محفوظ رکھے گی۔ کیونکہ اس کے Anti oxidants یعنی کے polyphenols کینسر کے خلاف ایک مہلک ہتھیار ہے۔

8۔ چائے ایک میڈیکل ڈرنک ہے۔ آپ اسکو ایک دوا کے طور پر استعمال کریں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ Caffeinated مشروب ہماری روزمرہ کی fluid کی ضرورت کی پوری نہیں کرتا کیونکہ Caffeine/Di-uretic یعنی پیشاب زیادہ لاتا ہے۔ یہ اس وقت انسانی صحت کے لئے خطرناک ہے جب آپ 5/6 کپ سے زیادہ استعمال کریں۔ کوئی بھی میڈیسن اگر آپ ایک مقررہ حد سے زیادہ لیں تو وہ آپکی صحت کیلئے خطرناک ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر آپ مقررہ حد کے اندر چائے استعمال کرینگے تو یہ آپ کے اندر fluid ضرورت کو بھی پورا کرے گی۔

9۔ اگر آپ چائے بغیر دودھ اور چینی کے استعمال کریں تو یہ 100% کیلوریز فری ہے اور آپ کو

وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

10۔ چائے آپکے metabolism سسٹم کو بڑھاتی ہے پوری دنیا کے 80% لوگ چائے اور کافی کو بطور مشروب اپنائے ہوئے ہیں۔

چائے کی اقسام:

1۔ کالی چائے

2۔ سرخ چائے

3۔ گرین چائے (اگر شہد کے ساتھ استعمال کی جائے تو زیادہ مفید ہے)

4۔Oolong Tea اسکو ایک بار استعمال کرنے کے بعد محفوظ کرلیا جاتا ہے اور پھر دوسری بار استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر تیسری بار استعمال کیا جاتا ہے۔ تیسری بار اس کا ذائقہ بہت ہی مزیدار ہوجاتا ہے۔

5۔ Premium or Delicate Tea

(Potentiality of Tea)

1۔ Bio active chemicals

2۔ Flavinoids

3۔ Amino Acids

4۔ Vitamins

5۔ Caffeine

6۔ Polysac Harides

چائے ہمارے جگر کیلئے بہت مفید ہے۔ کولیسٹرول کو کنٹرول کرتی ہے۔ کینسر کے خلاف ہماری مدد کرتی ہے۔ ہاضمہ کو بہتر کرتی ہے۔ الرجی سے نجات دیتی ہے۔ لیکن اگر آپ بے حد گرم چائے استعمال کرینگے تو آپ کی زبان اور معدے کو سخت نقصان پہنچائے گی۔ ضرورت سے زیادہ استعمال کریں گے تو سخت نقصان کی موجب ہوگی۔

حکیم محمد سعید ہمدرد یونیورسٹی و ہمدرد فاؤنڈیشن اور دیگر بے شمار رفاحی اداروں کے بانی ہیں اور لاتعداد

کتب کے مصنف بھی ہیں۔ وہ اپنی تصنیف دیہاتی معالج کے صفحہ نمبر 101 پر لکھتے ہیں کہ چائے نشہ آور تو نہیں ہے لیکن جب کوئی شخص اسکو بار بار نوش کرتا ہے تو وہ اسکا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ چائے کے پینے سے بدن میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ تھکن دور ہو جاتی ہے۔ جسم میں چستی اور دماغ میں فرحت محسوس ہونے لگتی ہے۔ پسینہ اور پیشاب کھل کر آتا ہے۔ سردی لگ رہی ہو تو جسم گرم ہو جاتا ہے۔ خراب آب و ہوا کے مضر اثرات سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اسکو بار بار اور لمبے عرصے تک بکثرت پیا جاتا ہے تو بدن میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ قبض رہنے لگتا ہے۔ نظامِ ہضم بگڑ جاتا ہے۔ نیند کم آنے لگتی ہے۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ پیشاب بار بار آنے لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ حکیم صاحب مزید فرماتے ہیں کہ اسکی عادت ڈالنا صحت کیلئے ہرگز مناسب نہیں۔ البتہ اگر سردی اور تھکن دور کرنے کے لئے کبھی کبھی پیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

جناب خوشتر گرامی اپنی مشہور تصنیف صحت و زندگی صفحہ نمبر 220/221 پر رقمطراز ہیں کہ مختلف مزاجوں پر چائے کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ گرم اور عصبی مزاج والوں کیلئے تو یہ سخت مضر ہے۔ اس سے گرمی میں اضافہ ہوتا ہے اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ البتہ سرد اور بلغمی مزاج والوں کیلئے اس کا اعتدال سے پینا کسی حد تک فائدہ مند ہے۔ دماغ اور اعصاب میں تحریک پیدا کرتی جس میں دماغ کا دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے۔ جس سے حواس میں چستی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جسمانی اور دماغی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ دردِ سر، گرانی، نیند اور غنودگی کے غلبے میں چائے کا استعمال مفید ہے۔ اگرچہ بذاتِ خود یہ غذائیت سے یکسر خالی ہے لیکن دودھ اور چینی کی وجہ سے اس میں کچھ غذائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خشکی کے باعث اگر پیاس بار بار لگتی ہو تو چائے کا استعمال سود مند ہے۔ چائے کے جوہر تھیین کے علاوہ اس میں البیومن وڈلمیڑ ین وٹے نین اور معدنی و نباتاتی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ چائے کے زیادہ اور مسلسل استعمال سے جب تھیین زیادہ مقدار میں جسم میں پہنچتا ہے تو طرح طرح کے امراض کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ معدہ اور ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ آنتوں کی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو کر اختلاج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بار بار کی تحریکِ بول سے اعصاب اور مثانہ کمزور ہو جاتا ہے۔ معدہ سست ہو جاتا ہے۔ بھوک نہیں لگتی اور جو کچھ کھایا جاتا ہے وہ اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ چائے مزاج کے اعتبار سے گرم خشک اور پسینہ آور ہے۔ خون کو خراب

کرتی ہے اور نیند کو کم کر کے بے خوابی کی شکایت پیدا کرتی ہے۔

محرک اثرات کے وجہ سے چائے قوت مردمی کو کمزور، مادہ منویہ کو خراب و جریان، احتلام، سرعت انزال کی شکایت پیدا کرتی ہے۔ فرانس کے ایک مشہور ڈاکٹر موسیوالیوی اپنے تجربات کی بنیاد پر لکھتے ہیں کہ جو لوگ چائے بکثرت نوش کرتے ہیں انکی دماغی قوتوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ کانوں میں مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دماغ کی نازک رگیں کمزور اور قوت سامعہ ضعیف ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ دماغ میں اشتعالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔۔ ہاضمہ کمزور ہو جاتا ہے مردانہ بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ ڈاکٹر بلارڈ کے مطابق چائے سے بھوک کا زائل ہو جانا، بدہضمی، زکاوتِ حس، عصبی درد اور ہسٹریا کے دورے پڑنا ایک قدرتی عمل اور زیادہ چائے نوشی کا ردِعمل ہے۔ ڈاکٹر او۔ وی۔ ہلڑ، ڈاکٹر جے۔ ایچ کیسلاگ اور ڈاکٹر کارل جے مرئنس بھی چائے کے مذکورہ بالا اثرات کے قائل ہیں۔

Foods that are killing you slowly but steadily by K.M.Guppta

مندرجہ بالا کتاب کے مصنف ڈاکٹر کے۔ ایم گپتا صفحہ نمبر 32/33/34 پر لکھتے ہیں کہ گھروں، دفتروں، کاروباری میٹنگ، دوستوں، رشتے داروں سے میل ملاقات کے وقت چائے ہماری ثقافت اور روز مرہ زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ اسکا سبب میز بانی کے جذبات کا اظہار تو یقیناً ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ چائے کا ایک کپ آپکے اندر توانائی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتا ہے۔ آپکی تھکاوٹ اور کسلمندی دور ہو جاتی ہے۔ صبح کے وقت لوگ چاق وچوبند ہونے کیلئے چائے لیتے ہیں۔ دن میں اضمحلال دور کرنے کیلئے چائے کی خواہش کرتے ہیں۔ دفاتر اور کام کاج سے واپس آکر اپنی تھکن دور کرنے کیلئے چائے پینا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ ڈرائیور لوگ دن رات لمبی ڈرائیو کے دوران چائے ہی سے تازہ دم ہوتے ہیں۔ دماغی کام کرنے والے افراد کیلئے تو کیفین والے مشروبات کمزوری بن چکے ہیں۔ بظاہر ہمیں تازگی توانائی اور فرحت بخشنے والے یہ مشروبات ہماری صحت کیساتھ کیا ہولناک کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں اسکا علم ہمیں بہت دیر سے ہوتا ہے جب دشمن اپنا کام کر چکا ہوتا ہے۔ چائے میں کیفین پائی جاتی ہے۔ چائے استوائی خطوں میں کاشت کئے جائے والے پودوں کے پتوں کو سُکھا کر حاصل کی جاتی ہے۔

کیفین کا طرزِ عمل!

کیفین کا کیمیائی نام ٹرائی میتھیل زینتھائن ہے۔اپنی خالص ترین شکل میں اسکا ذائقہ کڑوا اور صورت سفید پاؤڈر جیسی ہوتی ہے۔ یہ پانی میں حل ہوجاتی ہے۔آسانی سے خون میں جذب ہوکر تیزی سے دماغ میں پہنچتی ہے اور قابل ذکر انداز میں اثر کرتی ہے۔عام طور پر کیفین کی ایک ڈوز پیئے جانے کے10 منٹ کے بعد خون میں ظاہر ہوجاتی ہے۔30 سے 60 منٹوں کے درمیان اسکا اثر اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔اسلئے کیفین کو سائیکوایکٹو ڈرگ کہتے ہیں۔کیفین دماغ میں"ایڈینوسائن" کے فعل کو روک دیتی ہے۔ یہ بھی ایک سائیکوایکٹو کیمیکل ہے جو پورے انسانی جسم میں پایا جاتا ہے۔

ایڈینوسائن دراصل نیوروٹرانسمیٹرز (ایک عصابی خلیے سے دوسرے اعصابی خلیے تک پیغام پہنچانے والے کیمیکل) کی کارکردگی کو سست کردیتا ہے۔ یہ جسم پر مسکن اثرات مرتب کرتا ہے۔ایڈینوسائن کے پر سکون اور قابو میں رکھنے والے اثرات کے بغیر اعصابی خلیوں کی" گولہ باری" پوری شدت سے جاری رہتی ہے۔کیفین کی موجودگی ایڈینوسائن کے عمل کو روک دیتی ہے چنانچہ متعلقہ فرد پوری طرح متحرک ہوجاتا ہے۔کیفین ایڈرینل گلینڈ کو بھی متحرک کرتی ہے چنانچہ وہ ایڈرینالین نان ایڈینالین اور کارٹی سول ہارمونز کا اخراج بڑھا دیتے ہیں۔ یہ ہارمونز اس وقت خارج ہوتے ہیں جب کوئی فرد مضطرب،زخمی، مشتعل یا بد حواس ہوتا ہے اور اسی وجہ سے لڑنے یا بھاگ جانے کا ردعمل بنتا ہے۔ یہ ہارمونز دماغ کو توانائی مہیا کرتے ہیں۔اس طرح کیفین نہ صرف دماغ کا سٹریس لیول بڑھا دیتی ہے بلکہ ایڈینوسائن کی کارکردگی بھی روک دیتی ہے۔اس کارکردگی کی بدولت سٹریس لیول یعنی دباؤ کی شدت کم ہوجاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ چائے یا کافی سے حاصل کی گئی کیفین ہمیں نہایت مستعدی اور چوکسی کا احساس دلاتی ہے۔ چائے کے ایک کپ میں20 سے لے کر 60 ملی گرام تک کیفین پائی جاتی ہے۔اب آپ فیصلہ خود کرلیں کہ آپ اپنے خون کے دورانیہ میں کتنی کیفین برداشت کرسکتے ہیں۔سبز چائے کالی چائے سے بہت بہتر ہے۔ یہ بلڈ پریشر کو کم کرتی ہے۔خون کی نالیوں کو طاقت ور بناتی ہے۔خون کے کلاٹ (لوتھڑے) بننے کے عمل کو روکتی اور انفیکشن کا علاج کرتی ہے۔ Herbal چائے،کالی چائے سے بہت بہتر ہے اور اسکا نعم البدل بھی ہے۔

تاج العقاقیر۔۔۔ پاک وہند کی جڑی بوٹیوں کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اسے حکیم وڈاکٹر ہری چند ملتانی (گولڈ میڈلسٹ) میڈیکل ریسرچ سکالر نے ترتیب دیا۔ یہ دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ حکیم ڈاکٹر ہری چند ملتانی اس اپنی تصنیف کی جلد نمبر 7 صفحہ نمبر 670/671 پر لکھتے ہیں کہ چائے مشہور نام ہے جبکہ ہندی، سنسکرت، نیپالی، مدارسی، گجراتی، بنگالی میں چا کہتے ہیں۔ مراٹھی میں چکا، انگلش میں Tea اور لاطینی نام Camellia Thea ہے۔ چائے کا پودا ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے جو لگ بھگ دو فٹ سے پانچ فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ اسے پھول لگتے ہیں۔ چائے ہری اور کرشنا دو قسم کی ہوتی ہے۔ ہری چائے میں سے خوشبو آتی ہے۔ اسکے پتوں میں سے لیمن گراس نامی تیل نکلتا ہے جسکو مختلف ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چائے کی بہت ساری اقسام میں سے Imperial Tea سب سے اچھی مانی جاتی ہے۔ ہندوستان، آسام، نیلگری، ڈیرہ دون، ٹیکم، دارجیلنگ اور دیگر کئی مقامات پر اسکی کاشت کی جاتی ہے اور دیگر ممالک کو بھیجی جاتی ہے۔

چائے میں مندرجہ ذیل مرکبات مندرجہ ذیل تناسب سے پائے جاتے ہیں۔

1۔ کیفین یا تھینس 3%

2۔ سٹینک ایسڈ 12% to 15% جو کشائمل کی صورت میں ہوتا ہے اور انسانی جسم کو زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔

3۔ اس کا تیسرا جز اڑنے والا تیل یعنی کے آئل آف فراری جو 1/2% ہوتا ہے۔ چائے کا مزاج گرم اور خشک ہے اور اسکی حد مقدار دو سے تین گرام ہے۔ حکیم ڈاکٹر ہری چند ملتانی کے مطابق چائے پینے سے تھکن دور ہو جاتی ہے اور کام کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ نشاستہ والی غذائیں مثلاً کیک بسکٹ، پیسٹری یا تلی ہوئی چیزیں کھانے سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ خالص چائے میں کوئی غذائیت نہیں ہوتی۔ شکر، ملائی اور دودھ ملانے سے اس میں معمولی غذائیت شامل ہو جاتی ہے اور اسکے مضر اثرات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ چائے کے متعلق ماہرین طب کی رائے ہے کہ چائے کا کثرت اور متواتر استعمال اتنا ہی مضر صحت ہے جتنا شراب کا استعمال۔ اسکو غذا کے بدل میں کبھی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ چائے کے زیادہ استعمال سے غشی

وکسلمندی اور چڑچڑاپن وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔ہائی بلڈ پریشر والوں کیلئے چائے سخت نقصان دہ ہے۔چائے بنانے کا کم نقصان دہ طریقہ یہ ہے کہ ابلتے ہوئے پانی کو چائے کی پتی والے برتن میں ڈال دیں اور اسکو مزید نہ پکائیں۔زیادہ دیر ابالنے سے ٹینک ایسڈ کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چائے قابض ہو جاتی ہے۔چائے کی بڑی پتی کے مقابلے میں باریک پتی میں زیادہ ٹینک ایسڈ پایا جاتا ہے۔اسلئے ہوٹل والے کم وقت میں اچھا رنگ لانے کیلئے کڑک چائے بناتے ہیں۔ایسی کڑک چائے اگر زیادہ یا روزانہ استعمال کی جائے تو کمزوری عود کر آجاتی ہے۔ عادت ہو جانے پر اگر وقت پر چائے نہ ملے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔سستی اور بے چینی ہو کر ہاتھ پاؤں میں درد شروع ہو جاتا ہے۔نیند نہیں آتی اور کوئی کام بھی ٹھیک سے نہیں ہو پاتا۔ چہرے کی تازگی ختم ہو جاتی ہے اور خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔سینے میں جلن ہونے لگتی ہے۔

1. Piles 2. Spermatorrioea

3. Noctornal emission 4. nervous palpitation

اس کے علاوہ بواسیر و جریان واحتلام وخفقان کے مریضوں کیلئے سخت نقصان دہ ہے۔ایسے مریضوں کو چائے ہرگز ہرگز نہیں لینی چاہیے۔چائے کو دوا کی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔کیونکہ یہ ایک نباتاتی دوا ہے اور اس کے فوائد بھی ہیں۔بخار میں خوشبو والی گرین ٹی لینے سے آنتوں اور مثانہ کی صفائی ہو جاتی ہے۔ غلاظت سے نجات مل جاتی ہے۔جگر ہلکا ہو جاتا ہے اور بخار کا زہر جسم سے باہر نکل جانے پر بخار کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔جسم میں نئی تازگی آجاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی اگر چائے میں چینی، ادرک، تلسی کے پتے وسونف، دار چینی ملائی جائے تو پیٹ کی گیس، موسمی بخار، ہچکی، پیٹ کا درد وغیرہ جیسے امراض دور ہو جاتے ہیں۔

شدید نزلہ زکام (Influenza) کا علاج

گل بنفشہ	3 گرام
ملٹھی چھلی ہوئی	3 گرام
چائے کی پتی	2 گرام

چینی 1 1/2 گرام

ملا کر چائے بنائیں اور نوش فرمائیں۔نزلہ اور زکام سے نجات پائیں)

آگ، گرم پانی، گرم تیل یا تیزاب سے جلنے کی صورت میں چائے کے ابلے ہوئے پانی میں کپڑے کی پٹی بھگو بھگو کر جلی ہوئی جگہ پر رکھیں۔تین گھنٹے تک جتنی بھی پٹیاں رکھ سکتے ہوں رکھیں۔انشاء اللہ پھپھولے نہیں بنیں گے اور جلد پہلے جیسی ہو جائے گی۔موٹے اور زیادہ خوراک کھانے والے لوگوں کے لیے چائے کا مناسب استعمال فائدہ مند ہے۔دبلے پتلے اور کمزور لوگوں کو چائے نہیں پینی چاہیے۔پھر بھی اگر پینی ہو تو زیادہ دودھ ڈال کر پئیں۔صبح کے ناشتے کے ساتھ ہلکی چائے استعمال کر سکتے ہیں۔دوپہر اور رات کے کھانے کے ساتھ چائے لینے سے نقصان ہوتا ہے۔دائمی قبض (Constipation) کے مریضوں کو چائے کا استعمال ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔دن میں ایک یا دو بار سے زیادہ چائے ہرگز ہرگز نہیں پینی چاہیے۔موسم سرما یا برسات میں چائے لینا زیادہ نقصان دہ نہیں لیکن موسم گرما میں بہت نقصان دہ ہے۔مندرجہ ذیل بیماریوں میں بھی چائے لینا نقصان دہ ہے۔

1۔ بے خوابی(Insomnia) 2۔ باؤ گولہ(Hysteria)
3۔ اسہال(Diarrhoea) 4۔ پیچش(Desentery)
5۔ سنگرہنی(Chronic Diarrhoea) 6۔ بواسیر(Piles)
7۔ Hydrospermia 8۔ دردگردہ(Rena)

وہ لڑکیاں جو زیادہ چائے استعمال کرتیں ہیں اکثر کثرت تطمث یعنی Menorrhagia میں مبتلا رہتی ہیں۔جسکی وجہ سے کئی دوسری بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ان لڑکیوں کو چاہیئے کے وہ چائے لینا فوراً بند کر دیں۔گرم مزاج والے خواتین وحضرات اگر نہار منہ چائے لیں گے تو انہیں دمہ۔دق۔کھجلی اور خشکی ہو سکتی ہے اسلئے انہیں چاہیے کے چائے میں دودھ زیادہ استعمال کریں۔

بعض لوگ ایک پیالہ چائے تیار کرنے میں 15 سے 12 گرام چائے کی پتی استعمال کرتے ہیں اور بہت دیر تک ابالنے کے بعد برائے نام دودھ ڈال کر تیز چینی کے ساتھ استعمال میں لاتے ہیں۔یہ چائے

نہیں بلکہ جوشاندہ ہے اور ایسی چائے یا جوشاندہ پینے والے نقصان میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے دانت کمزور، ہاضمہ خراب، ڈائریا ہوکر رعشہ Charea ہونے کا خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ علامہ محمد نجم الغنی رام پوری اپنی مایہ ناز تصنیف خزائن الادویہ کی جلد نمبر 3 صفحہ نمبر 342 پر لکھتے ہیں کہ چائے کے پھول نہایت خوشبودار اور سفید جنگلی گلاب کی مانند ہوتے ہیں۔ جب پھول کھلتے ہیں تو جنگل خوشبو سے مہک جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کے چائے کی تین اقسام ہوتی ہیں۔

1۔سفید: چائے کی یہ قسم سب سے اعلیٰ اور قوی ہوتی ہے لیکن عام دستیاب نہیں ہوتی۔ قیمت میں بھی بہت مہنگی ہوتی ہے۔

2۔سبز: چائے کی یہ قسم درمیانے درجے کی ہوتی ہے اور عام دستیاب ہے۔اس میں خشکی بہت ہوتی ہے۔

3۔سیاہ: سب سے کمزور قسم اور ارزاں ہونے کی وجہ سے عام دستیاب ہے۔

چائے کی سب سے عمدہ قسم سفید ہے جو تیسرے درجے میں گرم ہے۔ درمیانی قسم دوسرے درجے میں گرم خشک ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کے شراب پینے سے جو رطوبات پیدا ہوتیں ہیں انہیں چائے فنا کر دیتی ہے اور چائے کے دیگر فوائد کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ

1۔ ارواح اور قوتوں کو قوی کرتی ہے۔

2۔ معدے کو قوت دے کر طبیعت میں فرحت نشاط پیدا کرتی ہے۔

3۔ سرد مزاج میں مقوی باہ ہے اور ذکر کی ایستادگی زیادہ کرتی ہے۔

4۔ پیشاب آور ہے۔لطیف اور لیسدار خلطوں کی چھانٹی ہے۔ عطش کاذب کو بجھاتی ہے، پسینہ لاتی ہے۔

5۔ دردِ سر کو رفع کرتی ہے معدے کی سوزش کو دور کرتی ہے۔

6۔ مصفی خون ہے۔

7۔ بدن اور رخساروں کے رنگ کو صاف کرتی ہے۔

8۔ ریاح اور ورم کو تحلیل کرتی ہے۔

9۔ طبیعت میں گرمی پیدا کرتی ہے۔

10۔ ہاضم ہے۔

11۔ منہ سے پیاز۔لہسن اور شراب کی بد بو کو دور کرتی ہے۔

12۔ ضعف گردہ، سردی وقطرہ قطرہ پیشاب آنے میں دیگر ادویات کے ساتھ مفید ہے۔

13۔ بواسیر کے درد کو ساکن کرتی ہے۔

14۔ امراض قلب میں مفید ہے۔

15۔ نہار منہ اور تیز گرم پینے سے سخت نقصان دیتی ہے۔

16۔ جس قسم کی ادویات کے ساتھ نوش کی جائیگی اسی قسم کا فائدہ دے گی۔ بلکہ دیگر ادویات کا اثر بھی دوآتشہ کر دے گی۔مثلاً اگر ہڑیڑ، آملہ اور دیوندر چینی کے ساتھ جوش دیکر پئیں تو صفرا اور بلغم سے نجات مل جائیگی۔

17۔ عود ہندی۔عنبر۔زعفران۔اور دار چینی کے ساتھ استعمال کریں تو حرارت غرزی کو طاقت دیگی۔

18۔ اگر ثقلب مصری۔ دار چینی۔عنبر اور دودھ کے ساتھ استعمال کریں تو قوت باہ بڑھائے گی اور کثرت کی مفرط کو دور کرے گی۔

19۔ اگر پودینہ اور گل بابونہ کے ساتھ استعمال کریں تو تولنج ریحی Colic جاتا رہتا ہے۔

20۔ بنفشہ اور چھلی ہوئی ملٹھی کو چائے میں جوش دیکر نوش کرنے سے نزلہ زکام کا خاتمہ ہوتا ہے۔

21۔ زعفران والی چائے

چوب چینی اور سونف والی چائے

اسگندنا گوری والی چائے

معطگی رومی والی چائے

عرق مشکِ بیدل اور عرق گلاب والی چائے

بادیان خطائی اور الائچی والی چائے

دل ودماغ کو طاقت دیتی ہے اور زچہ کے ہاں ولادت کے عمل کو آسان بناتی ہے۔ڈاکٹر صاحبان وحکیم

صاحبان کے تجربوں کے مطابق چائے کے کثرت استعمال سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ دانت کمزور ہو جاتے ہیں۔ رعشہ کی شکایت ہوتی ہے بعض کو دست لگ جاتے ہیں۔

1838ء میں چائے سے Chothyan نامی ایک جوہر بھی نکالا گیا تھا۔ بعض اشخاص میں چائے کے استعمال سے دل کی دھڑکن کا عمل بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دماغ کو تحریک دیتی ہے ایک پیالی چائے پینے سے سستی اور تھکن دور ہو جاتی ہیں۔ ہر قسم کی دماغی محنت میں آسانی معلوم ہوتی ہے اور کام کرنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے۔ افیون اور جوہر افیون کے زہر میں چائے سے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسے مریض دیکھے گئے ہیں جن میں کثرت چائے نوشی سے زہریلے اثرات پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک ایسے مریض کا ذکر ضروری ہے جو روزانہ 35-30 پیالے چائے استعمال کرتا تھا۔ اسکی بھوک بالکل ختم ہو کر ہاضمہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ وہ چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔ کمزوری خون کا مریض بن کر قلبی اور تنفّسی تکالیف میں مبتلا تھا اور آخر کار چائے کے ہاتھوں اگلے جہاں کوچ کر گیا۔ گرم مزاج والوں کو نہار منہ اور دیگر لوگوں کو خشکی کھجلی۔ دمہ اور سیل جیسی بیماریوں میں چائے کا استعمال ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ چائے ان بیماریوں میں اضافہ کرتی ہے۔ چائے کا توڑ: گرم مزاج والوں کیلئے چائے کا توڑ بکری کا دودھ ہے۔ سرد مزاج والوں کیلئے لونگ، مشک، بادیان، خطائی دار چینی اور سونٹھ (ادرک) والی چائے ہے۔

چائے دنیا میں سب سے زیادہ پیا جانے والا مشروب ہے پوری دنیا میں روزانہ چائے کے اربوں کپ پیے جاتے ہیں۔ روس چائے کا سب سے بڑا Importer ہے۔ دوسرے نمبر پر مصر اور تیسرے نمبر پر پاکستان ہے۔ پاکستان سالانہ 200,000 ہزار ٹن چائے دنیا کے اکیس ممالک سے import کرتا ہے۔ پاکستان جیسے under-developed ملک کیلئے یہ ایک بہت بڑی عیاشی ہے۔ پاکستان اپنے قرضوں سے کئی گنا زیادہ زرمبادلہ چائے کی import کرنے پر خرچ کرتا ہے۔ اس عیاشی کا احساس نہ حکمرانوں کو ہے اور نہ ہی عوام کو ہے۔ شروع شروع میں چائے بے حد مہنگی تھی۔ انگریزوں نے برصغیر میں چائے کاشت کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار برٹش گورنمنٹ نے 1848ء میں اپنے ایک جاسوس رابرٹ فارچیون کو خفیہ مشن پر چین روانہ کیا تا کہ چائے کے بیج اور کاشت کے طریقے اور

پودے کی آبیاری وغیرہ کو متعلق پوری معلومات حاصل کی جا سکے۔ اس جاسوس کا تعلق سکاٹ لینڈ سے تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک سیاح ہونے کے علاوہ ماہر نباتات بھی تھا۔ رابرٹ فارچیون اپنے مشن سے کامیاب وکامران لوٹا اور آسام (انڈیا) کے علاقے میں چینی (Chinese) چائے کی کاشت نہائیت کامیابی سے ممکن ہو سکی۔ اسطرح چین کی اجارہ داری کو ختم کر دیا گیا۔

حرفِ آخر کے طور پر صرف اتنا عرض کرونگا کہ چائے ایک ہربل میڈیسن ہے۔ اسکو بطور میڈیسن ہی استعمال کیا جانا چاہیے نہ کہ بطور خوراک۔ اب اپنے متعلق فیصلہ آپ نے خود کرنا ہے کہ ایک دوا کو آپ بطور خوراک کب تک استعمال کریں گے؟

دسواں باب

کالی ماتا کے پجاری

(چرس اور نشہ۔۔۔ایک افسوسناک حقیقت)

چرس سنسکرت میں چمڑے کے تھیلے کو کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اس نشہ آور چیز کو جمع کرنے کے بعد چمڑے کے تھیلوں میں بند کرکے رکھتے تھے اس لئے اسکا نام چرس پڑ گیا۔لیکن دنیا اسی چرس کو Hashish کے نام سے جانتی ہے۔ بھنگ ایک نباتاتی پودا ہے۔ اسکے پتوں پر شبنم چپک جاتی ہے کیونکہ رال دار ہوتی ہے۔ پودے سے شگوفے اور غبار وغیرہ لے کر جمع کرلیا جاتا ہے اور چمڑے کے تھیلوں میں بھر کر رکھ لیا جاتا ہے یہ کوالٹی کے لحاظ سے دنیا کی بہترین اور نمبر 1 چرس ہوتی ہے۔ جو بہت مہنگی ہوتی ہے اور آسانی سے میسر بھی نہیں ہوتی۔ بھنگ کے پودوں کی شاخوں کو پاچھنے سے جو مواد حاصل ہوتا ہے۔ اسکو خشک کرلیا جاتا ہے۔ یہ کوالٹی میں اول الذکر سے کم درجے کی ہوتی ہے اور قیمت میں بھی کچھ ارزاں ہوتی ہے لیکن عام دستیاب نہیں ہوتی۔ مونث بھنگ کے پودوں کو پانی میں ابال کر بہت ہی گاڑھا اور سیاہ رنگ کا مادہ نکال کر محفوظ کرلیا جاتا ہے یہ سب سے کم کوالٹی کی چرس ہوتی ہے۔ چرسی اسکو سگریٹ اور حقے میں رکھ کر پیتے ہیں یہ بہت نشہ لاتی ہے۔ جتنی غلیظ اور چپکتی ہوئی ہو کوالٹی کے لحاظ سے اتنی ہی عمدہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات اپنی کمالِ قوت کی وجہ سے نشئی کو ہلاک بھی کردیتی ہے۔

چرس کی خاصیت:

1۔ چرس نشہ لاتی ہے۔
2۔ خشکی پیدا کرتی ہے۔
3۔ بینائی خراب کرتی ہے۔
4۔ حواسِ خمسہ کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔

5۔ بھوک کو کم کرتی ہے۔

6۔ جسم کو لاغر کرتی ہے۔

7۔ چال میں لڑکھڑاہٹ پیدا کرتی ہے۔

8۔ چرس کا عادی شخص جنون اور دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

9۔ دل اور دماغ کو ضعیف کرتی ہے۔

10۔ چرس ورم کو تحلیل کرتی ہے۔

11۔ امساک پیدا کرتی ہے۔

12۔ مکھن اور خالص دودھ دہی اس کا توڑ ہیں۔

میں بے حد دکھ سے یہ تحریر کر رہا ہوں کیونکہ میں روزانہ دیکھتا ہوں کہ ہائر ایجوکشن اور دیگر تعلیمی اداروں میں لڑکے اور لڑکیاں چرس کو فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ سب لوگ بہت اچھے اور معزز گھرانوں کے بچے ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ جو نشہ چمار، میراثی، گٹر صاف کرنے والے (جنہیں عرف عام میں چوڑا کہا جاتا ہے) کرتے ہیں اب وہی نشہ یہ پڑھے لکھے لوگ بھی کرتے ہیں۔ چرس پینے کی ابتداء سگریٹ نوشی سے ہوتی ہے۔ایسے لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں جن کی شخصیت کمزور ہو اور انہیں اپنے آپ پر اعتماد بھی نہ ہو۔ چرس پینے والے کی شکل وشباہت بھی چرس کی طرح ہی ہو جاتی ہے۔ چرسی اپنی خفیہ زبان میں اسکو کالی ماتا کہتے ہیں اور چرس بھرے سگریٹ کو پکا سگریٹ کہتے ہیں۔ چرس کی عادت پختہ ہو جانے کے بعد عادی شخص چرس نوشی سے باز نہیں رہ سکتا۔اس کا چہرہ سیاہی مائل آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہوتی ہیں۔اس کی نبض بہت تیز چلتی ہے۔آواز بھرائی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ جذبات سے بھرپور ہوتے ہیں بہت جلدی طیش میں آجاتے ہیں۔ان کی قوتِ فیصلہ بہت کمزور ہوتی ہے۔ چرس دماغ کے خلیوں کو نقصان پہنچا کر دل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ چرسی کے پٹھے بھی بہت کمزور ہوتے ہیں۔ چرس پینے کا آغاز چرسی دوستوں کی محفل سے کرتا ہے پھر آہستہ آہستہ یہ عادت پختہ ہو جاتی۔ چرسی سمجھتا ہے کہ وہ معاشرتی دباؤ، ذہنی الجھنوں اور ناکامیوں کو پیچھے چھوڑ آیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اسکی کشتی اب ایک ایسے بھنور میں پھنس چکی ہے جس میں سے نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ جہاں وہ نہ زندوں میں شمار کیا جائے گا نہ مُردوں

میں اور آخر کار انجام موت ہوگا۔

چرسی، چرس پینے والے کو کہتے ہیں۔ بھنگی، بھنگ پینے والے کو اور جہاز، ہیروئن پینے والے کو کہتے ہیں۔ سگریٹ پیتے بے سمجھ بچے پہلے شیشہ پھر چرس اور آخری Stage پر ہیروئن پیتے راہی ملکِ عدم ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کے نشے کی عادت معاشرے میں قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہے مگر چرس، بھنگ اور ہیروئن کے عادی لوگوں کے چہروں سے پتا چل جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نشے نشئی کے چہرے پر اپنا نشان چھوڑتے ہیں۔ اکثر نشئی داڑھی بڑھا لیتے ہیں تاکہ انکا اعمال نامہ داڑھی میں چھپ جائے لیکن آنکھوں کو کیسے چھپایا جائے وہ تو بلاکم و کاست تمام داستان ظاہر کر دیتی ہیں۔ متذکرہ بالا تینوں نشے کرنے والے لوگ جسمانی طور پر گندے رہتے ہیں ہرگز ہرگز صفائی پسند نہیں ہوتے جھوٹ کو سچ کے پاؤں لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

حکیم محمد سعید شہیدؒ اپنی تصنیف دیہاتی معالج کے صفحہ نمبر 100 پر رقم طراز ہیں کہ چرس، بھنگ، گانجا اور افیون زہریلے اور خشک نشے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے استعمال سے دماغ اور اعصاب میں خشکی بڑھ جاتی ہے۔ نیند موقوف ہو جاتی ہے۔ قبض رہنے لگتا ہے۔ بدہضمی رہنے لگتی ہے۔ بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ اور انکے پینے والے کچھ لوگ پاگل بھی ہو جاتے ہیں۔

خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسیویں صدی۔ دہلی۔ اپنی شہرہ آفاق تصنیف صحت اور زندگی میں چرس، بھنگ، گانجا اور افیون کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ یہ سب نشے یا ان میں سے کوئی ایک بھی نشہ کرنے والے کا دل، دماغ، جگر پھیپھڑے، معدہ اور اعضائے رئیسہ تباہ ہو جاتے ہیں اور انجام موت ہوتا ہے۔ وہ مزید صفحہ نمبر 230 پر رقمطراز ہیں کہ چرسی کے قُویٰ دماغیہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ چہرہ پژمردہ، جسم لاغر، مزاج چڑ چڑا، آنکھوں کے گرد حلقے اور عقل معطل ہو جاتی ہے۔ چرس جسم پر سے گوشت ختم کر دی ہے۔

مزاج العلاج طب کا انسائیکلو پیڈیا ہے جو شمس الاطبا حکیم و ڈاکٹر غلام جیلانی خان کی کاوش ہے۔ وہ اس کتاب کے صفحہ نمبر 809 پر تحریر فرماتے ہیں کہ بھنگ، چرس اور افیون ایک سیاہ سم ہے یعنی زہر ہے۔ اسکے پینے والے کے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ زبان متورم ہونا، آنکھوں کی سرخی اور تاریکی، سر کا چکرانا، سانس کی تنگی، بلڈ پریشر اور تیز نشہ کے حالت میں کسی بھی یا ایک سے زیادہ امراض کا لاحق ہو جانا معمولی بات ہوگی۔ مثلاً فالج، دل کے امراض، پھیپھڑے اور جگر کے امراض وغیرہ۔

ریاست قطر کی سب سے بڑی شرعی عدالت اور دینی امور کے محکمہ نے منشیات کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے جسکا نام درج ذیل ہے

''الحذارات من العلق الی الا اتسعباذ''از ڈاکٹر محمد دالھواری

ڈاکٹر الھواری اپنی اس مایہ ناز تصنیف میں سورۃ بقرہ آیت 164 کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی عقل کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے نہ کہ اس بیش بہا نعمت کو منشیات کے استعمال سے بیکار کر دیا جائے۔مزید وہ ہر قسم کی منشیات کو عقل اور بدن کیلئے خطرناک ترین زہر قرار دیتے ہیں جو ذہنی اور جسمانی عدم توازن کا سبب ہیں۔

اللہ عزوجل نے تمام بنی آدم کو محترم ٹھہرایا ہے اور تمام خبیث چیزوں کو اپنے بندوں پر حرام قرار دیا ہے۔شریعت اسلامی نے اپنے بندوں کو پانچ چیزوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے یعنی۔دین، جان، مال، عقل اورعزت اور ہر وہ عمل حرام قرار دیا ہے جس سے ان اوصافِ خمسہ کو نقصان پہنچے تاکہ صالح معاشرے کا قیام یقینی ہو جائے۔عقل اللہ تعالی کی عظیم ترین نوازش ہے۔جسکو عطا کرنے کے بعد اس نے اپنی مخلوق کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کر دیا۔

حشیش یا چرس کا تاریخی پس منظر کچھ اسطرح ہے کہ قدیم مصریوں نے خشخاش Povit Or Poppy کی کاشت کی اور آتشِ عشق کو بھڑکانے والے مسکن (Sedative) مشروب بنائے۔اسی طرح زمانہ قدیم میں قنب الھندی (Cannabis Indica) یعنی بھنگ برصغیر کے میدانوں میں کاشت کی جاتی تھی۔اس سے نہ صرف چرس تیار کی جاتی ہے بلکہ دیگر نشہ آور خرافات اور نشہ آور ادویات بھی تیار کی جاتی ہیں۔ان نشہ آور چیزوں کا استعمال مشرق میں عام ہے بلکہ اب تو مغرب بھی اسکا رسیا ہے اور بہت تیزی سے یہ برائیوں کی ماں مغرب میں عام ہوتی جا رہی ہے۔گورنمنٹ آف ہالینڈ نے اس پر بھاری ٹیکس لگا کر اس کو عوام کیلئے عام کر دیا ہے تاکہ جس نے اپنے آپکو مارنا ہے بے شک کھلے عام مارے لیکن مرنے سے پہلے گورنمنٹ کو ٹیکس دے کر مرے۔ہالینڈ میں بڑے بڑے کیفے کھل گئے ہیں اور لوگ بغیر کسی خوف کے اس ذلالت میں مبتلا ہیں۔حالانکہ پندرھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ یورپ میں (Oda Nom) اوڈانوم نامی مرکب بطور مسکن دوا بذریعہ ڈاکٹر زمریضوں پر استعمال ہوتا تھا۔چرس /افیون کا عام اور عملی استعمال یورپ میں

انیسویں صدی میں شروع ہوا۔ جوں جوں یورپ ادبی اور افسانوی لٹریچر کے ذریعے منشیات سے واقف ہوتا گیا، منشیات نے وبا کی شکل اختیار کر لی۔ خوابوں کی جنت نامی کتاب جس کے مصنف بودیئر ہیں (Paradis Artifical By Bavdelaire) کی اشاعت کے بعد لوگوں میں طبعی اور فزیالوجی کی سطح پر اس قسم کی منشیات کی جان کاری ہوئی۔ میری رائے میں اس کتاب کا نام خوابوں کی جنت کے بجائے احمقوں کی جنت ہونا چاہیے جس میں حیوان نما انسان رہتے ہیں۔ 1840ء میں Moreov نامی ایک سائنسدان نے ایک اہم تحقیق کی جس سے چرس یا حشیش کے استعمال سے پیدا ہونے والی عقلی بے چینی اور فریبِ نظر ایک خیال ثابت ہوگیا۔ اسی سائنسی تحقیق کے نتیجے میں دنیا اور عالمی مارکیٹ مارفین، کوڈین، ہیروئن، کوکین اور دیگر نشہ آور مرکبات سے آشنا ہوئی۔ ان سب مرکبات کا منبع یا ماں بھنگ اور افیون ہے۔ جیسے ہی سمگلرز کو ان نشہ آور مرکبات کی بھنک پڑی تو انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں سمگلرز نے اپنی تمام تر توجہ ان نشہ آور مرکبات پر مرکوز کر دی۔ یورپ میں ان مضر مرکبات کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ جب مارفین، کوکین، ایتھر، ہیروئن، گانجا، چرس (جسے یہ لوگ حشیش کے نام جانتے تھے)، افیون اور بھنگ کے استعمال سے اموات ہونا شروع ہوئیں تو یورپ کی حکومتیں اس معاشرتی خطرے کا سدِباب کرنے پر کمربستہ ہوگئیں۔ اس وقت سے آج تک ہر حکومت کیلئے یہ ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ بن چکا ہے۔

ابتدائی طور پر ہر ملک نے ملکی سطح پر اس وباء کا سدِباب کرنے کے لیے قوانین بنائے۔ عوامی سطح پر بھی کئی تنظیمیں وجود میں آ گئیں۔ تمام تنظیموں نے ملکر ایک عالمی تنظیم برائے انسداد حشیش، افیون و دیگر منشیات بنالی جو بعد میں اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ادارہ برائے انسدادِ منشیات میں تبدیل ہوگئی۔ دوا سازی کی صنعت میں عالمی طور پر بہت ترقی ہورہی ہے۔ ہر روز ایک نئی دوا مارکیٹ میں متعارف ہورہی ہے۔ زیادہ تر ادویات نشہ آور خواص کی ہیں جس کا زیادہ یا باقاعدگی سے استعمال نشے کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور مریض کو ہمیشہ کیلئے اس نشے کا محتاج بنا دیتا ہے پوری دنیا میں نشیلے مرکبات کے استعمال سے شرح اموات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس تباہ کن، نشہ آور اور مہلک مواد کی وجہ سے ہماری زندگیاں نفسیاتی، بے چارگی، لاچاری، مفلسی محتاجی اور جسمانی عوارض میں مبتلا ہو کر ہمیں نشان عبرت بنا دیتی ہیں۔

کچھ بیوقوف اور حقیقت سے فرار حاصل کرنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر معتدل انداز میں یہ نشہ آور مرکبات استعمال کیے جائیں تو ضرر رساں نہیں ہیں۔ایسے لوگ حقیقت سے فرار حاصل کرنے والے اور احمقوں کے جنت میں رہنے والے لوگ ہیں۔میں صرف ایک ادنیٰ سی مثال ان لوگوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔اگر 5 لیٹر پانی میں صرف ایک قطرہ پیشاب ڈال دیا جائے تو کیا وہ اس پانی کو پینے یا دیگر انسانی استعمال میں لائیں گے؟ جواب دیں۔اگر جواب No ہے تو پھر آپ کوئی بھی نشیلا مرکب معمولی سا بھی کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟ اگر آپ کا جواب Yes ہے تو آپ کی ذہنی پراگندگی پر میں آپکے لیے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔

حقیقت میں یہ سب مرکبات بے حد خطرناک ہیں جو معاشرے کے وجود کو کھوکھلا کر کے اسے گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں اور جسم کے ہر حصے کو کمزور اور تباہ کر رہے ہیں۔لندن یونیورسٹی کے شعبہ نفسیاتی امراض کے صدر کے بقول یہ خطرناک نشیلے مرکب جو عام استعمال کئے جا رہے ہیں اور قانونی پابندی کے باوجود آسانی سے دستیاب ہیں زہرناکی، ذہنی غیر حاضری، اخلاقی انحطاط اور جنون کا موجب ہیں۔قارئین اکرام اور نشہ آور مرکبات کے عادی اشخاص کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ زیادہ منافع کمانے کی لالچ میں پشاور کی باڑہ مارکیٹوں اور جہاں بھی ان منشیات کی سوداگری ہوتی ہے وہاں پہلے منشیات خالص حالت میں لاکر ان کو سہ آتشہ یعنی نشے کی طاقت تین گنا بڑھانے کیلئے اس میں خطرناک قسم کے کیمیکل ملائے جاتے ہیں جس سے اسکے حجم اور وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اسکی سمی یعنی زہریلی طاقت تین گنا بڑھ جاتی ہے۔جس کی وجہ سے نشئی کی گردن ہر وقت سولی کے قریب رہتی ہے۔نشئی مستقبل بنیاد پر اسکا غلام بن جاتا ہے۔عقل اور جسم پر اسکے بہت ہی برے اثرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔اب اگر نشہ کرنے والا اس کو چھوڑنا بھی چاہیے تو نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ یہ اب Toxicomanine کی اصطلاح میں نہیں آتا بلکہ منشیات کے آگے بے بس اور سپر اندازی کے زمرے میں آتا ہے۔ابھی تک حشیش (چرس) کے بارے میں سائنسی تنازعہ موجود ہے کہ اسے مدہوشی کی طرح مرکبات میں شامل کیا جائے یا نہیں۔اس سائنسی اختلاف کی وجہ سے اسکے بری طرح پھیلاؤ میں بہت مدد ملتی ہے۔جبکہ اس مجرب عقل اور شخصیت کیلئے تباہ کن زہر کی وجہ سے نسلِ انسانی کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ موجود ہے۔

تحقیق کے مطابق حشیش کے استعمال کے ایک گھنٹے بعد ہی نشئی کو نفسیاتی اور جسمانی ارتقاء کا احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسے داخلی سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے جس کی حد بندی نہیں کی جا سکتی کیونکہ ہر نشئی کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ جلد ہی یہ فرحت اور سرور جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتا ہے۔ فرانس میں ایک ہی دن میں 171 اموات کیمیکل ملی حشیش استعمال کرنے سے ہوئیں جسکی وجہ سے فرانس کے ادارہ برائے انسداد منشیات کے اعلیٰ حکام مجبور ہو گئے کہ وہ ان کیفیات کا ایک چارٹ عوام کو پیش کریں تاکہ عوام انکے نتائج جان سکیں۔ فرانس کی پولیس اور متذکرہ بالا ادارے نے جو چارٹ شائع کیا وہ کچھ اس قسم کا ہے۔

Stage	کیفیات وعلامات
1۔	نشہ آور مرکب کی طلب، چھینکیں آنا، آنسو بہنا بے چینی، پسینہ آنا، ناک سے مواد بہنا
2۔	آنکھ کی سیاہ پتلی کا پھیلاؤ، ٹھنڈک اور حرارت کا احساس ہڈیوں کا درد جلد میں کپکپی، پٹھوں کا تشنج، کھنچاؤ، مردانہ طاقت کا کمزور ہونا
3۔	بے خوابی، گرمی کا زیادہ احساس، عام صحت میں خرابی Arterial Tension یعنی کے شریانی تناؤ میں اضافہ، دل کی دھڑکنوں میں اضافہ گذشتہ تمام کیفیات کے علاوہ مندرجہ ذیل کا اضافہ
4۔	Satin Saturnine بار بار قے آنا، گردوں کے عمل سستی ، ہر روز دو کلوگرام وزن کم ہونا Functional Nebhritic Insufficiency خون میں شوگر کی زیادتی، خون کا سفید یعنی سفید کریات Globule کی زیادتی انجام ۔۔موت۔

چرس (حشیش)، افیون، کوکین اور دیگر تمام نشیلے زہریلے کیمیکل ملے مرکبات استعمال کرنے والے یقین کر لیں کہ اگر وہ اپنی عقل و دانش سے کام نہیں لیں گے تو وہ ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ چرس کے تمام کیمیاوی اثرات بدن میں Hormones پر بہت زیادہ اثر انداز ہو کر بدن میں Amino Acids اور پروٹین بننے کے عمل کو روک دیتے ہیں۔ اسکے عادی نشہ بازوں پر Vision Webs Attack ہوتا ہے جس میں بیماریوں سے بچنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور مادہ منویہ کی پروڈکشن رک جاتی ہے یا انتہائی کم ہو جاتی ہے۔

دیگر ظاہری اثرات:

1۔ جذباتی عقلی اور طرزِ عمل کا بگاڑ ہو جانا
2۔ شخصیت کا تباہ کن حد تک مسخ ہو جانا
3۔ عقل و فہم کا خراب ہو جانا
4۔ خونی رشتوں کا احترام اور عزت ختم ہو جانا (جس میں شرمندگی کا عنصر بھی شامل ہے)
5۔ بہت مضطرب رہنا

شروع میں نشئی کی کیفیت ایک مدہوش کی سی ہوتی ہے۔ اسکی عقلی چستی اور ہوشیاری بڑھ جاتی ہے۔ وہ بڑا ذہین معلوم ہوتا ہے۔ ہر بات بڑے ماہرانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ چرب زبانی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اسکے حالات اور افکار اسکے بس میں نہیں رہتے۔ نشہ کے زہریلے اثرات کے تحت سوچنے سمجھنے اور اچھے برے کی تمیز کرنے کا ادراک بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کی گفتگو میں ایک نفسیاتی اضطراب ہوتا ہے اور کوئی خاص ربط نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ نشہ کیوں؟

کمزور شخصیت کے لوگ حقیقت سے فرار حاصل کرنے کیلیئے دکھ، پریشانی، اکتاہٹ، بے چینی، اضطراب، اور تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے کیلیئے اس میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ آپ اسکو معاشرتی بغاوت، سنگ دلی اور بے غیرتی کی بدترین صورت سمجھ سکتے ہیں۔ ہر کمزور انسان خوابوں کی فرضی جنت میں پناہ ڈھونڈتا چلا آیا ہے اور زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کی یہ دعوت نئی نسل میں کچھ زیادہ مقبول ہوئی ہے کیونکہ ان میں مردانہ وجاہت نام کو بھی نہیں ہے۔ اپنے ماں باپ اور دیگر بزرگوں کی برائے نام عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ان کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر برائی سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ دل کی گہرائیوں سے اپنے بزرگوں کی عزت نہیں کرتے اور ہر وقت آمادۂ فساد رہتے ہیں۔ ان کو یہ قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ بارش سے بھاگ کر وہ پرنالے کے نیچے کھڑے ہو رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہے ہیں۔

ابن تیمیہؒ اور امام احمدؒ کے بقول قنب یعنی بھنگ کے پتوں سے بنائی گئی حشیش یا چرس حرام ہے اور

شراب سے زیادہ خبیث ہے۔ کیونکہ یہ عقل اور مزاج کو بگاڑ دیتی ہے۔ جید اور مستند علماء کرام کے نزدیک نشہ آور چرس یا حشیش کو تھوڑی مقدار میں بھی استعمال کرنا حرام ہے۔ حضرت محمد ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ہر نشہ آور خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔ خمر ہر اس چیز میں شامل ہے جو نشہ لاتی ہے۔ حشیش ہر طرح سے حرام ہے چاہے اس میں نشہ کم ہو یا زیادہ۔ بدمعاش لوگ اسے نشہ اور مستی کیلئے ہی تو استعمال کرتے ہیں۔ یہ شراب سے بڑھ کر ضرر رساں ہے۔ شراب تو جارحیت اور حرکت ہیجان پیدا کرتی ہے جبکہ حشیش کمزوری ضعف اور ذلت پیدا کرتی ہے۔ قدیم دور میں حشیش کا استعمال تاتاریوں کی آمد سے شروع ہوا۔ اور آپ یہ پڑھ کر حیران ہونگے کے دنیا کے بڑے بڑے انسداد سرطان کے ادارے بڑی بڑی سگریٹ ساز فیکٹریوں کے Major حصہ دار ہیں منافقت کی اس سے بڑی مثال اور کیا پیش کروں۔

اللہ سبحان تعالیٰ جس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور جس نے اپنی بے پایاں رحمت کو اپنے مومن متقی بندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے سورۃ الاعراف آیت 157 میں فرمایا ہے کہ ''وہ لوگ جو اس نبیؐ امی کی پیروی کرتے ہیں جسکا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔ اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندش کو کھولتا ہے جس میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لائیں اور اسکی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اسکے ساتھ نازل کی گئی ہے وہ ہی فلاح پانے والے ہیں۔''

اب حشیش کے حوالے سے میں آپ کو دو مذاہب کا تعارف کراؤں گا جو 100% حشیش کی پیداوار ہیں۔ ویسے تو ہر قسم کا نشہ دنیا کے تمام مذاہب میں حرام ہے ماسوائے قرامطی اور بہائی مذاہب میں۔ کیونکہ یہ دونوں مذاہب حشیش کی ہی پیداوار ہیں۔ قرامطی فرقہ زمانہ قدیم میں معرضِ وجود میں آیا۔ انہوں نے اپنی جنت اور دوزخ بنائی اور اسلام میں جتنی بھی چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ان سب کو اس فرقے نے حلال اور جائز قرار دیا۔ اسکے پیروکار حشیش کا بے دریغ استعمال کرتے اور اپنی ہی بنائی ہوئی جنت میں رہتے۔ جہاں ان کی مائیں، بہنیں اور دیگر محرم و نامحرم خواتین حوروں کے فرائض سرانجام دیتیں۔ بعض حوروں کی زلفوں اور حشیش کے دھویں کے مرغولوں میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا تھا۔ دیگر تمام خرافات حشیش کے نشے

کے زیرِ اثر بے خوف وخطر حسن بن صباح کی سرکردگی اور اسکے افکار کی پیروی کرتے ہوئے انجام دیتے تھے۔ آخر اپنے ہی ہاتھوں یہ سب لوگ تباہ و برباد ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔قرامطی مذہب کے پیروکار ملتان تک بااثر ہو گئے تھے اور کالی ماتا کے بچاری مشہور ہو گئے تھے۔ اگر آپ ڈیوڈ بن گوریان ائیر پورٹ کی طویل راہ داری سے گزرتے ہوئے شیشے کی دیوار میں سے باہر کی طرف دیکھیں تو آپ کو ایک دلکش اور نہائیت ہی خوبصورت باغ مسلسل نظر آئے گا۔ جب طویل راہ داری دائیں طرف مڑنے لگے گی تو سامنے کی دیوار پر سبز برقی قمقموں سے لکھا ہوا سائن بورڈ آپکی آنکھوں میں فوکس ہو جائیگا جس پر لکھا ہوگا Do Not Forgot to Visit Bahai Garden ۔اس گارڈن میں دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کا بہت رش ہوتا ہے۔ یہ باغ تین مربع کلو میٹر پر پھیلا ہو ہے۔ اسکی لینڈ سکیپنگ اور پلانٹنگ میں درختوں، پودوں اور پھولوں کا انتخاب بے حد اچھا ہے۔سنگِ مرمر کے سفید اور زعفرانی حوض بنائے گئے ہیں۔ان میں لگے فوارے رنگین پانی اچھالتے ہیں جو بہت خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ اس باغ کو دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے سیاحوں کا ایک جمِ غفیر آپ کو نظر آئیگا۔ ہر رنگ و نسل کی خواتین جو بذاتِ خود قدرت کی فنکاری کا لازوال حسین ترین انعام ہیں آپ کو اس جگہ پر کچھ اس طرح سے نظر آئیں گی کہ مختلف خدوخال، نین و نقش، دنیا بھر کے لباسوں اور بے لباسی کی نمائش کچھ سرو قد کچھ بوٹا قد، مرمریں ابدان اور خوش جمال جو بہا اللہ کے باغِ بہشت کے سامنے یہ حوریں اپنے اپنے باغ کا نظری نظارہ غریب الوطن لوگوں کو کروا رہی تھیں۔لیکن وہ خود بہا اللہ کے باغِ بہشت کو دیکھ کر حیرت زدہ تھیں۔ جبکہ باغ بذاتِ خود قدرت کے سجائے گئے اور سنوارے گئے انسانی گلشن کو دیکھ کر شرما رہا تھا۔ باغ کے اندر داخلہ ممنوع ہے تا کہ اس کا حسن اور صفائی خراب نہ ہو۔ بہا اللہ کی بنائی گئی اس جنت میں اسکی قبر بھی ہے۔ بہا اللہ ایرانی النسل تھا۔ مذہبی جنون اور حشیش کے زیرِ اثر رہنے کی وجہ سے بھٹک گیا اور پیغمبری کا دعویدار بن بیٹھا۔ اسکے پیروکاروں نے اسکو نبوت ہی نہیں بلکہ الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ پادریوں اور ربیوں نے بغضِ اسلام کی بناء پر اس کی خوب حوصلہ افزائی کی۔حکومتِ ایران نے اس پر سخت پابندی لگا دی تھی اور گرفتار بھی کر لیا تھا۔ جب اسرائیل معرضِ وجود میں آیا تو نہ صرف بہائی فرقہ کو حیفہ میں اپنا ہیڈ کوارٹر بلکہ بہا اللہ کا مزار بھی بنانے کی پیشکش کی۔ اگر آپ اس باغ کے سامنے کھڑے ہوں تو دور دائیں طرف دیکھیں آپ کو بحیرۂ روم کی ٹھاٹھیں مارتی لہر

یں اوراسی طلاطم میں کھڑے بحری جہاز نظر آئیں گے۔ یہ بھی ایک خوبصورت منظر ہوتا ہے۔

اس ساری تمہید کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ حشیش کے زیر اثر کوئی بھی شخص کچھ بھی کرسکتا ہے یہاں تک کہ نبوت کا دعوی کر کے کذاب بھی بن سکتا ہے۔ 1993ء میں مجھے بھی The Grand Easter Rand Show of South Africa میں 21 روز کے لئے شمولیت کا موقع ملا۔ میں نے وہاں بہائی فرقے کا سٹال بھی دیکھا۔ میں اکثر اس سٹال کو وزٹ کیا کرتا تھا۔ میں جب بھی انکے سٹال پر جاتا وہاں پر بیٹھی خواتین مجھے مختلف قسم کے 7/8 پمفلٹ پکڑا دیتیں۔ ایک روز میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے روزانہ اپنا لٹریچر پڑھنے کیلئے دیتی ہیں جو میں بغیر پڑھے Dust Bin میں ڈال دیتا ہوں اور دوسرے روز آپ پھر لٹریچر سپلائی کر دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک بولی کسی روز تو پڑھو گے۔ اس کے بعد حالاتِ حاضرہ اور نمائش کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ایک روز میں نے دیکھا کے وہ حشیش بھرا سگریٹ ہاتھوں میں لئے باری باری کش لگا رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنکھ دبا کر بولی، شوق کرو گے؟ بے خودی میں میری زبان سے ایک لمبا سا No نکل گیا۔ وہ بولی تم ایک Perfect آدمی ہو لیکن تم میں کچھ کمی بھی ہے۔ ایک تو تم سنتے کسی کی نہیں ہو دوسرا حشیش سے بغیر وجہ کی دشمنی بھی رکھتے ہو تو یہ دوستی کیسے چلے گی۔ اور کھلکھلا کر ہنس دیں۔ میں وہاں سے چلا آیا کیونکہ وہاں زہریلا دھواں ہی دھواں تھا۔ اس سے پیشتر کے میں حشیش سے نجات حاصل کرنے کے لئے طریقۂ کار اور اسکا علاج بتاؤں میں اپنی ذات کے متعلق ایک بھیانک تجربہ اور واقعہ قارئین کرام کی نظر کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مستقل قیام بسلسلہ روزگار افریقہ کے ایک ملک بوٹسوانہ میں تھا۔ جسکا پرانا نام بچوانا لینڈ تھا۔ آزادی کے بعد بچوانا لینڈ سے بوٹسوانہ ہو گیا جسکا دارالخلافہ گیبرون ہے۔ گیبرون میں قیام کے دوران میری ٹانگوں پر زخم ہو گئے۔ کافی ادویات استعمال کیں لیکن آفاقہ نہ ہوا میں بہت پریشان رہنے لگا۔ ایک روز میں نے فون کر کے جوہانسبرگ، جنوبی افریقہ کے ایک مشہور Darmatalogist سے اپنے معائنہ کے لئے ٹائم لیا اور بذریعہ کار گیبرون سے جوہانسبرگ روانہ ہو گیا۔ تفصیلی معائنہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے ادویات لکھ دیں اور میں واپس آ گیا۔ ایک ماہ تک میں دوا استعمال کرتا رہا لیکن مجھے آفاقہ نہ ہوا۔ میں نے فون کر کے ڈاکٹر صاحب کو اپنی حقیقت بتائی تو وہ بولے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے آپ ادویات ایک ماہ

کے لئے Extend کر لیں۔ میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا استعمال کرتا رہا۔ آفاقہ تو کیا ہونا تھا میں جسمانی طور پر کمزور ہو گیا رنگ بھی سرخ سفید سے سانولا ہو گیا۔ تمام دن مصروفیت میں گزر جاتا رات ہوتے ہی مجھ پر خوف غالب آ جاتا۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتا کہ رات کیوں ہوتی ہے۔ جیسے ہی گھر جا کر میں دوا کھاتا مجھے نیند آ جاتی اور صبح تک بے خبر و بے سدھ سوتا رہتا۔ دوسرا ماہ بھی گزر گیا۔ گیبرون میں The Gaborone Hospital ایک امریکن پرائیویٹ ہسپتال کے طور پر کام کر رہا تھا جسکی انچارج ڈاکٹر جوز فائین بوٹسوانا کی شہری تھی، بطور کارڈیولوجسٹ اس ہسپتال میں کام کر رہی تھی اور میری دوست تھی۔ ایک روز ملنے آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی آفتاب کیا ہوا؟ میں نے اسکو تمام حالات بتائے۔ وہ جھٹ سے بولی تم صبح 10 بجے میرے پاس ہسپتال آ جاؤ میں خود تمہیں چیک کرونگی۔ صبح میں اسکے دیے ٹائم پر اسکے آفس میں موجود تھا۔ اس نے میرے تمام کلینکل ٹیسٹ کروائے۔ دو ڈاکٹر اور بھی بلوائے۔ سب نے مل کر میرا تفصیلی معائنہ کیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے بولے بظاہر تو کوئی پرابلم نہیں ہے تمہارے ہر قسم کے ٹیسٹ کلئیر ہیں۔ سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ No Medicine کسی قسم کی کوئی Medicine لینے سے پہلے میں اپنے ان تینوں ڈاکٹرز سے رابطہ کرونگا اور اگر ضروری ہوا تو ادویات دی جائیں گی۔ میں نے ادویات بند کر دیں مگر اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں تمام رات کروٹیں بدلتا رہا اور بے حد پریشان بھی رہا حالانکہ میرا بڑا بیٹا نوید کاشف بھی میرے ساتھ تھا۔ میں اس پر بھی زیادہ تکلیف کا اظہار نہ کرتا کہ بچہ باپ کی حالت دیکھ کر پریشان نہ ہو جائے اور اس کی تعلیم متاثر نہ ہو۔ دوسرے روز میں ڈاکٹر جوز فائین کے پاس دوبارہ گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ کل ان کے ہسپتال میں کیپ ٹاؤن سے ایک ڈاکٹر آف میڈیسن ڈاکٹر خان تشریف لا رہے ہیں۔ ہم نے آپکے لیئے اُن سے Appointment لے رکھی ہے۔ کل 11 بجے آپ میرے پاس تشریف لے آئیں۔ دوسرے روز ڈاکٹر جوز فائین کے آفس میں ڈاکٹر خان بہت پیار اور اپنائیت سے ملے۔ میرا تفصیلی چیک اپ کیا۔ تمام ڈاکٹروں کی تجویز کردہ ادویات کے نسخے دیکھے۔ جو گولی میں رات کو لیتا تھا اس پر لال پین سے گول دائرہ لگا دیا اور بولے کیا آپ یہ گولی متواتر کھا رہے ہیں؟ میں نے کہا دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ وہ چونک پڑے اور کافی دیر تک جوز فائین سے اپنی Terminology میں باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھے کہنے لگے کہ یہ گولی بہت نشہ آور ہے۔ بہت زیادہ بیمار مریض کو 3 دن سے زیادہ

نہیں دی جاتی۔ آپ اب اسکے عادی ہو چکے ہیں۔ آپ صرف اور صرف اسکو Self Confidence کے ذریعے ہی چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کے آپ واپس اپنی فیملی میں چلے جائیں۔ میں نے انکو بتایا کے جب سے ڈاکٹر صاحبان نے میری ادویات بند کی ہیں میرے زخم اب بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ماسوائے اس کے کہ اگر میں یہ گولی نہ کھاؤں تو خوف میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ تمام رات سو نہیں سکتا۔ گیڈر کی طرح اکٹھا ہو کر پڑا رہتا ہوں۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ سر چکراتا ہے۔ جسم میں درد کی لہریں اٹھتی ہیں۔ مزاج بھی خراب رہتا ہے۔ وہ بولے آپکو میری سخت Advice ہے کہ Go and Join your Family شام کو ڈاکٹر جوز فائین آئی تو اس نے تمام حقیقتِ حال تفصیل سے بیان کی جو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے چھپائی تھی۔ وہ بولی آپکے جانے کے بعد انہوں نے چیف فارماسسٹ کو طلب کیا اور اس سے مشورہ کرنے بعد بولے اس مریض کو کوئی بھی Medicine نہیں دی جا سکتی اور موجودہ Medicine بھی اسکو چھوڑنا ہو گی ورنہ انجام بہت ہی برا ہو گا۔

انہوں نے میرے نسخے پر بھی لال پین سے لکھ دیا He must go to Pakistan and Join his Family.۔ اس دوران میرے بیٹے کو Witwatersrand یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ میں داخلہ مل چکا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً اپنے بیٹے کو ساؤتھ افریقہ چھوڑا اور پاکستان کیلئے روانہ ہو گیا۔ میں ائیر فرانس سے سفر کر رہا تھا۔ جہاز جوہانسبرگ، ری یونین آئی لینڈ، سیشلز اور مڈغاسکر سے ہوتا دوبئ پہنچ گیا۔ تمام راستے میں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ائیر ہوسٹس بہت بار آئی۔ بولی اگر آپ کچھ نہیں کھانا چاہتے تو فروٹ ہی لے لیں یہ جوس ہی پی لیں۔ میرے انکار پر وہ چیف پرسر کو بلا لائی۔ اس نے بھی بہت دلجوئی کی اور وجہ پوچھی کہ کیا آپ بیمار ہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔ اگر آپ ہم پر اعتماد کریں یقین کریں کہ ہم آپکی پرابلم کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو پردیس میں اکیلا چھوڑ آیا ہوں بے شک میں اسکو تعلیم کے لئے ہی چھوڑ کر آیا تھا۔ اس میں اسکی بھلائی اور ترقی تھی اور اسکی ترقی میری زندگی تھی۔ لیکن ایک باپ کے دل کو کیسے سمجھاتا؟ رہ رہ کر اسکا معصوم چہرہ اور شرارت بھری آنکھیں میری نظر کے سامنے ایک فلم کی طرح چل رہی تھیں۔ میرے کانوں میں اسکی آوازیں آرہی تھیں۔ میں مڑ کر دیکھتا کہ کہیں وہ مجھے ڈیڈی جان کہہ کر پکار نہ رہا ہو۔ یہ لمبا سفر تھا جو میں نے بہت اذیت میں گزار۔ آخر دوبئ پہنچ

گیا۔ افریقہ جاتے آتے میرا قیام 2/3 روز کے لئے دوبئی میں ضرور ہوتا تھا۔ دوسرے روز ایک عزیز دوست ڈاکٹر معین راجہ کے کلینک گیا تاکہ ان سے بھی مشورہ کرسکوں۔ ڈاکٹر صاحب بے حد شریف النفس اور قابل ڈاکٹر ہیں۔ فرشتہ صفت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مہمان نواز، بردبار اور ہنس مکھ انسان ہیں۔ انہوں نے بہت توجہ سے میری باتیں سنیں اور میرا معائنہ بھی کیا۔ بولے میں ادویات لکھ دیتا ہوں آپ ایک روز اپنی گولی کھائیں دوسرے روز میری لکھی ہوئی گولی کھائیں اور اسی طرح بتدریج دوا کھانا بند کرتے جائیں انشااللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی بولے کہ مجھے آپ جیسے شخص سے امید نہ تھی کے اس بری طرح نشہ آور گولی کے شکنجے میں پھنس جائیں گے پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ بہت پر تکلف کھانا کھلایا۔ میری بہت دلجوئی کی اور مجھے اپنی کار میں میرے ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے روز دوبئی سے کراچی، پھر ملتان اور پھر بذریعہ کار بہاولپور اپنے گھر اپنے بچوں میں پہنچ گیا۔

میرے گھر کے مین گیٹ پر میری اہلیہ محترمہ اور میرے تمام بچے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ جیسے ہی کار سے اترا میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے تمام ادویات جس میں وہ نشہ آور گولیاں بھی شامل تھیں نکال کر گھر کے سامنے والی گٹر میں پھینک دیں اور اہلیہ صاحبہ اور بچوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ بھوک نام کو بھی نہ تھی مگر میرا اپنے آپ سے اور اپنے اللہ تعالیٰ سے وعدہ تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں نے نہ صرف نشہ آور گولی بلکہ عام ادویات میں سے بھی کوئی دوا نہیں لینی۔ اب شام ہوئی سوچیں لزرنے لگیں۔ رات ہوئی خوف طاری ہونے لگا۔ میں نے بچوں سے کہا کہ سب میرے کمرے میں آ جاؤ۔ میری اہلیہ محترمہ اور میری بیٹیوں نے میری بہت خدمت کی۔ کسی نے سر میں تیل لگایا تو کسی نے پاؤں کے تلووں کی مالش کی۔ تمام رات میری دلجوئی اور مٹھی چاپی ہوتی رہی میری بے چینی انتہا پر تھی۔ ایک جنگ تھی جو میرے اندر جاری تھی۔ کئی بار میں ہارا مگر اسی لمحے میں جیت بھی گیا۔ آخر ایک سوچ نے مجھے بہت تقویت دی کہ میری بیٹیاں کیا سوچیں گی کہ ہمارا باپ نشہ کرتا ہے۔ اگر میں نشہ کرونگا تو میرے بیٹے، اللہ نہ کرے، میرے نقشِ قدم پر نہ چل پڑیں۔ میری اہلیہ محترمہ کیا کہیں گی۔ میرے دوست احباب کیا سوچیں گے جو میرے احترام میں میرے سامنے سگریٹ تک نہیں پیتے بلکہ باہر جا کر بچوں کی طرح چوری چوری دو چار پف لے کر منہ میں الائچی ڈال کر شریکِ محفل ہو جاتے تھے۔ نئے بننے والے رشتے دار میری عزت نہیں

کرینگے۔محلّہ میں ایک رعب دبدبہ اورعزت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہوئی ہے وہ بھی جائیگی۔نشہ کیسا بھی ہو آپ کتنا ہی چھپائیں مگر یہ ظالم چھپائے نہیں چھپتا۔آنکھوں سے،، شکل سے بول چال سے،قدم اٹھانے اورقدم رکھنے سے سب کچھ صاف صاف عیاں ہوجاتا ہے۔

دوسرے روز ہلکا سا کھانا پینا ہوااور دوپہر کوتھوڑا سا اونگھ گیا۔مگر بے چینی ،جسم میں درد،جسم میں اکڑاؤ، انگڑائیاں،آنکھیں جھپکنا ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میری آنکھوں کے پپوٹوں پر بہت زیادہ وزن رکھ دیا گیا ہے۔اگر میری آنکھ لگ بھی جاتی تو ایک جھٹکا لگتا تھااور میں اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔پھرآنکھ لگ جاتی۔اپنے ہی خراٹے کی وجہ سے آنکھ کھل جاتی اور نیند سے کوسوں دور ہو جاتا تھا۔مرض کی شدت 3/4 دن تو بے حد زوروں پر رہی پھرآہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اورایک ہفتہ کے بعدکم سے کم تر ہوتی گئی۔اب یہ پوزیشن تھی کہ اہلیہ محترمہ نے صبح اٹھایا کہ ناشتہ کرلیں۔بعدازغسل ناشتہ کیااورآکرسوگیا۔دوپہرکوپھرتشریف لائیں کہ کھانا چُن دیا گیا ہےاور بچے کھانے پر انتظار کررہے ہیں۔کھانا کھایااورآکر پھرسوگیا۔اسی طرح رات کو ہوا۔ اب خوف ختم ہوگیا تھا۔بھوک بھی واپس آگئی۔ایک ہفتہ تک میں دن رات سوتا رہا۔بس حوائج ضرور یہ اور کھانا کھانے کےعلاوہ صرف سونے کا کام تھا۔کھانے کے لئے بھی زبردستی اٹھایا جاتااورکھانے کے بعدپھر سوجاتا۔اللہ تعالیٰ کا بے حدشکرگزار ہوں کہ اس نے دوبارہ صاف ستھری زندگی عطا کر کے مجھےایک پاکیزہ زندگی کےطرف گامزن کردیااور میں ایک نشئی کی موت مرنے سے بچ گیا۔آج اس واقعہ کو22/23 سال گزرچکے۔میں اس منحوس چیزکو یکسر فراموش کر چکا ہوں۔

چرس کہاں سےاور کیسےآتی ہے؟

فرنٹیئر کےمختلف علاقے اس کی آماجگاہ ہیں۔کاشت سے لےکر مارکیٹ میں لانے تک کا عمل سب پٹھان بھائیوں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچتاہے۔یہ اربوں روپے کا دھندا ہے۔نیشنل اورانٹرنیشنل لیول پر بہت بڑے مافیا کے ذریعے چل رہاہےجن اداروں نے ایسے مافیا کا خاتمہ کرنا ہے وہ انکے ورکر بنے ہوئے ہیں۔فرنٹیر کے علاقے سے آنے والی ٹریفک ملک میں جگہ جگہ پٹھانوں کے ہوٹل اورلنڈے کے کپڑوں کی دکانیں انکے سیلز پوائنٹ ہیں۔کچھ لوکل لوگ بھی ان کے کارندے ہیں۔خاص طور پرلوکل پولیس،محکمۂ آب کاری کےلوگ اورافغان مہاجرین کا منشیات کےفروغ میں بہت بڑا کردار ہے۔

نشہ چھوڑنے کا طریقہ اور علاج:

کوئی بھی نشہ چھوڑنے کے لئے مریض کا تعاون بے حد ضروری ہے۔ اگر واقعی وہ دل و جان سے چھوڑنا چاہتا ہے تو اسکو اپنے اوپر یقین اور اعتماد ہونا چاہئے جسے ہم Self Confidence کہتے ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے اگر وہ چار سگریٹ روزانہ چرس بھرے پیتا ہے تو آج تین پی لے، کل دو پی لے پھر ایک اور پھر ایک چھوڑ کر ایک سگریٹ پیئے۔ اگر اس کو نشہ چھوڑنا ہے تو پھر یکلخت مضبوط ارادہ کر کے کہ اس لمحے کے بعد اس خبیث چیز کو ہاتھ تک نہ لگائے۔

پھر اپنے چرسی دوستوں سے ملنا جلنا بند کرے۔ سگریٹ پینا بند کرے۔ اپنے گھر، اپنے بیوی بچوں ،بہن بھائی، ماں باپ کے پاس آجائے، وہ سب اسکی دلجوئی کریں۔ اسے دور نہ کریں۔ اسکے ساتھ وقت گزاریں۔ پیار محبت کا اظہار کریں۔ اگر مریض سخت سست بات کہہ بھی دے تو برداشت کریں۔ اسکو احساس دلائیں کہ وہ ایک معزز، بہادر اور بہت اچھا انسان ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب تک وہ اس مرض سے چھٹکارا حاصل نہ کرلے تو اسکی ہر سختی کا جواب پیار محبت اور نرمی سے دیں۔ اسکو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اسکے غسل اور صاف ستھرے لباس کا خاص خیال رکھیں۔ اسکے من پسند کھانے اسکو کھلائیں ۔نماز، مطالعہ و دیگر مصروفیات میں اس کا دل لگے وہ خوشی اور اپنی مرضی سے انجام دے۔ صبح صبح باغ باغیچے میں سیر کرے۔ اگر مریض تعاون نہ کرے اور چوری چھپے نشہ آور کوئی چیز استعمال کرے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت یا علاج اسکو صحت مندی کی طرف نہیں لا سکتی۔ صرف انسانی ضمیر اپنے اندر کی خلش اور شرمندگی ہی مجبور کر سکتی ہے۔ اگر آپ نیک مقصد کر لیں تو اللہ جلِ شانہ' کی رحمتیں اور برکتیں بھی شامل حال ہو کر مدد فرماتی ہیں۔ اگر مندرجہ بالا ہدایات پر مریض عمل کر رہا ہے تو علاج مندرجہ ذیل ہے کیونکہ یہ طبی علاج ہے اس میں کوئی بھی نشہ آور مرکب شامل نہیں ہے۔

جناب حکیم محمد عبداللہؒ اپنی مایہ ناز تصنیف کنز المجربات، جلد سوئم کے صفحہ نمبر 865 علاج نمبر 578 پر رقمطراز ہیں کہ چرس (حشیش) کی عادت چھڑانے کے ضمن میں مندرجہ ذیل علاج تجویز کرتا ہوں:

دہی خالص ایک کلو لے کر صبح کے وقت ململ کے کپڑے میں باندھ کر کھونٹے پر لٹکا دیں اور شام کے وقت پانی سے پاک دہی مریض کو کھلا دیں۔ پھر شام کو ایک کلو دہی دوبارہ لٹکا دیں اور صبح صبح مریض کو

کھلا دیں۔ مریض چرس پہلے دن سے ہی پینا بند کر دے اور اسی طرح 21 روز کھلاتے رہیں۔ مریض کو پھر کبھی چرس یاد بھی نہیں آئیگی صرف ہمت کی ضرورت ہے اور بے ہمتی کا کوئی علاج نہیں ہے۔

ڈاکٹر ایچ کے باکمر وا اپنی تصنیف Home Remedies کے صفحہ نمبر 141 پر رقمطراز ہیں کہ مریض کی غذائی ترجیحات کچھ اس طرح سے ہونی چاہئیں جس سے اسکو تقویت ملے اور اسکے جسم کی صفائی ہوتی رہے۔

انگور

سیب

کھجور

فروٹ جوسز

کریلے۔ سالم اناج، پھلیوں والی سبزیاں

بیجوں والی سبزیاں

اجمود کا جوس زہریلے نشے کے اثرات کو ختم کرتا ہے۔

بقراط کا قول ہے کہ بیماری کا علاج سب سے پہلے غذاؤں کے ذریعے سے کرنا چاہئیے۔ اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو پھر نباتاتی اسکے بعد حیوانی اور آخر میں معدنی ادویات سے مدد لینی چاہئیے۔ بقراط ہی اسکا مندرجہ ذیل علاج تجویز کرتا ہے۔

1) حب صنوبر یعنی چلغوزہ ایک پاؤ خالص جنگلی شہد ایک کلو میں پکا کر معجون بنائیں اور دو چمچ صبح دو شام اور دوران کو مریض کو چٹائیں

2) مریض کو بکری کا تازہ دودھ شہد ڈال کر پلائیں

3) لہسن 4 ماشہ

4) کنگنی سیاہ ایک ماشہ

5) تخم ترب 3 ماشہ

6) تخم اسپغدان (ہالونی) 6 ماشہ

7) تخمِ انجر (اٹنگن) 6 ماشہ

ہر ایک دوا فرداً فرداً استعمال کرانے سے بے حد فائدہ ہوتا ہے۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرونگا کے جن بچوں کو میں نے Observe کیا کہ یہ سب اس بری عادت میں پھنسے ہوئے ہیں وہ کوئی عام بچے نہیں ہیں۔ وہ سب پڑھے لکھے اور بہت اچھے گھرانوں کے بچے ہیں۔ ان سب کو میں اپنے بچے سمجھتا ہوں۔ انکا درد محسوس کرتا ہوں۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ میں ان سب بچوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دعا گو رہتا ہوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ یہ مضمون پڑھنا بھی گوارہ نہ کریں گے۔ لیکن میں عبادت جان کر ان سب بچوں کو اور ان تمام بچوں کو جنہیں میں نہیں جانتا اور وہ مجھے نہیں پہچانتے اور ہر اس بچے کو جو اس بری عادت میں پھنسا ہوا ہے درخواست کرتا ہوں کے اپنے آپ کو پہچانو۔ اپنے آباؤ اجداد کو بدنام نہ کرو۔ اپنی زندگی سے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے نہ کھیلو۔ اپنی ترقی کی راہ میں خود رکاوٹ نہ بنو۔

1) آپ میں سے جو بیوہ ماں کا بیٹا ہے کیا وہ اپنی ماں سے بے وفائی نہیں کر رہا؟ جو ماں عالمِ جوانی میں بیوہ ہوئی اور اپنی تمام زندگی آپکی بہتری اور آپکو ایک کامیاب انسان بنانے میں گذار دی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔ اپنی اس عظیم ہستی کا ہی خیال کرو۔

2) آپ میں سے جو ڈاکٹر بن رہا ہے کیا وہ کوئی عام لڑکا ہے۔ آپکے ماں باپ کو جب علم ہوگا تو ان پر کیا گزرے گی اور اس عادت کے ساتھ کیا آپ اپنے پیشے کے ساتھ انصاف کرسکیں گے۔ آپکو ڈاکٹر صاحب اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کچھ تو اپنے ماں باپ سے وفا کریں۔ اپنے آپکو پہچانیں اپنی اصلاح کریں اس سے پیشتر کے بہت دیر ہو جائے۔

3) آپ ایک استاد ہیں اور استاد محترم قوم کا معمار ہوتا ہے۔ یہ کیسا معمار ہے جو نشے کی عادت میں مبتلا ہے۔ جب اسکو زندگی کا شعور ہی نہیں تو قوم کے بیٹے اور بیٹیوں کو وہ تعلیم کے زیور سے کیسے آراستہ کرے گا۔ فرانس کی عدالتوں میں اگر کوئی استاد کسی بھی وجہ سے پیش ہو تو اس کو کرسی پیش کی جاتی ہے جبکہ وہاں یہ سہولت صدر یا وزیر اعظم کو بھی حاصل نہیں۔ یہ ہے استاد کا مقام۔ میری آپ سے ایک بزرگ ہونے کی حیثیت سے درخواست ہے کہ اپنے آپ کو جانو۔ اپنی زندگی کو مقصد کی طرف گامزن کرو۔ اپنے آپکو، ماں باپ، بہن

بھائی کسی کو بھی خوابوں کی جنت نہ دکھاؤ۔ مفروضے مت قائم کرو۔ بزدل نہ بنو۔تم پٹھان بچے ہو اگر تم دل جان سے نشہ چھوڑنا چاہو تو مجھے یقین کامل ہے کہ تم چھوڑ سکتے ہو۔ اسلئے تمہیں اپنی زندگی کی روش بدلنی ہوگی۔ اپنی زندگی میں ایک Discipline لانا ہوگا۔ پاکیزگی لانی ہوگی۔ آپ نہ صرف اپنے ساتھ ظلم کررہے ہیں بلکہ اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ بھی ظلم کررہے ہیں۔ بہت ہو چکا، آپ اپنے ماں باپ پر رحم کریں۔ زندگی کو نشے کے ساتھ گذارنے کی بجائے ماں باپ کی شفقت کے سائے میں گذاریں۔ اللہ تعالیٰ بھی آپکا حامی و ناصر ہوگا۔

بقول حبیب جالب:

گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

آپ کے دیگر ساتھی بچوں کے لئے بھی میری یہی درخواست ہے۔ بند کردیں یہ سب کچھ بند کردیں۔ چرسیوں کی محفل کو بند کردیں۔ یہ آپ جیسے بچوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ سب لوگ پڑھے لکھے ہیں اور آپ لوگوں میں کوئی کمی نہیں ہے نہ ہی آپ لوگ کسی سے کم ہیں۔ مگر یہ جو آپ نے علت اپنی زندگیوں کو لگا لی ہے اسکا کوئی آسان مداوا نہیں ہے۔ ابھی وقت ہے اگر آپ لوگ مردانگی سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی آپ لوگوں کو برکت عطا فرمائیں گے اور ماں باپ بہن بھائی معاشرہ کو خوش کرنے اور اپنے آپکو عملی زندگی اور پاکیزگی کی طرف لوٹ کر جانے میں آپکی مدد فرمائیں گے اور اپنی رحمتوں کے دروازے آپ پر کھول دینگے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ قرآن پاک کے فرمان کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ اگر آپ نے اپنی زندگی کو گل و گلزار کرنا ہے تو ماں باپ کے فرمابردار بن جاؤ۔

میرے بچو! آپ سب اپنے آپ پر مجھ پر اور اپنے ماں باپ پر رحم فرمائیں اور میری درخواست پر عمل کرتے ہوئے تمبا کو نوشی اور چرس سے چھٹکارا حاصل کریں کہ اسی میں آپ کی بھلائی کامیابی اور صحت مندی ہے۔ میں حرفِ آخر کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ختم کرتا ہوں جو ذاتِ باری تعالیٰ نے سورۃ النسا اور سورۃ بقرہ میں دیا ہے۔

1) سورہ النسا میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ے ترجمہ: (اپنے آپ کو قتل مت کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے)

2) سورہ البقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

ترجمہ: (اپنے ہاتھوں کو ہلاکت اور تباہی کی طرف نہ ڈالو)

-------اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو---------

گیارہواں باب

ایک سفاک قاتل

(سگریٹ نوش ہوش فرمائیں)

اپنے ملک کے پیارے بچوں اور بچیوں کے لیے اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اس مضمون کو پڑھیں اور غور کریں۔ بظاہر یہ مضمون آپ کو شاید بورنگ محسوس ہوگا۔ کچھ نونہال تو اس کو پڑھنا بھی گوارہ نہیں کریں گے۔ کچھ طنزیہ رویہ اختیار کریں گے۔ کچھ پڑھ تو لیں گے مگر عمل نہیں کریں گے۔ جن بچوں کو اللہ تعالیٰ ہمت اور توفیق عطا فرمائیں گے وہ اس کو پڑھ کر عمل بھی کریں گے اور باقی زندگی صحت مند بھی رہیں گے۔ (انشاءاللہ)

سگریٹ نوشی ابتداء میں بے ضرر ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ لوگوں کو سرطان، امراضِ قلب، بلڈ پریشر، سٹروک اور دیگر جان لیوا بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سگریٹ میں تقریباً پانچ ہزار کے قریب کیمیکلز ہوتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ستر (70) کے قریب سرطان جیسے موذی مرض کا باعث بنتے ہیں۔ سگریٹ میں نکوٹین جیسی خطرناک چیز بھی ہوتی ہے جو سگریٹ نوش کو اُس کا عادی بنا دیتی ہے۔ جب سگریٹ نوش سگریٹ کا کش لگاتا ہے تو نکوٹین سانس کے ذریعے بہت تیزی سے اُس کے دماغ میں داخل ہو جاتی ہے۔ نکوٹین جیسے کیمیکل میں کچھ عنصر ہیروئین کا بھی ہوتا ہے اور سگریٹ نوش کے دماغ میں ہیروئین بھی جا رہی ہوتی ہے۔ سگریٹ نوش چڑچڑے پن کا شکار رہتے ہیں۔ تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ قدرتی ماحول اور معاشرتی زندگی سے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف ان کی نیند متاثر ہوتی ہے بلکہ بھوک بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بار بار کش لگانے سے زبان کی بال سے بھی زیادہ باریک رگوں کو شدید نقصان پہنچتا ہے جس سے اُن کی زبان ذائقہ محسوس کرنے سے محروم ہو جاتی ہے۔ وہ کچھ بھی کھالیں انہیں کوئی ذائقہ

محسوس نہیں ہوتا۔سگریٹ نوش کی سونگھنے کی حس بھی متاثر ہوتی ہے اور بینائی بھی کمزور ہوسکتی ہے۔آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان حسّیات سے محرومی، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے محرومی ہے یا نہیں۔

دنیا بھر میں سگریٹ نوشی سے ہونے والی اموات میں سے 90% کی وجہ Lungs Cancer ہوتا ہے۔جبکہ 20% دیگر قسم کے cancers سے واقع ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے منہ، گردے، چھاتی کے کینسر کے مریض ہر شہر کے ہسپتالوں میں موجود ہیں جو زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں جس میں بظاہر موت ہی فاتح محسوس ہوتی ہے (اللہ نہ کرے)۔اگر زندگی یہ جنگ جیت بھی جائے یا جنگ طویل ہو جائے تو پھر بھی مریض کے لواحقین معاشی موت مر جاتے ہیں جو زیادہ خطرناک اور قابلِ رحم ہے کیونکہ معاشی موت مرنے والا پورا خاندان ہوتا ہے۔

اچانک ہارٹ اٹیک سے مرنے والوں کی اکثریت کا تعلق تمباکو نوشی سے ہوتا ہے۔تمباکو نوشی کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ آپ اگر سگریٹ نوش نہیں بھی ہیں تو سگریٹ کے دھویں سے آپ اتنا ہی متاثر ہوں گے جتنا کوئی بھی سگریٹ نوش ہوتا ہے۔یہ کتنا حیران کُن المیہ ہے کہ پوری دنیا میں تقریباً دولاکھ سیکنڈ ہینڈ سگریٹ نوش افراد (وہ افراد جو خود سگریٹ نوشی نہیں کرتے مگر سگریٹ پینے والوں کے ساتھ رہتے ہیں) کو موت ہڑپ کر لیتی ہے۔یہ دولاکھ افراد وہ ہیں جو سگریٹ نوشوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے ساتھ دفتروں میں کام کرتے ہیں، اُن کے اہلِ خانہ اور دوست احباب ہیں۔تمام public places مثلاً ہوٹل، کلب، ریلوے اسٹیشن، مارکیٹ، دکانیں، سیرگاہیں، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، غرض کوئی بھی جگہ ان سگریٹ کے عادی بیمار لوگوں کے زہریلے اور غلیظ سانس اور کیمیکل بھرے دھوئیں سے محفوظ نہیں ہے۔ایک انٹرنیشنل سروے کے مطابق ہر سال 30% سیکنڈ ہینڈ سموکرز عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر ہسپتال پہنچتے ہیں جبکہ دیگر کی ایک بڑی تعداد پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہوئی۔ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر آپ دو سے اڑھائی گھنٹے کسی ہوٹل یا دفتر میں سگریٹ پینے والوں کے ساتھ گزاریں تو تقریباً چار سگریٹ کے برابر آپ بھی سموکنگ کر چکے ہوتے ہیں۔اور اس ناکردہ جرم کی سزا صحت کی خرابی کی صورت میں بھگتنی پڑتی ہے۔

ہوس کے مارے اور عالمی مافیا کے لوگ ایک سازش کے تحت تمباکو کو پوری دنیا میں پھیلانے میں بے

حد کامیاب رہے ہیں۔ UK، انڈونیشیا، میکسیکو، پاکستان اور کئی ترقی پذیر ممالک ان کی جنت ہیں۔ اکثر تمباکو کمپنیاں عالمی تاجروں نے خرید لی ہیں اور اس ہلاکت خیز دھندے کو پوری دنیا میں پھیلانے میں مصروف ہیں۔ خاص طور پر بچوں اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ایک سازش کے تحت اس مکروہ اور خوفناک عادت میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ پاکستان ڈیموگرافک سروے کے مطابق ہمارے ملک میں تمباکو نوشی سے مرنے والوں کی سالانہ تعداد 25% ہے۔ 55% گھرانوں میں تمباکو نوش موجود ہیں جن کی وجہ سے تمام اہلِ خانہ خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ آج کل پاکستان کے تعلیمی ادارے بھی سگریٹ، بیڑی، حقہ، شیشہ اور دیگر منشیات سے مبرّا نہیں ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق روزانہ 1200 بچے بچیاں جن کی عمریں 6 سال سے 15 سال تک ہیں اس لعنت میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ انٹرنیشنل ڈیموگرافک سروے کے مطابق ہر سال 50 لاکھ افراد سگریٹ نوشی کی وجہ سے موت کی وادی میں جا بستے ہیں۔

بیسویں صدی کے دوران 100 ملین افراد تمباکو نوشی کی وجہ سے لقمہ اجل بن گئے۔ جبکہ ایک محتاط اندازے کے مطابق اکیسویں صدی میں ایک بلین افراد موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ 2030ء تک دنیا بھر میں تمباکو نوشی کی وجہ سے جو اموات ہوں گی اُن میں سے 80% لوگوں کا تعلق کم آمدنی والے ممالک سے ہوگا۔ پاکستان میں روزانہ تقریباً 300 لوگ اس قبیح عادت کی وجہ سے وفات پا جاتے ہیں اور تقریباً 5000 لوگ اس عادت کی وجہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ لوگ اپنے ہی پیسوں سے اپنے لیے موت خریدتے ہیں، آہستہ آہستہ موت کی وادی میں اُتر جاتے ہیں اور لواحقین کو ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں مبتلا کر جاتے ہیں۔ دنیا میں ایک منٹ میں دس ملین سگریٹ فروخت ہوتے ہیں اور ہر 5 سیکنڈ بعد ایک شخص تمباکو نوشی کی وجہ سے مر جاتا ہے۔

یہ خوفناک دشمن (تمباکو) کیا ہے؟

تمباکو ایک زرعی پیداوار ہے جو 'نیکوٹینیا' پودے سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک جُز کیڑے مارنے والی ادویات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ 1559ء میں فرانسیسی سفیر برائے پرتگال مسٹر جین نکوٹ نے تمباکو کو ایک عدالت میں بطور دوا متعارف کروایا۔ اسی کے نام کی مناسبت سے نکوٹین باقی دنیا میں متعارف

ہوئی۔ لیکن جب انسانی زندگی کے لیے نکوٹین کے نقصانات کو دنیا کو پتہ چلا تو اس کی فروخت کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ 1970 میں براؤن اینڈ ولیمن نے تمبا کو کی ایک نئی قسم بنائی جس میں نکوٹین 3.5% کے بجائے 6.5% تھی۔ جسے WHO نے 2003 میں کنٹرول کرنے کے لیے 168 ممالک سے معاہدے کیے۔

سگریٹ میں نکوٹین کے علاوہ بے حد خطرناک اور مہلک کیمیکلز بھی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے قاتل ہیں۔

۱۔ Benzene: یہ ایندھن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کو یہ Lukemia میں مبتلا کر سکتا ہے۔

۲۔ Formaldehyde: یہ ایک بے رنگ کیمیکل ہے جو مُردوں کو محفوظ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سانس اور نظامِ ہضم کو فنا کر دینے کے علاوہ کینسر بھی کر سکتا ہے۔

۳۔ Ammonia: یہ ماحول میں رچ بس جاتا ہے اس لیے سانس کے امراض پیدا کرتا ہے۔

۴۔ Acetone: نیل پالش اور پینٹ صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ انسانی صحت کے لیے بہت خطرناک ہے۔

۵۔ Tar: سگریٹ کے دھویں سے پھیپھڑوں میں داخل ہونے والا کیمیکل۔ ایک بار استعمال سے tar 70% پھیپھڑوں میں جم جاتا ہے۔

۶۔ Nicotine: سگریٹ میں پایا جانے والا نشہ آور کیمیکل ہے۔ اس کے استعمال سے انسان اس کا عادی بن جاتا ہے۔

۷۔ Carbon monoxide: گاڑیوں کے دھویں سے بننے والی زہریلی گیس جو سگریٹ کے دھویں سے بھی بنتی ہے۔

۸۔ Varinicline: ڈپریشن، امراضِ قلب، شریانوں کا پھیلاؤ اور خودکشی کا رجحان پیدا کرتی ہے۔

۹۔ Lead: خون میں شامل ہو کر آکسیجن کی فراہمی کم کر دیتا ہے۔

۱۰۔ Tsnas: تمبا کو میں استعمال کیا جانے والا کیمیکل جو پھیپھڑوں کے کینسر کا باعث بنتا ہے۔

۱۱۔ Arsenic: کیڑے مار ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تیر بہدف زہر اور انسانی زندگی کا قاتل ہے۔

۱۲۔ Cadmium: بیٹریوں میں استعمال کیا جانے والا ایک مہلک کیمیکل ہے۔ سگریٹ نوشوں میں اس کی مقدار کئی گنا زیادہ ہونے سے زندگی مفلوج ہو جاتی ہے۔ L-210 اور P-210 کیمیکل کے اثرات تابکاری اثرات کی طرح خطرناک ہیں اور اتنے ہی نقصان دہ بھی ہیں۔

ایک سگریٹ میں تقریباً 8 ملی گرام نکوٹین ہوتا ہے۔ نکوٹین تمباکو کا سب سے قاتل زہر ہے۔ سگار میں 150 -200 ملی گرام نکوٹین ہوتا ہے۔ اگر 40 ملی گرام نکوٹین ڈائریکٹ کھا لیا جائے تو موت واقع ہو سکتی ہے۔ ایک سگریٹ پینے سے 2 ملی گرام نکوٹین جسم میں داخل ہوتا ہے باقی ہوا میں تحلیل ہو کر ماحول کو زہر آلود کرتا ہے۔ ایک سگریٹ سے کئی کش لیے جا سکتے ہیں۔ پہلے 2/3 کش ذہن کو سکون دیتے ہیں اور تازہ دم کر دیتے ہیں لیکن کچھ ہی دیر بعد زہر کی بڑھتی ہوئی مقدار دل کی دھڑکن تیز کر دیتی ہے، خون کے بہاؤ کو سست کر دیتی ہے جس سے مایوسی، ڈپریشن اور خودکشی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

تمباکو نوشی سے سب سے زیادہ پھیپھڑے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ سانس کی نالیاں تنگ ہو جاتی ہیں اور سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے، آکسیجن جمع کرنے کی صلاحیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اندرونی جھلّی میں سوزش ہو جاتی ہے اور مریض کو کینسر ہو جاتا ہے۔ حاملہ خواتین میں تمباکو کے زہریلے اثرات بچے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کھانسی، Bronchitus، دمہ، بار بار نزلہ زکام ہونا، ٹی بی، نمونیہ، ہائی بلڈ پریشر، دل کا دورہ، سانس پھولنا، فالج، فیصلہ کرنے کا رجحان، آنکھ کے پردے کی کمزوری، پلکیں بار بار جھپکنا، سونگھنے کی حِس میں کمی، ہارمونز کی تعداد کم یا زیادہ ہونا، Thyroid glands کی خرابی، جلد کا خشک ہونا اور جھریاں پڑنا، مسوڑھوں پر چھالے پڑنا، دانت پیلے ہو جانا، گلے کا کینسر، سانس کی بو، گلے کی بار بار خرابی، جلد کا انفیکشن ہونا، ہاتھ اور انگلیوں کا ٹھنڈا ہو جانا، مردانہ ہارمونز کی کمی، مردانہ اور زنانہ بانجھ پن ہو سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا تمام امراض second hand smokers کو بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر بچے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

Tobacco Research Centre, California, USA کے مطابق تمبا کونوشی ماحول اور فضا کو بہت بری طرح آلودہ کرتی ہے۔ تمبا کو کے اجزاء جیسے کہ Lead and Cyanide ہوا میں دیر تک رہتے ہیں اور Third hand smokers کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ Light brands کے سگریٹ بھی بہت نقصان دہ ہیں۔ یہ غلط تاثر ہے کہ Light brands کے سگریٹ نقصان نہیں پہنچاتے۔

کمزور شخصیت لوگوں میں اعتماد کی کمی ہوتی ہے۔ وہ اپنی کوئی بھی بری عادت نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ وہ احساسات سے عاری ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنا آپ نظر آتا ہے اور اپنے خاندان کی تباہی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ تمبا کونوشی کی وجہ سے جان لیوا امراض میں مبتلا ہو کر بسترِ مرگ پر پہنچ جاتے ہیں اس وقت صرف پچھتاوا ان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ ہاتھ ملتے راہی ملکِ عدم بن جاتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں پُر اعتماد شخصیت کے لوگ ایک منٹ کے نوٹس پر عہد کر لیتے ہیں کہ آج کے بعد اس موذی اور انسان دشمن شے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے تو دو چار دن ضرور اُن کو بے چینی اور چڑ چڑا پن ہوتا ہے مگر 20 منٹ بعد ہی دل کی دھڑکن اور بلڈ پریشر کم ہونے لگتا ہے۔ 12 گھنٹے بعد خون میں carbon monoxide کی مقدار کم ہونے لگتی ہے۔ کم از کم 4 اور زیادہ سے زیادہ 13 ہفتوں میں پھیپھڑوں کے کام کرنے کی صلاحیت بہت اچھی ہونے لگتی ہے۔ 4 سے 20 ہفتوں میں کھانسی اور سانس لینے میں دشواری نارمل ہونے لگتی ہے۔ ایک سال کے بعد دل کے دورے کا خطرہ 50% کم ہونے لگتا ہے۔ 5 سال کے بعد فالج کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ 8 سال کے بعد کینسر ہونے کا خطرہ 100% ٹل جاتا ہے۔

تمبا کو کی مرحلہ وار تیاری اور اس کی تاریخ

تمبا کو پودے سے حاصل کرنے کے بعد دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ پھر تمبا کو کے پتوں کو مختلف کیمیکل کے عمل سے گزارا جاتا ہے اور دورانِ عمل اس کو نمی اور بارش سے بچایا جاتا ہے۔ جب یہ پتے خشک ہو جاتے ہیں تو بھٹی میں ڈال کر ان پر مزید عملِ کیمیائی کیا جاتا ہے تاکہ سگریٹ، پان اور نسوار کے لیے تمبا کو تیار کیا جا سکے۔ تمبا کو مختلف ادوار میں کئی شکلوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ذرا اس کی تاریخ پر غور کرتے ہیں۔

تمبا کو کا استعمال اتنا ہی پرانا ہے جتنی انسانی تاریخ پرانی ہے۔ وقت کے ساتھ اس کے استعمال کے

طریقوں میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔مثال کے طور پر اٹھارویں صدی تک تمباکو Snuff (سونگھنے کے لیے تمباکو کا پاؤڈر) کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پھر انیسویں صدی میں سگارز مشہور ہوئے۔ بیسویں صدی میں سگریٹ متعارف ہوئے اور پھر تمباکو نوشی میں بے انتہا اضافہ ہوا اور آجکل تمباکو کا استعمال سگریٹ، سگارز، بیڑی، حقہ، نسوار، بیڑا شیشہ اور دیگر کئی طریقوں سے کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر smokeless tobacco جلائے بغیر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو منہ میں رکھ لیا جاتا ہے یا پھر ناک سے سونگھ کر لیا جاتا ہے۔ نسوار یا بیڑا منہ میں ہونٹ کے اندر رکھ لیا جاتا ہے اور اس کو آہستہ آہستہ چوسا جاتا ہے۔

Smokeless Tobacco کی مندرجہ ذیل اقسام دنیا بھر میں مشہور ہیں:

ا۔ چوسا جانے والا تمباکو (Sucked Tobacco)

ست والی نسوار، سبز نسوار، کالی نسوار، بنوں سواجی نسوار، چمن کی نسوار، حویلیا نسوار، شمع نسوار، تمباکو ٹکیا، گٹکا۔

۲۔ چبایا جانے والا تمباکو (Chewed Tobacco)

پان، گٹکا، سپاری، یا نگ قوام، تمباکو گم، زردہ وغیرہ

۳۔ سونگھ کر لیا جانے والا تمباکو (Nasal Tobacco)

یہ تمباکو پاؤڈر کی شکل میں ہوتا ہے جس میں خوشبو شامل کی جاتی ہے اور یہ ناک سے inhale کیا جاتا ہے۔

۴۔ مائع نسوار (Dry snuff)

یہ تمباکو ٹوتھ پیسٹ میں دانتوں کے علاج اور صفائی کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ لال دت منجن، کریمی سلف اور گدھا کو نامی منجن میں استعمال ہوتا ہے۔

اکثر لوگ smokeless تمباکو کو بے ضرر خیال کرتے ہیں لیکن یہ ان کی کمزوری اور حقیقت سے فرار ہے۔ Smokeless تمباکو سے مندرجہ ذیل موذی امراض ہوسکتے ہیں:

منہ کا کینسر، جگر کا کینسر، پھیپھڑوں کا کینسر، دل کے امراض، آنکھوں کے امراض، مسوڑھوں کے امراض، دانتوں کے انفیکشن اور ہائی بلڈ پریشر جبکہ ماحول پر بھی بہت برے اثرات ہوتے ہیں۔ پان، نسوار

وغیرہ منہ میں رکھنے سے منہ نہایت غلیظ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے عادی لوگوں کو بار بار تھوکنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ضرر رساں اور نظر نہ آنے والے جراثیم پیدا ہو کر دیگر لوگوں کو بیمار کرتے ہیں۔ شراب، سگریٹ اور کسی بھی شکل میں تمباکو کا استعمال خون میں لوتھڑا بنا سکتا ہے، خون میں آکسیجن کم کرتا ہے، جگر، بلڈ پریشر اور جوڑوں کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

VIP جہاز

اب ایک نئی عفریت نے نوجوان نسل کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ نئے فیشن اور تہذیب کے دلدادہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شغل کے طور پر شیشہ کی آڑ میں جس قسم کے فلیورز استعمال کر رہے ہیں وہ دانستہ طور پر موت کے منہ میں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ شیشہ پینے کی وبا عرب ممالک سے شروع ہوئی اور اس کا روایتی نام عرب واٹر پائپ ہے۔ شیشہ بہت سے فلیورز میں دستیاب ہے۔ جس میں گلاب، سیب، انگور، کیلا، سٹرابری، ونیلا، چاکلیٹ وغیرہ کم نقصان دہ فلیورز ہیں۔ اگر نوجوان نسل fruity flavours تک محدود رہے تو یہ اُن کی زندگی کے لیے کم نقصان دہ ہے۔ آجکل جو کچھ وہ پی رہے ہیں وہ سیدھا سادہ تیر بہدف نشہ ہے۔ یہ وقتی طور پر سکون دیتا ہے مگر اعصابی نظام کو بری طرح متاثر کرتا ہے اور شیشہ پینے والا اپنا عکس آئینے میں دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

شیشہ کلچر اگر قریب سے دیکھنا ہو تو لاہور کے پوش علاقوں میں 60/70 شیشہ گھر ہیں جہاں پر شیشہ کلچر کے رسیا لڑکے اور حوریں سرِ شام ہی مستی میں ڈوبنے آجاتے ہیں اور یہ مستی اُن کے لیے اخلاقی اور جسمانی تباہی کا موجب بنتی ہے۔ بدیسی کلچر اپنا کر اس مہنگے شوق کو پورا کرنے والے اپنے آپ کو VIP خیال کرتے ہیں مگر میری نظر میں یہ لوگ VIP جہاز ہیں۔ ہیروئین پینے والے جہاز گلی کی نالیوں میں پڑے ہوتے ہیں اور یہ VIP جہاز مدہوش ہو کر ایک دوسرے کے اوپر یا قالینوں اور صوفوں پر پڑے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ شیشے کی آڑ میں یہ جو کچھ اپنے اندر ڈال رہے ہیں وہ جلد یا بدیر انہیں موت کی وادی میں لے جائے گا (اللہ نہ کرے! اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کو عقل و ہدایت دے۔۔۔ آمین!)

مجھے آپ سب سے صرف یہ کہنا ہے۔۔۔۔

بقول شاعر:

ہم مر جائیں گے ایک دن دیکھ لینا
رو گے بہت تم اُس دن دیکھ لینا
دنیا میں تو تمہیں پروا نہیں ہماری
چھوڑ جائیں گے تمھیں ایک دن دیکھ لینا
آنسو چھپاتے پھرو گے سب سے تم
اتنا ہی ہم یاد آئیں گے دیکھ لینا
کچھ یادیں میٹھی سی تم کو بہت ستائیں گی
تم خود کو نہ روک پاؤ گے دیکھ لینا
مانا کہ کچھ نہیں ہیں ہم آج تمھارے لیے
کل بن جائیں گے ایک یاد دیکھ لینا

ایک امریکی ویب سائٹ کے مطابق سگریٹ اور تمباکو کو دیگر اشکال میں ڈھالنے کے لیے مندرجہ ذیل کیمیکل استعمال ہوتے ہیں

- کاربن مونوآکسائیڈ (carbon monoxide)
- ایسٹون Acetone (جونیل پالش میں استعمال ہوتا ہے)
- ایمونیا Ammonia (ٹوائلٹ صاف کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے)
- پینٹ
- میتھا
- سٹرک ایسڈ Citric Acid
- نکوٹین
- میتھین گیس Methane gas

۔چوہے مارادویات

۔فورملاڈی ہائیڈ (جومردہ جانوروں کو محفوظ کرنے میں استعمال ہوتا ہے)

ستم ظریفی دیکھئے کہ حضرت انسان اپنی ہی کمائی سے اپنے لیے موت خریدتا ہے اور سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود خریدتا چلا جا رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی کا دورانیہ انتہائی اذیت ناک ہوسکتا ہے۔ وہ موت سے بھی ہمکنار ہوسکتا ہے، معذور بھی ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔۔۔آمین!

بارھواں باب

جو ہم پر گزری

(زندگی اور موت میں فیصلہ کن گھڑیاں)

نومبر کے پہلے عشرے کی بات ہے کہ ایک روز میں اپنے دوست جناب نذیر خالد صاحب سے فون پر بات کر رہا تھا جو کہ لاہور میں رہتے ہیں۔ وہ میری پہلی کتاب ''فرشتے کی ایف آئی آر'' کے متعلق سوال کر رہے تھے کہ اچانک لائن کٹ گئی اور ساتھ ہی میرے بھانجے عطاء الرحمٰن المعروف خان صاحب کا فون آ گیا۔ وہ کہنے لگا کہ ماموں ایک بُری خبر ہے۔ میں نے بے ساختہ پوچھا کہ کیا خبر ہے تو وہ بولا کہ ماموں قدیر جو کرونا کا شکار ہو کر سول ہسپتال میں داخل تھے فوت ہو گئے ہیں۔ میں نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر فون بند کر دیا۔

نذیر خالد صاحب کا فون دوبارہ آ گیا، فرمانے لگے کہ فون کیوں بند کر دیا۔ میں نے بتایا کہ لائن کٹ گئی تھی اور میرے بھانجے خان صاحب کا فون آ گیا تھا جن کی زبانی پتہ چلا کہ سمہ سٹہ والے قدیر صاحب فوت ہو گئے ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی گفتگو کر رہے تھے اور جو ''فرشتے کی ایف آئی آر'' نامی کتاب لکھنے کی وجہ بنے۔ نذیر صاحب نے جھٹ سے پوچھا کیا آپ جنازے پر جائیں گے۔ میں نے NO کہہ کر فون بند کر دیا کیونکہ طبعیت مزید خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں خیالات میں غرق بیٹھا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرے چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں، میں ان کے درمیان کھڑا ہوں اور وہ مزید بلند ہو رہے ہوں۔ میں نے بہت زور لگا کر اس خیالی حصار کو توڑا اور اُٹھ کر باہر لان میں چلا گیا۔ میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسی اثناء میں خان صاحب کا دوبارہ فون آ گیا۔ کہنے لگا ماموں غلطی ہو گئی۔ اُن کے ساتھ والا مریض فوت ہوا تھا۔ ہسپتال سے کسی نے غلط فہمی کی وجہ سے سمہ سٹہ اُن کے گھر فون کر دیا تھا۔ قدیر صاحب زندہ ہیں اور بوجہ کرونا سول ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں خاموش ہو گیا کیونکہ طبعیت بہت زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ میں گھر کے لان میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ تمام حالات و واقعات ایک فلم کی طرح دماغ کی سکرین پر چل رہے تھے۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا اور مغرب کی اذان

ہونے لگی۔ میں اُٹھا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ روزمرہ کے روٹین کے مطابق رات 10 بجے تک میں مصروف رہا اور اس کے بعد اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ جلد ہی نیند آ گئی۔

رات کو تقریباً اڑھائی بجے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں اُٹھا اور واش روم کی طرف جانے کی کوشش کی لیکن سر بُری طرح گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسی حالت میں جلدی سے میں نے اپنے کمرے کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ دروازہ کھول کر میں اپنے بستر کی طرف مُڑا۔ اس کے بعد جب ہوش آیا تو میرے دونوں بیٹے بلا صاحب اور سالار صاحب میرے اوپر جھکے مجھے زور زور سے آوازیں دے رہے تھے۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو vomiting شروع ہو گئی۔ سوائے پریشر کے اور کچھ نہ نکلا کیونکہ مجھے گزشتہ پانچ دن سے بخار تھا اور پانی کے علاوہ کوئی ٹھوس غذا نہیں لے سکا تھا۔ کھانے کی کوئی چیز دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر شوکت مامون صاحب کی Advice پر Tab. Azomax اور Tab. Panadol لے رہا تھا۔ بخار 100 ڈگری سے کم نہیں ہو رہا تھا۔

Vomiting کے بعد مجھے نیند آ گئی اور صبح آٹھ بجے تک سویا رہا۔ صبح اُٹھ کر واش روم سے دانت وغیرہ صاف کر کے ابھی لیٹا ہی تھا کہ مالی نے فون پر ڈاکٹر شوکت مامون صاحب اور ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب کے آنے کی خبر دی۔ دونوں ڈاکٹر صاحبان میرے کمرے میں تشریف لے آئے۔ انھوں نے مجھے چیک کیا اور ابھی آپس میں مشورہ کر ہی رہے تھے کہ مجھے پھر vomiting شروع ہو گئی۔ صرف پریشر release ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عزیز الرحمٰن نے 1122 پر کال کر کے ایمبولینس منگوائی اور دونوں ڈاکٹر صاحبان مجھے بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال کے CCU میں لے گئے۔ انھوں نے مجھے Admit کرا دیا اور ضروری انجکشن لگوائے۔ اسی اثناء میں میرے داماد ڈاکٹر اصغر ہاشمی اور فیصل مسعود خان بھی ہسپتال پہنچ گئے۔ ساتھ ہی میرے بیٹے بلا صاحب اور علی صاحب بھی آ گئے۔

علاج شروع ہو گیا۔ جب میری طبیعت کچھ بہتر ہونے لگی تو ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب واپس چلے گئے لیکن ڈاکٹر شوکت مامون صاحب رات 10 بجے تک میرے پاس رہے اور میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے کئی بار اُن سے درخواست کی کہ ڈاکٹر صاحب آپ جائیں، اب بچے میرے پاس ہیں۔ لیکن اُن کا محبت سے لبریز جواب آتا کہ کوئی بات نہیں آپ فکر نہ کریں میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

ہسپتال میں پہلی رات تھی۔ میرا بیٹا علی دانیال آصف میری دیکھ بھال کے لیے میرے پاس رہا۔ وہ

تمام رات میرے بیڈ کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھا مجھے پریشانی سے دیکھتا رہا۔73 برس کی عمر میں مجھے پہلی بار ہسپتال داخل ہونا پڑا تھا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔رات کے کسی حصے میں ایک مریضہ کو لایا گیا جو اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ یا اللہ مجھے معاف کردو۔۔یا اللہ مجھے معاف کردو۔۔یا اللہ مجھے معاف کردو! اس سے بھی اُونچی آواز میں اُس کی بیٹی بعمر 11/12 سال چیخ چلا رہی تھی کہ میری امی کو کیا ہوگیا۔ڈاکٹر اور نرسیں اُس مریضہ کو stable کرنے کی پوری کوشش کررہے تھے۔یکدم اُس مریضہ کی آواز آنی بند ہوگئی۔وہ ملکِ عدم کو روانہ ہوگئی تھی۔انا للہ وانا علیہ راجعون! اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اس خاتون کی مغفرت فرمائے اور منزلیں آسان فرمائے۔آمین!

اُس کی بیٹی نے ایسی دلخراش چیخیں ماریں کہ پورا وارڈ دہل کر رہ گیا۔ہسپتال کے سٹاف نے جلدی جلدی dead body کو وہاں سے remove کیا۔لیکن مجھے آکسیجن کی ضرورت پڑ گئی تھی۔اُس بچی کی چیخیں باہر سے بھی واضح سنائی دے رہی تھیں۔

میرے بیڈ کے سامنے والی Lane میں بیڈ نمبر 7 پر ایک مریض موجود تھا۔ہر 10/15 منٹ کے بعد اس کا cell phone چیخ اُٹھتا۔وہ بات بھی اُونچی آواز میں کرتا۔جس کی وجہ سے میں بہت ڈسٹرب علی الصبح اُس نے اپنے گھر فون کیا۔غالباً کوئی بچی بول رہی تھی۔وہ مریض اس بچی سے کہہ رہا تھا کہ بلو! ناشتہ جلدی بھیج دینا۔(دیہاتی لوگ پیار سے بچی کو بلو کہتے ہیں)۔بچی نے شاید بتایا کہ دلیہ بنا رہی ہوں۔مریض ناراضگی سے بولا کہ تم چھوڑو دلیے کو سیدھا سادہ ناشتہ بھیجو، جس میں وہ انڈوں، پراٹھوں اور دیگر چیزوں کا نام لے رہا تھا۔آٹھ بجے کے قریب بلو ناشتہ لے کر آ گئی۔مریض نے دل لگا کر ناشتہ کیا اور بلو برتن وغیرہ سمیٹ کر واپس چلی گئی۔دوپہر کو مریض کھانے کے انتظار میں تھا کہ ڈاکٹر اور نرسیں emergency میں اسکے بیڈ کے آس پاس اسکو سنبھالتے نظر آئے۔کافی دیر کے بعد اس کی حالت سنبھلی۔

اسی lane میں دو بیڈ چھوڑ کر بیڈ نمبر 4 پر ایک ادھیڑ عمر دیہاتی مریضہ تھی۔اس نے بیڈ نمبر 3 پر بھی اپنا سامان رکھا ہوا تھا جس میں فروٹ و دیگر انواع واقسام کا سامان تھا۔اس کے ملاقاتی بھی اسی بیڈ پر آ کر براجمان ہوتے تھے۔اس کا فون ایک منٹ کے لیے بھی چین نہ لینے دیتا۔جس میں ایک فون کال اس کی نند (خاوند کی بہن) کی ہوتی تھی۔نند ہمارے معاشرے میں بھابھی کی بڑی افسر کی طرح ہوتی ہے۔جیسے ہی نند صاحبہ کی کال آتی، مریضہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور اُونچی آواز میں دیر تک باتیں کرتی۔شاید نند

صاحبہ کو بھی دنیا جہاں کا اور کوئی کام نہ ہوگا ماسوائے فون کرنے کے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ اس مریضہ کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا ہے اور نند صاحبہ بہ نفسِ نفیس اپنی بھاوج صاحبہ کو لینے تشریف لائی ہیں۔ میں نے دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ایک فون سے جان چھوٹی۔ دوسرے کا بندوبست میں خود کر لوں گا۔ میں نے نرسنگ سسٹر سے کہا کہ اس نند صاحبہ کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دیں اور کہیں کہ بہت دیر کر دی مہرباں آتے آتے! وہ ہنس پڑیں اور بولیں کہ اتنا شعور ہوتا تو کیا بات تھی۔ بہرحال میں ذاتی طور پر اس نند صاحبہ کا بہت شکر گزار ہوں۔

دوسرے دن میرا بیٹا علی ضیاء کاشف المعروف سونو صاحب بھی لاہور سے آ گیا۔ دن میں میرے بچے ہسپتال آتے جاتے رہے۔ دوسری رات بھی میرا بیٹا علی دانیال آصف میرے پاس تھا اور ساری رات جاگتا رہا۔ یہ دو راتیں جو میں نے BVH میں گزاریں اس دوران ڈاکٹر فخر عباس صاحب نے میری مدد اور خبر گیری کی اور جو کچھ بھی ایک انسان کے بس میں ہو سکتا ہے وہ انہوں نے کیا۔ وہ BVH کے Additional MS ہیں۔ ایک شام میرے بچے اپنی امی جان کو ساتھ لے آئے۔ وہ حیران پریشان مجھے دیکھتی رہیں۔ فکر اور وسوسے اُن کے چہرے سے عیاں تھے۔ ہر وقت گل و گلاب رہنے والا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔ میں اپنی اہلیہ محترمہ کو طفل تسلیاں دیتا رہا کہ آپ فکر نہ کریں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی ہم گھریلو امور پر بات چیت کر رہے تھے کہ سامنے کے دروازے سے دو لڑکیاں ایک جیسے چُست لباس میں داخل ہوئیں، کاؤنٹر تک گئیں اور واپس چلی گئیں۔ اُن کا لباس ایسا تھا کہ کوئی بھی اُن کی طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ انہیں دیکھ کر میری اہلیہ محترمہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے لیکن وہ خاموش رہیں۔ میں نے بچوں سے کہا کہ اپنی امی جان کو گھر لے جائیں۔ اسی اثناء میں میری بڑی بیٹی آنسہ تشریف لے آئیں۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ میں نے ازراہِ تفنن یہ واقعہ سنایا تو وہ ہنسنے لگی۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر فضل نامی ایک نوجوان لڑکا اچانک نمودار ہوا۔ آتے ہی میرے میڈیکل چارٹ کو اٹھا لیا اور دیکھتا رہا۔ پھر مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرے بتانے پر کچھ مزید بے ربط سوال پوچھتا رہا۔ پھر میرے بازو سے لگی بوتل کو دیکھتا رہا اور جاتے جاتے بوتل کی رفتار تیز کر کے دوسرے بیڈ کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی حرکات غور سے دیکھ رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ابھی میچور ہونے میں وقت لگے گا۔ جیسے

ہی اُس نے بوتل کی رفتار تیز کی میرا دل ڈوبنا شروع ہو گیا۔ میں بے ہوش ہونے کے قریب تھا کہ میں نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے پاس بیٹھی اپنی بیٹی آنسہ کو چیخ کر کہا کہ بیٹا بوتل بند کر دو ورنہ میں گیا۔ اسی دوران ایک نرس جو پاس سے گزر رہی تھی سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اس نے تیزی سے بوتل کو بند کر دیا اور ڈاکٹر فضل کو گھورتے ہوئے منہ میں بڑبڑاتی چلی گئی۔ میری طبعیت بھی کچھ سنبھل گئی۔ ڈاکٹر فضل کچھ پریشان اور پشیمان سا پہلے تو کھڑا رہا پھر بھاگم بھاگ ایک سینئر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ انھوں نے مجھے تفصیل سے چیک کیا۔ اور مطمئن ہو کر ڈاکٹر فضل کو ساتھ لے کر ایک طرف کو چلے گئے۔ یہ ڈاکٹر صاحب اچھے اور sober تھے اور اپنے رویے سے ایک تجربہ کار ڈاکٹر نظر آ رہے تھے۔ نرسیں دیر تک آپس میں باتیں کرتی رہیں کہ یہ ہاؤس جاب والے ایسے ہی کرتے ہیں۔ میری اربابِ اختیار سے گزارش ہے کہ سینئر ڈاکٹر کے بغیر ہاؤس جاب والوں کو اجازت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ مریض کے ساتھ اپنی مرضی کر سکیں۔ سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ ہاؤس جاب والوں کی attachement ہونی چاہئے نہ کہ وہ independently جو چاہیں مریض کے ساتھ کریں۔ برائے مہربانی میری درخواست کو انسانی ہمدردی کی سطح پر پرکھیں۔

علاج جاری تھا۔ میری بھانجی سائرہ، بھانجا عبدالرحمٰن اور حبیب الرحمٰن بھی میری عیادت کے لیے آئے۔ بلکہ جس چیز کی بھی ضرورت پڑتی حبیب الرحمٰن لے کر فوراً حاضر ہو جاتا۔ طبعیت کچھ بہتر ہونا شروع ہوئی تو کرونا سپیشل یونٹ کا نمائندہ آ گیا۔ کرونا ٹیسٹ کے لیے ناک سے specimen لے کر چلا گیا۔ اگلی رات تین بجے میرے بیٹے علی دانیال نے مجھے بتایا کہ میری کرونا ٹیسٹ کی رپورٹ پوزیٹو آ گئی ہے۔ یہ CCU میں میری تیسری رات تھی۔ رات تین بجے ہی ایک وہیل چیئر میرے بیڈ کے ساتھ لگا دی گئی اور مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمبولینس کے ذریعے سِول ہسپتال کے سپیشل کرونا یونٹ شِفٹ کر دیا گیا۔

پہلے مجھے ایک بڑے ہال نما کمرے میں لے جایا گیا جہاں پر بہت زیادہ مریض تھے۔ بیڈ کے ساتھ بیڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے وہاں اپنا بیڈ لگوانے سے انکار کر دیا۔ اچانک میری نظر سامنے والے ہال نما کمرے پر پڑی۔ اس میں مریض کم تھے اور دو بیڈ بھی خالی تھے۔ میں نے ایک طرف کے بیڈ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ٹھیک ہے اور اس پر میرا بستر لگا دیا گیا۔ میرے بیٹے علی نے میرا سامان سیٹ کر دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ بیٹا اب آپ چلے جائیں کیونکہ میں بچوں کو کسی خطرے سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابھی میں بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ چکر آنے شروع ہو گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی اثناء میں ہال

میں چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ سامنے والا مریض ملکِ عدم سدھار چکا ہے۔اس کے لواحقین چیخ و پکار کررہے تھے۔دل میں خیال گزرا کہ اگر میں بھی اسی طرح اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا تو میرے بچے بھی اسی طرح روتے ہوئے مجھے لے جائیں گے۔اس وقت مجھے اپنے معصوم بچوں کا خیال آرہا تھا۔ پھر دیگر تمام رسومات کی فلم میرے دماغ میں چلنے لگی۔سوچتے سوچتے میری اہلیہ محترمہ کا چہرہ سامنے آگیا۔میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ میں ایک ماضی گزیدہ شخص تھا اور ہوں پھر بھی اس نیک دل خاتون کی خدمات میرے لیے گزشتہ 51 سالوں میں magnum opus رہی ہیں۔میں نے تڑپ کر چھت کی طرف دیکھا جیسے آسمان کی طرف دیکھا جاتا ہے۔میرے دل سے دعا نکلی کہ یا باری تعالیٰ مجھے مہلت عطا فرمادے۔ابھی میرے تین بیٹے شادی کے بغیر ہیں اور میں اپنی اہلیہ محترمہ کو اکیلےنہیں چھوڑنا چاہتا۔یقین مانیں یہ دعا میں نے مانگی نہیں بلکہ خود بخود میرے دل و دماغ سے نکلی اور جاری وساری رہی۔انہی سوچوں میں غرق تھا کہ ایک نرس نے آکر میرا نام پکارا۔میرے اشارہ کرنے پر بولی آپ کے لیے کمرہ تیار ہے میرے ساتھ چلیں۔اسی اثناء میں میرے بچے بلا صاحب اور سونو صاحب بھی آگئے اور مجھے پرائیویٹ روم میں شفٹ کردیا گیا۔میری طبعیت میں ایک ٹھہراؤ آچکا تھا۔جیسے سمندر تلاطم کے بعد پرسکون ہوجاتا ہے۔میرا سانس اور سینے کی جکڑن بھی ٹھیک ہوتی محسوس ہورہی تھی۔

سٹاف بھی آگیا اور ادویات بھی آنی شروع ہوگئیں۔میرے بچے ناشتہ لے کر آئے تھےلیکن میں طبعیت کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کھا سکتا تھا۔گزشتہ 15 روز سے بھوک بالکل غائب تھی ماسوائے کچھ گھونٹ پانی اور ادویات کے کچھ اور حلق سے نیچےنہیں اترتا تھا۔البتہ جو بھی ادویات ڈاکٹر صاحبان نے منگوائیں وہ سب یہ بچے لے آئے اور علاج شروع ہوگیا۔6 انجکشنز Remdesivir جو کرونا کے مریضوں کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں وہ لکھ کردیئے گئے۔وہ بھی بلا صاحب لے آئے۔یہ انجکشن کافی مہنگے تھےاور عام مارکیٹ میں بلیک ہورہے تھے۔

دراصل ہم لوگ مسلمان نظر تو آنا چاہتے ہیں لیکن اپنے عمل سے خود کو مسلمان ثابت نہیں کرسکتے۔ماہِ رمضان میں ہم ہر چیز مہنگی کردیتے ہیں۔وبا کی صورت میں پہلے ہم مارکیٹ سے ادویات غائب کرتے ہیں اور پھر درپردہ زاید قیمت پر اس کی بلیک میں فروخت شروع کردیتے ہیں۔آج ہی ایک ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ ان injections کی قیمت ایک لاکھ روپے فی انجکشن سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔خیر یہ 6

انجکشن آ گئے اور روزانہ ایک انجکشن لگنا شروع ہو گیا۔ ملٹی وٹامن بھی بازار سے منگوا لی گئیں۔ 5/6 قسم کے انجکشن جو صبح شام لگتے تھے وہ ہسپتال کی طرف سے مہیا کیے گئے جس کے لیے میں حکومت کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ policy makers کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

سول ہسپتال کے سٹاف کا روزمرہ کا معمول بہت اچھا تھا۔ صبح ٹھیک سات بجے نرسنگ سٹاف آ جاتا اور دو قسم کے انجکشن پیٹ پر لگائے جاتے۔ کچھ انجکشن بازو پر لگی ID میں داخل کئے جاتے۔ بلڈ پریشر اور شوگر لیول چیک کیا جاتا۔ Oximeter کے ذریعے Saturation چیک کی جاتی۔ اگر کوئی abnormality ہوتی تو اس کا علاج کیا جاتا۔ دن میں تین بار صفائی والا عملہ آتا جو واش روم اور کمرے کی صفائی کرتا۔ بستر کی چادر روزانہ تبدیل کی جاتی۔ دوپہر کو نرسیں دوبارہ معمول کی چیکنگ کرتیں۔ رات کو یہی exercise دوبارہ سے کی جاتی۔ صبح اور شام کا سٹاف الگ الگ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحبان بھی چیکنگ کے لیے تشریف لاتے۔

ایک ڈاکٹر صاحب جو chest specialist تھے پہلی بار میرے کمرے میں رات 10 بجے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرے بتانے پر دیگر سوالات کیے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مخاطب تو مجھ سے ہیں مگر دیکھ دوسری طرف رہے ہیں۔ یہ عمل وہ کافی دیر سے کر رہے تھے۔ آخر میں نے جواب دینے بند کر دیئے اور خاموشی اختیار کر لی۔ جب انہوں نے جواب نہ ملنے پر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟ وہ بولے جی ہاں! میں نے کہا کہ آپ دیکھ کسی اور طرف رہے ہیں، اس طرح تو میری ego متاثر ہوتی ہے۔ بے شک میں آپ کا مریض ہوں مگر زندگی موت تو صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس طرح ignore ہو کر میں وقت سے پہلے روحانی طور پر نہیں مرنا چاہتا۔ اس کے بعد وہ کافی محتاط رہے اور بڑی توجہ سے دوسرے ڈاکٹر صاحبان کے ساتھ میرے علاج میں شریک رہے۔ میں اُن کا اور دیگر ڈاکٹر صاحبان کا، تمام نرسوں اور صفائی والے عملے کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ جزاک اللہ الخیر!

ایک روز یہی ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ میں اور میرا سٹاف جان ہتھیلی پر رکھ کر بے خوف ہو کر مریضوں کے درمیان گھوم پھر کر ان کا علاج کر رہے ہیں۔ باقی لوگ نیچے کمروں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔ جس پر وہ شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔

کرونا سپیشل یونٹ میں پہلے دن جب میں نے نرسنگ سٹاف کو ہر مریض پر خصوصی توجہ دیتے دیکھا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ بھی تو انسان ہیں اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مریضوں کی جان بچانے میں مصروف ہیں۔ایک دن طبعیت کافی خراب ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے صفائی والے لڑکے سے کہا کہ ڈاکٹر یا نرس جو بھی ملے جلدی سے بلا لاؤ۔ راہ داری سے تین نرسیں گزر رہی تھیں وہ کمرے میں آ گئیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ وہ پوری تندہی سے میرے علاج میں مصروف رہیں۔ آخر طبعیت کچھ سنبھل گئی۔ ایک نرس نے پوچھا انکل اب کیسا محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے کہا بہتر ہوں، اب سانس ٹھیک آ رہا ہے۔ وہ بولی کیا اب ہم جا سکتی ہیں؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو گھر کا سُکھ عطا فرمائے۔ میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔ آپ سب کا بہت شکریہ۔ جزاک اللہ الخیر!

ایک نرس بولی انکل آپ نے ہمیں ایسی دُعا دی ہے جو پہلے کبھی کسی نے نہیں دی۔ گھر کا سُکھ تو کسی خوش قسمت کے پاس ہی ہوگا، کم از کم ہمارے پاس نہیں ہے۔ایک بزرگ مریض نے یہ انمول دعا ہمیں دی ہے، انشاءاللہ ضرور اللہ تعالیٰ منظور فرمائیں گے۔ سب نے بے ساختہ آمین کہا۔ سب نرسیں چلی گئیں۔ اس کے بعد جو بھی میرے کمرے میں ڈیوٹی انجام دینے آتی وہ یہ دعا مجھ سے ضرور کرواتی۔ میری اس دعا کی وجہ سے میرے عزت واحترام میں اضافہ ہوا اور ہسپتال سے ڈسچارج ہونے تک میں ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ ہسپتال میں قیام کے دوران ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جسے لکھنے پر دل آمادہ تو نہیں مگر بطور لکھاری میں تمام واقعات لکھ دیتا ہوں چاہے وہ میرے خلاف ہوں یا زمانہ مجھے روکے۔ ایک دن دوپہر دو بجے کے قریب ایک نرس میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

جبکہ دوپہر والی نرسیں میری دیکھ بھال کر کے جا چکی تھیں۔ اس نرس نے بھی کرونا سے بچاؤ والا یونیفارم پہنا ہوا تھا جیسا باقی ڈاکٹرز اور نرسیں پہنتی ہیں۔ آتے ہی اس نے میری نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے میں سمجھا کہ یہ کوئی لیڈی ڈاکٹر ہے کیونکہ نرسیں تین تین کے گروپ میں آتی تھیں۔ اور اتنے دن ہسپتال میں رہتے ہوئے سب سے شناسائی ہو گئی تھی۔ البتہ لیڈی ڈاکٹر اکیلی آتی تھی۔ جب کافی دیر تک اس نے میری نبض سے ہاتھ نہ اٹھایا تو میں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا بیٹا آپ رو کیوں رہی ہیں۔ وہ بولی اللہ کرے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ ساتھ ہی اس کے صبر کا دامن چھوٹ کر اس کی آنکھوں سے بہنا

شروع ہو گیا۔ میں نے غصے سے کانپتی آواز میں پوچھا کہ تم کون ہو؟ وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں حیران پریشان بیٹھا رہا۔ ابھی میں سوچوں میں گم تھا کہ میرے cell phone کی گھنٹی بجی۔ کسی unknown نمبر سے کال تھی۔ میں نے فون اٹھایا اور پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ جواب ملا ابھی آپ کے کمرے سے گئی ہوں۔ آپ کی بیٹی ہوں۔ میں نے پوچھا کون سی بیٹی؟ وہ بولی اگر بتا دیا تو آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔ میں نے غصے سے کہا What non-sense? میرا بلڈ پریشر اتنا بھی بے قابو نہیں ہے۔ اُس نے کہا میں آیوشہ ہوں۔ میرا ہاتھ بجلی کی تیزی سے حرکت میں آیا اور فون بند ہو گیا۔ اس کے بعد Whatsapp پر صرف ایک لفظ لکھا آیا Daddy Jan۔ میں نے فوراً وہ نمبر block کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ اُس کو میرا فون نمبر کس نے دیا اور بطورِ مریض میری نشان دہی کس نے کی۔

ختم ہوا تجھے پانے کا جنون
انا للہ و انا الیہ راجعون

(محسوسیات)

صفحۂ قرطاس پر سچی کہانی چاہیئے
اے قلم تیرا جگر تیری جوانی چاہیئے

لیکن اس کی یہ بات سچ نکلی کہ میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔ ڈاکٹر مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کرنے کا سوچ رہے تھے لیکن پھر اگلے 3/4 دن انھوں نے مجھے ڈسچارج کرنے کا نام تک نہ لیا۔ وہ حیران تھے کہ مریض کو یکدم کیا ہوا اور وہ reverse کیوں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر رحم و کرم فرمایا اور میں دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنا شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے دل و دماغ سے اس واقعے کو نکال دیا اور کسی سے بھی ذکر تک نہ کیا۔

چاٹ جاتے ہیں زندگی ساری
کچھ لوگ بڑے باکمال ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مجھے شفا عطا فرمائی۔ جس میں میری اہلیہ محترمہ اور میرے تمام بچوں کی دعائیں شاملِ حال تھیں۔ میری ہمشیرگان، بھانجے، بھانجیاں، بھتیجے، بھتیجیاں اور میرے تمام دوست احباب سب کی بے لوث دعائیں میری صحت کی بحالی کی وجہ بنیں اور آخر کار مجھے ہسپتال سے

ڈسچارج کر دیا گیا۔ جب میں نے بذریعہ Whatsapp اپنے دوست ڈاکٹرز کو اطلاع دی کہ Discharged from hospital and going home تو تمام دوستوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور لکھا کہ اس سے زیادہ اچھی خبر ہم نے پہلے کبھی نہیں سُنی ۔ایک ڈاکٹر صاحب کا جواب آیا کہ What a news!۔

میرے بیٹوں بلا صاحب، سونو صاحب، علی صاحب نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میرے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک انسان کے بس میں ہوسکتا ہے۔ یہ معصوم بچے میرے پاس کرونا یونٹ میں بلا خوف وخطر آتے تھے۔ میرا بیٹا نوید کاشف جو دوبئی میں ہوتا ہے، اس نے میری بیماری کا تمام خرچ برداشت کیا۔ ویسے بھی وہ مجھے سالانہ لاکھوں روپے بھیجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے تمام بچوں کا حامی و ناصر ہو۔ آمین!

گھر واپس آ کر 15 دن کی Isolation میں ہوں۔ اپنی اہلیہ اور بچوں کے چہرے پر رونق دیکھتا ہوں تو سکون محسوس کرتا ہوں۔ میرے بچے نوید، عالیہ اور نوشی جو پردیس میں میرے لیے تڑپ رہے تھے اب پرسکون ہیں۔ بڑی بیٹی آنسہ گذشتہ روز مجھ سے ملنے آئی تو گلے لگ کر بہت روئی۔ چھوٹی بیٹی صائمہ کی پریشانی بھی ختم ہوئی۔ غرض یہ کہ سب بچے پرسکون ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو اور پوری دنیا سے اس موذی مرض کا خاتمہ ہو۔ آمین یارب العالمین!

تیرھواں باب

میرے اعزازات

(فیصلہ قارئین کرام خود کریں)

اعزاز۔ا

جسٹس محمد شریف چوہدری مرحوم

ٹرسٹ کالونی سے اپنی سیٹلائٹ ٹاؤن کی رہائش گاہ منتقل ہوتے ہوئے میرے دل میں ہمسائیوں کے بارمیں کچھ خدشات تھے کہ نہ جانے نئے ہمسائے کیسے ہوں گے۔ان کی تہذیب کیسی ہوگی؟ کیونکہ میرے سارے بچے سکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔سیٹلائٹ ٹاؤن میں میرے گھر کے بائیں طرف عترت بخاری مرحوم کا گھر تھا جوایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بائیں طرف غلام سرور بٹ مرحوم کا گھر تھا۔موصوف لوکل گورنمنٹ میں آفیسر تھے۔اُن کے ساتھ پروفیسر غفراللہ خان مرحوم کا گھر تھاجو ریٹائرڈ زندگی گذاررہے تھے۔گھر کے عین سامنے پارک تھا۔میرے گھر کی پچھلی دیوار جسٹس محمد شریف چوہدری مرحوم کے گھر کی پچھلی دیوار سے متصل تھی۔یہ ہماری مشترکہ دیوارتھی۔جب ہم لوگ مکمل طور پر نئے گھر میں شفٹ ہو گئے تو ہمسایہ خواتین کا گھر میں آنا جانا شروع ہوگیا۔تمام ہمسائے بے حد اچھے،معزز، پڑھے لکھے اور محبت والے لوگ تھے۔ہمیں ایسا لگا جیسے ہم اپنے بہن بھائیوں میں آ گئے ہوں۔ ہمارے درمیان عزت واحترام کا رشتہ قائم ہوگیا جو آج بھی قائم ہے۔

ابھی ہمیں نئے گھر میں شفٹ ہوئے دس دن ہی ہوئے تھے کہ ایک باوردی کانسٹیبل ہاتھ میں گن پکڑے آ گیا۔میں اس وقت اپنے گھر کی باہر والی دیوار سے ملحقہ کیاری میں گلاب کے پودے لگوا رہا تھا۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ وہ جسٹس صاحب کا گن مین ہے اور جسٹس صاحب نے اسے بھیجا تھا کہ پتہ کر کے آؤ کون ہمسائے آئے ہیں۔میں نے کاغذ پر اپنا نام اور دیگر کوائف لکھ کر دیئے اور کانسٹیبل کو روانہ کیا۔ایک ہفتے بعد ہی وہ کانسٹیبل پھر آ گیا۔اس بار جسٹس صاحب کا پیغام لایا تھا۔

میرے گھر میں اندر کی طرف دوعدد شیشم کے درخت تھے جن کے پتے جسٹس صاحب کے صحن میں گرتے تھے۔ پیغام یہ تھا کہ درختوں کی تراش خراش کروائیں تا کہ انہیں بار بار صفائی نہ کروانی پڑے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ مجھے جسٹس صاحب کا نمبر لا دو میں خود بات کروں گا۔کچھ ہی دیر بعد وہ ایک کاغذ پر نمبر لکھوا کر لے آیا۔میں نے اسی وقت جسٹس صاحب کو فون کیا۔حال احوال دریافت کرنے کے بعد میں نے اُن سے request کی کہ آرمڈ اور باوردی کانسٹیبل میرے گھر پر نہ بھیجا کریں مجھے اچھا نہیں لگتا۔

میرے ہمسائے میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ میرا فون نمبر نوٹ فرما لیں، جب بھی ضرورت محسوس کریں مجھے فون کر لیا کریں۔ وہ بخوشی رضامند ہو گئے۔ میں نے انہیں مزید بتایا کہ جیسے ہی مالی لکڑی کاٹنے والے مزدور کو لائے گا سب سے پہلے آپ کی تکلیف کا ازالہ کیا جائے گا۔ کچھ دن بعد مزدور آ گئے۔ میں نے انہیں دونوں شیشم کے درخت بہت احتیاط سے زمین سے نکالنے کے لیے ہدایات دیں تاکہ دیوار کو نقصان نہ پہنچے۔ انہوں نے احتیاط سے سارا کام کیا اور وہاں کی مکمل صفائی کر دی۔ دوسرے روز جسٹس صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو صرف شاخ تراشی کا کہا تھا آپ نے تو درخت جڑ سے ہی نکال دیے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ جو چیز میرے ہمسائے کو تکلیف دے وہ میں کیسے رکھ سکتا ہوں۔ جتنے دن بھی آپ کو ان درختوں کی وجہ سے زحمت اٹھانی پڑی اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔ وہ بولے آپ ایک شریف النفس اور straight forward انسان ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے ہمسائے ہیں۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ ایک روز میرے دونوں بیٹے علی ضیاء کاشف اور علی دانیال آصف ٹینس بال سے کرکٹ کھیل رہے تھے کہ گیند جسٹس صاحب کے گھر جا گری۔ میرا بیٹا علی دانیال بعمر ے سال سیڑھی پر چڑھا اور پکارا کہ ادھر کوئی ہے؟ اس وقت جسٹس صاحب کی اہلیہ محترمہ وہیل چیئر پر صحن میں موجود تھیں۔ وہ ایک بے حد نفیس اور بچوں سے پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ وہیل چیئر پر ہونے کے باوجود انہوں نے گیند اٹھا کر ہمارے گھر پھینک دی۔ میں دونوں بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا تھا کہ احتیاط سے کھیلا کریں، آنٹی وہیل چیئر پر ہیں انہیں بار بار تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ مگر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ عرصہ نو سال تک چلتا رہا۔ ہمارے اُس گھر میں قیام کا تمام عرصہ یہ نیک بخت خاتون اپنی معذوری کے باوجود دونوں بچوں سے اظہارِ محبت کرتی رہیں۔ صبر، برداشت اور ہمسایوں کے حقوق پر عمل پیرا رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔۔ میں جسٹس صاحب اور اس نیک دل خاتون کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں۔

ایک دن حسبِ معمول گیند پھر چلی گئی۔ علی نے آواز دی کہ آنٹی جی میری گیند پھینک دیں مگر جواب ندارد۔ بچے آوازوں پر آوازیں دیے جا رہے تھے کہ ایک بھاری بھرکم آواز آئی علی آج تمھاری آنٹی نہیں ہے البتہ آنٹا بیٹھا ہوا ہے۔ علی نے اپنی سادگی میں کہہ دیا کہ انکل پھر آپ ہی پھینک دیں۔ جسٹس صاحب غالباً دھوپ میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ آہستہ سے بڑبڑائے اچھا یار میں ہی پھینک دیتا ہوں۔

اور انہوں نے گیند اٹھا کر پھینک دی۔ روزانہ گیند کے بہانے مختصر گفت وشنید کی وجہ سے وہ علی سے پیار کرنے لگے۔ ہر عید پر علی کو خاص طور پر بلوا کر اس سے ملتے اور عیدی دیتے۔ کبھی کبھار مجھے چائے کی دعوت دیتے اور خوب گپ شپ بھی لگاتے۔ میں ان دنوں بسلسلہ روزگار افریقہ زیادہ جایا کرتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں فون کر کے بچوں کی خیریت بھی دریافت فرماتے تھے۔ میں جب بھی کسی تقریب میں اُن کو دعوت دیتا تو بہ نفسِ نفیس تشریف لاتے۔

پروفیسر علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم سے میرے تعلقات باپ بیٹے والے تھے۔ میری اہلیہ محترمہ کو پروفیسر صاحب نے بیٹی بنایا ہوا تھا۔ صادق پبلک سکول سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ بہاولپور سے چلے گئے تھے۔ جب کبھی وہ پنشن لینے بہاولپور آتے تو میرے پاس ہی قیام فرماتے۔ جسٹس صاحب علامہ صاحب کے بہت معتقد تھے اور اُن سے دیرینہ تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے یہاں شفٹ ہونے کے بعد جب علامہ صاحب پہلی بار اس گھر میں ہمارے پاس تشریف لائے تو حسبِ معمول وہ جسٹس صاحب سے ملنے ان کے دولت کدے پر تشریف لے گئے۔ باتوں باتوں میں جسٹس صاحب نے اپنے نئے ہمسائے یعنی میرا ذکر کیا تو علامہ صاحب اچھل پڑے اور بولے کہ اجی! وہ تو میرا داماد ہے اور میں اسی کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ مجھے فوراً بذریعہ فون بلوا لیا گیا اور میں بھی اس ادبی گفت وشنید میں شامل ہو گیا۔ دراصل جسٹس صاحب اقبالیات پر علامہ صاحب سے لیکچر لیا کرتے تھے۔ بس پھر جب بھی علامہ صاحب تشریف لاتے ادبی محفل ضرور سجتی۔ اس طرح ایک عزت واحترام کا رشتہ قائم ہو گیا۔

جسٹس صاحب جس قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے انہیں ہی فوقیت دیتے اور دوسری قوموں سے افضل خیال کرتے۔ اپنی قوم اور خاندان کے لوگوں کو انہوں نے اس طرح سے نوازا کہ آج وہ لوگ ارب پتی ہیں۔ خود انہوں نے سادہ زندگی گزاری۔ عام زندگی میں بول چال کے دوران تم اور تُو کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے جو ان کی قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ عام زندگی میں جسٹس صاحب بااصول اور ایماندار، سادہ طبیعت، سپورٹس مین اور سخت گیر مشہور تھے۔ وہ خود بتایا کرتے تھے کہ وہ کبڈی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور یہ بھی کہ ابھی LLB کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا اور ان کو سول جج بھرتی کر لیا گیا تھا۔ کبڈی چھوڑ کر وہ ٹینس کھیلنے لگے تھے جو وہ آخری عمر تک کھیلتے رہے۔ وہ چولستان کلب بہاولپور کے Pattern-in-chief تھے۔ کلب کے ساتھیوں میں چند سول ججز، سبحانی صاحب اور ایک بینک افسر رانا جاوید صاحب شامل تھے۔

جسٹس صاحب کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار تمام سول ججز اُن کے گھر پر اُن سے ملنا چاہتے تھے۔ میری معرفت انہوں نے رات ۹ بجے کا ٹائم بھی مقرر کیا لیکن تمام لوگ 9:15 پر پہنچے تو انہوں نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ وہ Late comers سے نہیں ملنا چاہتے۔ حالانکہ تمام لوگ ان کے کلب کے ساتھی بھی تھے۔

ایک بار جسٹس صاحب ٹینس گراؤنڈ میں داخل ہوئے تو سب لوگ مؤدب انداز میں اٹھ کر اُن سے ملے لیکن ایک سیشن جج صاحب جو ٹینس کا سیٹ لگا کر آئے تھے اور تولیے سے اپنا چہرہ صاف کر رہے تھے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جسٹس صاحب اس وقت خاموش مگر کھنچے کھنچے رہے۔ دوسرے روز ہائی کورٹ سے سیشن جج موصوف کو Contempt of court کا نوٹس آ گیا۔ سب لوگ حیران بھی ہوئے اور محتاط بھی ہو گئے۔ کھیل کے دوران اگر جسٹس صاحب اچھی شاٹ لگاتے تو well shot کا شور مچانا ضروری تھا اور اگر Loose shot لگاتے تو ہوٹنگ منع تھی۔ ایک وکیل صاحب تھانہ مسافر خانہ کے علاقے سے کلب میں کھیلنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز جسٹس صاحب کا بیٹا وکیل صاحب کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ گینداس کے کان کے پاس سے شائیں کر کے گزر گئی۔ جسٹس صاحب نے مجھے کہا کہ اس مسافر خانے سے کہو سوچ سمجھ کر شاٹ لگائے، بچے کو چوٹ لگ سکتی تھی۔ مجھے بھی کلب کا ممبر انہوں نے ہی بنایا تھا۔ جسٹس صاحب گراؤنڈ میں بھی پروٹوکول کا خیال رکھتے تھے۔ ایک روز DIG صاحب ٹینس کھیلنے کلب تشریف لائے۔ اسی وقت رانا جاوید صاحب بھی تشریف لائے اور جسٹس صاحب سے ہاتھ ملانے کی غرض سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا مگر جسٹس صاحب نے اُن کا ہاتھ جھٹک کر پہلے DIG صاحب سے ہاتھ ملایا حالانکہ رانا صاحب DIG سے پہلے ہاتھ آگے بڑھا چکے تھے۔

ہم جمعہ نماز بھی اکٹھے ایک ہی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ ایک روز مسجد کے دروازے پر انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور اپنی گاڑی کی طرف چلتے چلتے بولے کہ کل عید تھی تم ملنے نہیں آئے۔ لہجہ کچھ سخت تھا یا مجھے محسوس ہوا۔ میں نے کہا کہ سر میں عید ملنے کہیں بھی نہیں جاتا۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر تم سارا دن کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا لوگ عید ملنے آتے ہیں۔ وہ لاجواب ہو گئے اور علامہ صاحب سے شکوہ کیا کہ ادریس نے مجھے لاجواب کر دیا۔ ایک روز مجھے کہنے لگے کہ چلو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو کلب چلتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سر آپ چلیں میں اپنی گاڑی میں آتا ہوں۔ کہنے لگے کہ کِٹ پہن کر آنا اور چشتی سپورٹس سے ریکٹ

وغیرہ بھی لے آنا۔ جب میں کلب پہنچا تو انہوں نے رانا جاوید صاحب سے کہا کہ اس سے فارم پُر کروالو اور دس ہزار روپے Lump-sum کلب انٹری فیس بھی لے لو تا کہ اس کی لائف ٹائم ممبر شپ ہو جائے۔ مجھے کہنے لگے کہ اس وقت شاید دس ہزار روپے کی رقم تمہیں زیادہ لگے گی لیکن تمام زندگی مزید کوئی فیس نہیں دینی پڑے گی۔ میں نے جواباً صرف اتنا کہا کہ سر جیسے آپ کا حکم۔ اس طرح اُن کی recommendation سے مجھے لائف ممبر شپ مل گئی۔

اسلامیہ یونیورسٹی میں London Institute of Applied Research کی طرف سے Honourary Ph.D. Degrees عطا کرنے کی تقریب میں وہ بطور Chief guest تشریف لائے اور بہت متانت سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ایک روز بذریعہ فون انہوں نے مجھے طلب فرمایا۔ پر تکلف چائے پلائی۔ دورانِ گفتگو فرمانے لگے کہ یہ میرا CV ہے اور لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے میں نے تمام عمر گنوائی ہے۔ آپ

Prof Dr. Inden Boch of London Institute of Applied Research, Amsterdam Campus, Holland

کی توجہ میری سروسز کی طرف مبذول کروائیں اور انہیں بتائیں کہ Honourary Doctorate Degree کے لیے میں بہت Deserving امیدوار ہوں۔ میں نے کہا سر آپ فکر نہ کریں۔ دو روز بعد میری South Africa کے لیے فلائیٹ ہے۔ میں وہاں Director General of Africa کو آپ کے credentials پیش کروں گا تا کہ وہ اپنی Recommendation کے ساتھ آپ کے کاغذات ہالینڈ بجھوائیں۔ وہ خوش ہو گئے اور مجھے بہت عزت و احترام سے باہر میری گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ ۳ ماہ اور ۸ روز کے بعد انہیں Institute کی طرف سے ڈگری موصول ہو گئی جس کے لیے وہ ہمیشہ میرے ممنون رہے۔

وقت بہت تیزی سے گذر گیا۔ آخر ۹ سال بعد ۲۰۰۰ء میں سیٹلائٹ ٹاؤن سے اپنے نئے تعمیر شدہ گھر میں منتقل ہو گیا۔ دورانِ منتقلی جو کئی روز پر مشتمل تھی بہ وجہ مصروفیت جسٹس صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جب میں کار میں بیٹھا اپنے پرانے مسکن کو آخری بار نظر بھر کر دیکھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ جسٹس صاحب پیدل ہی بمعہ اپنے گن مین تشریف لا رہے ہیں۔ میں جلدی سے کار سے باہر نکل آیا۔ وہ بہت محبت سے گلے ملے اور

بولے کہ کیا تمھارا یہاں سے جانا ضروری ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اپنے نئے تعمیر شدہ گھر میں منتقل ہو رہا ہوں۔ وہاں مجھے آپ جیسے نیک اور مہربان ہمسائے شاید میسر نہ ہوں لیکن آپ کی اور دیگر ہمسایوں کی یادیں مجھے مرتے دم تک نہیں بھولیں گی۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی باہیں دراز کیں اور بہت گرمجوشی سے مجھے گلے لگا لیا اور بولے: ''ادریس! آج میں ایک بہترین ہمسائے سے محروم ہو گیا ہوں''۔ کچھ آبدیدہ بھی ہو گئے۔

آج وہ ہم میں نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ان کی مغفرت کے لیے دعا گو رہتا ہوں۔ ان کے الفاظ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے دیگر مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔۔۔ آمین ثم آمین!

اعزاز۔II

محمد شریف جنجوعہ (R) ایڈیشنل سیشن جج

چولستان کلب میں اپنے دیگر دوستوں سے گپ شپ کے دوران سنا تھا کہ ایک نئے سول جج ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں جن کا نام محمد شریف جنجوعہ ہے اور یہ کہ وہ پہلے کسٹم میں تھے، پھر PCS Judiciary کرنے کے بعد عدلیہ میں آ گئے۔ ابھی ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن ٹینس گراؤنڈ کے کنارے کنارے شلوار قمیض میں ملبوس ایک شخص جوگرز پہنے تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ دیگر سول جج صاحبان نے بتایا کہ یہی محمد شریف جنجوعہ ہیں۔

جنجوعہ صاحب نے جب اپنے ساتھی سول ججز کو ٹینس کھیلتے اور کرسیوں پر مؤدب بیٹھے دیکھا تو تیز تیز قدم اٹھاتے وہ ہماری طرف تشریف لے آئے۔ کیونکہ وہ ٹینس کورٹ کے درمیان سے گزر کر آ رہے تھے اس لیے جسٹس شریف صاحب انہیں گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں تیزی سے اٹھا، ان سے ہاتھ ملایا اور ان کا ہاتھ پکڑے ہر اخلاقی پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھتے انہیں ٹینس کورٹ سے باہر لے آیا۔ انہیں بتایا کہ جسٹس محمد شریف چوہدری صاحب اس وقت شاٹ لگا رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو گیند لگ جائے۔ اس لئے میں آپ کو ٹینس کورٹ سے باہر لے آیا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ کھیلنے والے چار لوگوں میں سے جسٹس صاحب کونسے ہیں؟ میں نے مڑ کر دیکھا تو ٹینس کے اس سیٹ کا فیصلہ ہو چکا تھا اور کھلاڑی

کورٹ سے باہر آ رہے تھے۔سب سے آگے جسٹس صاحب تھے۔ میں نے جنجوعہ صاحب سے کہا کہ سب سے آگے،سب سے لمبے،سفید نیکر اور سپورٹس شرٹ میں ملبوس جسٹس شریف صاحب ہیں۔اس کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا تعارف کروایا اور کرسیوں کی طرف چلے گئے۔اس دوران جسٹس صاحب کرسی پر تشریف فرما ہو چکے تھے اور تولیے سے اپنا پسینہ خشک کر رہے تھے۔ میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا جو جسٹس صاحب کے برابر والی تھی۔اس دوران کرسی کی پشت کی طرف سے مجھے ایک آواز آئی ''سر! محمد شریف جنجوعہ سول جج بہاولپور''۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو جنجوعہ صاحب نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے جسٹس شریف صاحب کی طرف بڑھایا ہوا تھا جبکہ جسٹس صاحب مخالف سمت دیکھ رہے تھے۔جنجوعہ صاحب نے اپنے الفاظ دوبارہ دہرائے مگر جسٹس صاحب نے نوٹس نہ لیا۔ میں نے جسٹس صاحب کا ہاتھ پکڑا اور جنجوعہ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا کہ سر کافی دیر سے جنجوعہ صاحب کا ہاتھ ہوا میں معلق ہے اور وہ آپ کو سلام کر رہے ہیں۔جسٹس صاحب ایک دم چونک پڑے اور بولے بھئی وعلیکم السلام اور ساتھ ہی ان کو ہدایت بھی جاری کر دی کہ ٹینس کورٹ کے اندر سے نہیں گذرتے اور کچھ پروفیشنل سوالوں کے بعد پانی پینے لگے۔ میں نے اٹھ کر جنجوعہ صاحب کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ وہ اپنے ساتھی ججوں کے ساتھ بیٹھ گئے اور مغرب تک ہمارے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ جب جسٹس صاحب روانہ ہو گئے تو مرحوم اطہر گردیزی سول جج اور عبدالنور ناصر سول جج نے جسٹس صاحب کے عادات واطوار پر بھرپور روشنی ڈالی اور جنجوعہ صاحب کو مکمل طور پر ان کا مزاج آشنا بنا دیا۔جنجوعہ صاحب کو کہا کہ اللہ کا شکر کرو کہ آج کا دن خیریت سے گزر گیا اور اس نے تمام ماحول کو سنبھال لیا۔courtesy to Idrees ان دوستوں نے جنجوعہ صاحب سے میرا تفصیلی تعارف کروایا اور بولے کہ ادریس ہمارا یارِ غار ہے۔جنجوعہ صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ آج سے میرے بھی ہیں۔اس طرح پیار محبت کا رشتہ اور مضبوط ہوتا گیا۔

سیٹلائیٹ ٹاؤن میں میرے قیام کے دوران وہ اکثر تشریف لاتے۔شوق سے کافی نوش فرماتے۔ طبیعت بے حد سادہ تھی۔اپنے پروفیشن میں ماہر تھے۔اسلامی تشخص اور اسلامی روایات پر عمل کرنے کے باوجود بہت زندہ دل انسان تھے۔ہنسی مذاق میں ہمارا بھرپور ساتھ دیتے۔کتاب بینی میں بھی میرے ہم پلہ تھے۔اکثر ہمارے درمیان بحث مباحثہ بھی ہو جاتا۔ بہت مدلل جواب دیتے۔ ہمیشہ کتابوں کے ریفرنس سے بات کرتے۔تھوڑے کنجوس لیکن خوش خوراک تھے۔اکثر دوستوں کا فون آ جاتا کہ ہم سب لوگ تمھاری

طرف آ رہے ہیں۔ ٹھنڈا بھی پئیں گے، کھانا، چائے سب کھائیں پئیں گے اور پھر لانگ ڈرائیو پر جائیں گے۔ اس کے بعد جنجوعہ صاحب کا فون آتا کہ تمھیں اطلاع تو مل گئی ہوگی کہ سب مل کر تمھاری طرف آ رہے ہیں اور تمھیں یہ بھی علم ہے کہ میں بلند فشارِ خون کا مریض ہوں اس لیے میرے لیے لوکی کی بھجیا بنوا لینا۔ میں ہنستا رہتا اور ہاں ہوں کرتا رہتا۔ جب سب لوگ میرے سٹنگ روم میں تشریف فرما ہوتے تو خوب محفل جمتی۔ جنجوعہ صاحب کی طرف ہی سب دوست ماہر تیراندازوں کی طرح اپنے طنزیہ فقروں کی یلغار کرتے اور وہ بہت خوش مزاجی سے سب کے ساتھ پورے اترتے جو کہ ان ہی کا خاصہ تھا۔ اس طرح تعلقات مزید مضبوط ہوتے چلے گئے۔ میرے ساتھ وہ اکثر علمی و ادبی گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ میں اس وقت تو ان کے خیالات نہ محسوس کر سکا مگر آج وہ ہم میں نہیں تو میرا احساس شدت اختیار کر گیا ہے کہ وہ مجھے کتنا جانتے تھے۔ ایک روز وہ کچھ اُداس سے تشریف لائے اور بولے بھائی صاحب میری ترقی ہوگئی ہے اور میں سینئر سول جج بن گیا ہوں لیکن میرا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں physically آپ سے دور ہو جاؤں گا لیکن یقین جانیں آپ ہر وقت میرے ساتھ ساتھ ہوں گے۔ میں نے انہیں Dine out کرنے کے لیے ایک دعوت دے ڈالی جس میں تمام دوستوں کو مدعو کیا۔ یہ ایک خوبصورت محفل تھی۔ اس کے بعد جنجوعہ صاحب نئی پوسٹنگ والی جگہ پر چلے گئے اور اپنی خوبصورت یادیں چھوڑ گئے۔ وہ جب بھی بہاولپور تشریف لاتے میرے پاس ہی قیام فرماتے۔ اس طرح ان کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا رہا اور وہ مزید ترقی کرتے ایڈیشنل سیشن جج ہو گئے۔ آخر کار ایک دن تشریف لائے اور بولے کہ بھائی صاحب اب میں ریٹائرڈ ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک مکان بہاولپور میں تعمیر کروا لیا ہے۔ میں اور میرا بیٹا اب بہاولپور میں ہی لاء پریکٹس کریں گے اور مجھے خوشی ہے کہ اب آپ سے خوب چھنے گی۔ میں بھی خوش ہوا اور انہیں باعزت ریٹائرڈ ہونے کی مبارک دی اور ان کی لاء پریکٹس کامیاب کروانے میں ان کی مدد کا وعدہ بھی کیا۔

دن گزرتے گئے۔ ایک روز پتہ چلا کہ جنجوعہ صاحب بہت بیمار ہیں۔ میں بیمارپُرسی کے لیے اُن کے دولت کدہ پر گیا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بہت لاغر نظر آ رہے تھے اور پریشان بھی تھے، میں انہیں طفل تسلیاں دیتا رہا مگر خود بھی اندر سے پریشان تھا۔ میں نے اپنا معمول بنا لیا اور اکثر ان کی عیادت کرنے چلا جاتا۔ ایک روز انہوں نے فون کر کے مجھے بلایا۔ یہ ایک گرم ترین دوپہر تھی۔ میں بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچا تو وہ فرمانے لگے کہ آپ سے مل کر مجھے بہت تسکین ملتی ہے۔ اس لئے بے تکلفی میں آپ کو فون کر دیا۔

میں نے کہا کہ یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ وہ تشکر آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ اس روز انہوں نے زمانے کا شکوہ کچھ اس انداز سے کیا کہ اپنے پرائے سب کی کوتاہ اندیشی بیان کر دیں۔ زمانے کی بے وفائی اور بے حسی پر انہیں بے حد ملال تھا۔ آخر نمازِ عصر کے بعد میں انہیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے واپس آ گیا کیونکہ اگلے روز عید تھی۔

عید کی نماز ادا کرنے کے بعد میں اپنے بچوں کے پاس بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ میرے فون کی سکرین پر جنجوعہ صاحب کا نمبر روشن ہوا۔ میرے السلام علیکم کہنے پر ان کا منجھلا بیٹا بولا انکل کیا آپ گھر پر ہیں؟ میرے ہاں میں جواب دینے پر بولا کہ ہم آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ، جنجوعہ صاحب اور اس کا کزن آ رہے ہیں۔ میں سمجھا کہ شاید جنجوعہ صاحب عید کی مبارک دینے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ بیٹا آپ کے ابو بیمار ہیں، انہیں کہو کہ تکلیف نہ کریں میں خود آپ کے گھر آ رہا ہوں۔ بیٹا بولا انکل ابو تو فوت ہو چکے ہیں۔ ان کے تکیے کے نیچے سے ایک چٹ ملی ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ ''اگر میں فوت ہو جاؤں تو میرا جنازہ تیار کر کے سب سے پہلے بھائی صاحب کے گھر لے جائیں۔ ان کو میری زیارت کروائیں۔ ان سے میری مغفرت کی دعا کی درخواست کروائیں۔ پھر جہاں مرضی لے جائیں۔''

میری بڑی بیٹی آنسہ بھی سب سُن رہی تھی۔ ہم تمام لوگ گم صم، پریشان تھے کہ کبھی میت بھی کسی کے گھر آئی ہے۔ میت کا احترام سب پر واجب ہوتا ہے۔ جنجوعہ صاحب یہ آپ نے کیا کیا؟ ابھی ہم دکھ کی کیفیت میں ہی تھے کہ گیٹ پر ایمبولینس کا سائرن سن کر گیٹ کی طرف بھاگے۔ جیسے ہی میں نے ایمبولینس کا دروازہ کھولا اور میت کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے جنجوعہ صاحب مجھے ہی دیکھ رہے ہیں۔ دراصل رات کے کسی حصے میں جنجوعہ صاحب انتقال فرما گئے تھے اور گھر والوں کو صبح معلوم ہوا اس لیے اُن کی آنکھیں بند نہ ہو سکیں۔ میری بیٹی آنسہ رونے لگی۔ مجھے بھی اپنے عزیز دوست کی وفات نے غم زدہ کر دیا۔ ان کی وصیت اور خواہش کے مطابق میں نے کانپتے ہاتھوں سے دعائے مغفرت کی۔ بھیگی آنکھوں سے ان کی زیارت کی اور چہرہ ڈھانپ دیا۔ میں بے اختیاری میں ''انا للہ وانا الیہ رجعون'' ہی کہہ سکا اور ان کا جنازہ لے کر ایمبولینس آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ آہ! جنجوعہ صاحب آپ نے اچھا نہیں کیا۔ جاتے جاتے میرے اوپر بہت بڑا احسان کر گئے۔ جنجوعہ صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو غریقِ رحمت فرمائے۔۔۔ آمین!

میرے ایک اور دوست جو کہ ہائی کورٹ کے جج تھے اور بفضلِ تعالیٰ بقید وحیات ہیں۔ میں اکثر اُن کے لیے دعا گو رہتا ہوں۔ ایک بار میں لاہور میں اُن کے گھر قیام پذیر تھا۔ کھانے کی میز پر مجھے کہنے لگے کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تو تم لاہور میرے جنازے میں آنے کی بجائے بہاولپور سے ہی میرے لیے روزانہ صبح کی نماز کے بعد دعائے مغفرت کیا کرنا۔ میں حیرانی سے اُن کی طرف دیکھتا رہ گیا مگر وہ اپنی بات پر مُصر رہے۔ جسٹس صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔۔۔آمین!

میری بیٹی آنسہ کہنے لگی کہ ڈیڈی جان کیا لوگ واقعی آپ کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے یہ سب نہ دیکھتی تو کبھی اس واقعے پر یقین نہ کرتی چاہے دنیا کی کوئی ہستی مجھے یہ سب بتاتی۔ میں نے جواباً اپنی بیٹی سے کہا۔۔۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

میں اپنی ذات میں مگن شخص اس واقعے کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔۔۔شکر الحمدللہ رب العالمین!

لوگ مجھ سے بھی کہہ دیتے ہیں اکثر دعا کے لیے
دیکھو کس قدر خدا نے میرے عیب چھپا رکھے ہیں

اعزاز۔III

خون میں لت پت ایک بے ہوش عورت

گرمیوں کی ایک شام 6 بجے کے قریب مجھے اپنے زیرِ تعمیر گھر سے اپنی رہائش والے گھر جاتے ہوئے ملتان روڈ سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک خاتون خون میں لت پت سڑک کے کنارے پڑی ہے۔ چند دیہاتی لوگ اس کے گرد موجود تھے جبکہ خاتون بے پردہ تھی۔ پہلے تو میں اپنی دُھن میں کافی آگے نکل گیا۔ یکلخت خیال آیا کہ اگر عورت زخمی ہے تو اس کو ڈھانپا کیوں نہیں گیا اور یہ لاوارث ہے کون؟ میں نے فوراً کار بیک گیئر میں ڈالی اور ریورس ہی واپس اسی جگہ پر آ گیا۔ کار سے نیچے اترا اور وہاں موجود لوگوں سے پوچھ پریت کی تو پتہ چلا کہ ایک موٹر سائیکل سوار اس خاتون سمیت بڑی تیزی سے جا رہا تھا کہ اچانک یہ خاتون موٹر سائیکل سے گر گئی۔ موٹر سائیکل سوار کو خبر تک نہ ہوئی۔

میں نے جلدی سے ایک دیہاتی کے کندھے سے اس کی چادر اتاری اور خاتون کو ڈھانپ دیا۔ دیگر لوگوں کی مدد سے اس خاتون کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر میں نے گاڑی وکٹوریہ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرف بہت تیزی سے ڈرائیو کرنی شروع کر دی۔ راستے میں مین سڑک سے گزرتے ہوئے اپنے بھانجوں عطاء الرحمٰن المعروف خان صاحب اور عبدالرحمٰن المعروف راجہ صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پیچھے ایمرجنسی وارڈ آ جائیں۔ ہسپتال پہنچ کر ہم نے بذریعہ سٹریچر اس زخمی خاتون کو ڈاکٹری معائنے والے کمرے میں پہنچایا۔ ڈاکٹر صاحب بھی فوراً آ گئے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے انہیں تمام واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔ اُن دنوں ہسپتال کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ کاٹن تک مریض کے لواحقین سے منگوائی جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ ادویات کون منگوا کر دے گا۔ میں بولا آپ ادویات کی فکر نہ کریں بس جو بھی ممکن ہو علاج شروع کریں۔ انہوں نے ایک نرس کی مدد سے مکمل چیک اپ کیا اور ادویات مع سرجیکل سامان کی لسٹ بنا کر دی۔ میں نے لسٹ پاس کھڑے اپنے بھانجے کو دی۔ وہ موٹر سائیکل پر تیزی سے گیا اور نسخے کے مطابق تمام سامان اور ادویات لے آیا۔ اب باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ ڈرپ لگا دی گئی۔ انجکشن ڈرپ میں ڈالے جا رہے تھے۔ تمام زخموں کی صفائی کی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ادویات کی دوسری لسٹ اور پھر تیسری لسٹ بھی تھما دی گئی۔ میرا بھانجا خان موٹر سائیکل پر جاتا اور جھٹ سے ادویات کا پیکٹ لا کر نرس کو تھما دیتا۔

اس دوران میری نظر کمرے کے کونے میں کھڑے ایک شخص پر پڑی جو دونوں ہاتھ باندھے خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں کھڑا ہے جبکہ یہاں ایک خاتون کا علاج ہو رہا ہے۔ اس نے مجھے جواب دینے کی بجائے آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح کھڑا رہا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اتنے میں خاتون نے نقاہت بھری آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ہم سب نے سننے کی کوشش کی مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص پھر کمرے کے کونے میں اسی حالت میں کھڑا ہے۔ میں نے غصے میں اسے کہا کہ ابھی تو تمہیں باہر نکالا تھا۔ تم بہت بے شرم انسان ہو پھر آ گئے ہو اور اس کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکالنے کی کوشش کی تو وہ شخص بولا کہ سر آپ برا نہ منائیں یہ خاتون میری بیوی ہے اور میرے ہی موٹر سائیکل سے گری ہے۔ آپ اس کا علاج بہت توجہ اور انہماک سے کروا رہے ہیں کہ آپ کو ڈسٹرب کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ میں نے اسے غصے سے کہا کہ تم

بہت بے حس انسان ہو۔ جو کام میں کر رہا تھا وہ تمہیں کرنا چاہئے تھا مگر تم ایک کونے میں کھڑے میرا تماشہ دیکھ رہے ہو۔ اتنے میں خاتون کو ہوش آ چکا تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے بھانجوں سمیت واپس آ گیا۔ وہ شخص بھاگا بھاگا میری کار تک آیا اور مجھے ادویات کا بل دینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ خاتون ہوش میں آ گئی ہے۔ مجھے تمھارے پیسوں کی ضرورت نہیں۔تم اپنی بیوی کا خیال رکھو۔ یہ کہہ کر میں خود وہاں سے رخصت ہو گیا۔

دو سال بعد میری سب سے چھوٹی بیٹی صائمہ کی شادی کے موقع پر یہی خاتون اور اسکا خاوند بارات میں شامل تھے۔ کیونکہ اس کا بھائی اسی ادارے میں کام کرتا تھا جہاں میرا داماد منیجر آپریشن تھا۔ دونوں نے مجھے پہچان لیا۔خاتون نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں سمجھا کسی اور کے مغالطے میں یہ خاتون مجھے لپٹ گئی ہے۔ میں بے سدھ کھڑا خود کو اس کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس دوران میری بڑی بیٹی آنسہ آ گئی۔ غالباً وہ کافی دیر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔اس نے آ کر اس خاتون کو مجھ سے الگ کیا اور اس سے پوچھا کہ یہ صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں؟ وہ خاتون بولی کہ یہ میرے والد ہیں۔آنسہ نے تڑپ کر کہا کہ آپ اِن کی کون سی بیوی کی بیٹی ہیں؟ کیونکہ یہ میرے ڈیڈی جان ہیں اور وہ سامنے میری امی جان تشریف فرما ہیں۔ اب وہ خاتون موقع کی نزاکت سمجھ چکی تھی۔ وہ بولی کہ یہ میرے روحانی باپ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے بعد میری جان اِن کی بخشی ہوئی ہے۔ پھر اس نے آنسہ کو تمام روداد سنائی اور اپنے خاوند اور والدہ سے بھی ملوایا۔

آج مجھے احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں یہ کام کروا کر مجھے اعزاز بخشا ہے۔ میں اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

اعزاز۔IV

ہائے ابا جی!

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں ٹرسٹ کالونی میں رہائش پذیر تھا۔ایک روز میں اپنے گھر کی گیلری میں کھڑا تھا کہ میں نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ میں نے حیرانی سے باہر کے دروازے کی طرف دیکھا تو مہترانی سینہ کوبی کے ساتھ ساتھ دبی دبی آواز میں چیخ چلا رہی تھی۔ میرے غصے سے دیکھنے پر اس نے ہاتھ

سے کچھ اشارے بھی کئے جو میں نہیں سمجھ سکا اور چلتا ہوا مین دروازے سے باہر سڑک پر آ گیا۔ ہمارے گھر کے کونے پر بجلی کا ایک کھمبا تھا جس سے کئی گھروں کو بجلی سپلائی کی جاتی تھی۔ کھمبے کی stay wire پر ایک لڑکی بعمر 14/15 سال کچھ اس طرح لٹکی ہوئی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں آپس میں جکڑے ہوئے تھے۔ جیسے سبجی بنانے والے جانوروں کی ٹانگیں باندھ کر کوئلوں پر لٹکا دیتے ہیں۔ لڑکی کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ ایک لڑکا بعمر 5/6 سال ایک طرف کھڑا رو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کھمبے اور staywire میں کرنٹ آ گیا اور راہ چلتے یہ لڑکی تار کو چھونے کی وجہ سے پھنس گئی ہے۔

میں نے پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو دو لڑکے کھڑے نظر آئے جو آپس میں محوِ گفتگو تھے اور کوئی نوٹس نہیں لے رہے تھے۔ گھر کی گیلری میں لکڑی کی پرانے ماڈل کی کرسی پر ہمارے ایک بزرگ بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے کرسی گھسیٹنے کی کوشش کی تو وہ ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئے۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح لڑکی کو staywire سے نیچے اتار لوں۔ ہاتھ لگا نہیں سکتا تھا ورنہ میں بھی لٹک جاتا۔ میں نے بزرگ کی ناراضی کی پروا کئے بغیر ان کے نیچے سے کرسی گھسیٹی اور کرسی کی اگلی ٹانگیں لڑکی کے بازوؤں میں داخل کر کے کرسی کو twist کیا تو اس کے دونوں بازو کھل گئے اور وہ دھڑام سے نیچے کچی زمین پر آ گری۔ اس طرح اس کا رابطہ کھمبے اور staywire سے کٹ گیا۔ اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ میں نے دیگر لوگوں کے ساتھ لڑکی کو اٹھا کر ایک چارپائی پر لٹایا۔ اتنے میں ایک آٹو رکشہ سڑک سے گزرتے ہوئے نظر آیا۔ میں بھاگ کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ رکشہ روکا اور اس میں بیٹھے صاحب سے درخواست کی کہ اگر اس لڑکی کو ہسپتال نہ پہنچایا تو یہ مر جائے گی۔ آپ کو دوسرا رکشہ مل جائے گا مگر اس کو زندگی نہیں مل سکے گی۔ وہ شریف آدمی فوراً رکشہ چھوڑ کر سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی اچھی خاصی صحتمند تھی۔ میں نے دوسروں کی مدد سے اس کو اٹھا کر رکشے کی سیٹ پر لٹایا، اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور وکٹوریہ ہسپتال کی ایمرجنسی کی طرف بھاگا۔

جاتے ہی ڈاکٹروں نے اس کو طبی امداد دینی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد ہی اس لڑکی کے لواحقین بھی پہنچ گئے۔ ایک قیامت کا سماں تھا۔ ماں بیہوش ہوئے جا رہی تھی۔ باپ، بہن بھائی اور دیگر رشتے دار سب رو پیٹ رہے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ محلے کے کسی گھر میں روزانہ قرآن

پاک پڑھنے جاتی ہے۔ بچوں کو عادت ہوتی ہے کہ راستے میں آنے والی چیزوں مثلاً درخت، کھمبا، کار، موٹر سائیکل وغیرہ کو چھوتے ضرور ہیں۔ اسی طرح کھمبے یا staywire کو چھونے سے یہ لڑکی بیچاری پھنس گئی۔ اس کو کیا پتہ تھا کہ کھمبے کا earth کام نہیں کر رہا اور اس کا conductor کھمبے کو چھو رہا ہے۔ چاہے لوگ جئیں یا مریں، محکمہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ان کو تو اپنی یونین اور پیسے بٹورنے سے ہی فرصت نہیں۔

لڑکی متواتر 5 روز ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی۔ ڈاکٹر جان توڑ کوشش کرتے رہے۔ اس دوران میں اکثر لڑکی کا پتہ کرنے ہسپتال جاتا رہتا۔ آخر معجزہ ہو گیا اور لڑکی کو ہوش آ گیا۔ جب میں ہسپتال گیا تو وہ اپنی والدہ کا ہاتھ پکڑے کراہ رہی تھی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسکی والدہ کے بتانے پر اسے پتہ چلا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے اس کو کھمبے سے اتارا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سلام کیا اور بھیگی آنکھوں سے اظہارِ تشکر کیا۔ میں نے ان قیمتی ترین موتیوں کو زمین پر نہ گرنے دیا جو اس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے اور اپنے ہاتھ کی انگلی سے انہیں صاف کر دیا۔ بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے کہا کہ آپ بھی میری بیٹی ہو۔ شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں بس میرے لیے دعا کیا کرو۔ یہ بچی صحت مند ہو کر اپنے والدین کے ساتھ چلی گئی۔ میں بھی بھول گیا۔

چند سال بعد جب میں ٹرسٹ کالونی سے سیٹلائٹ ٹاؤن اپنی رہائش شفٹ کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ کچھ سجی سجائی کاریں آ کر سڑک پر رکیں۔ جس میں بارات کے ہمراہ دولہا دلہن بھی موجود تھے۔ دلہن جلدی سے کار سے نیچے اتری اور ''ہائے ابا جی'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں حیران پریشان کھڑا رہا اور دلہن مجھ سے لپٹ کر روتی رہی۔ اس کے ماں باپ مجھے کہنے لگے کہ کیا آپ نے ہمیں اور اس دلہن بنی لڑکی کو پہچانا؟ میں نے انکار میں سر ہلایا تو انہوں نے کھمبے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ نے اس دلہن کو اسی کھمبے سے نیچے اتارا تھا۔ آج اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اس نے ضد کی تھی کہ جب تک آپ لوگ مجھے میرے ابا جان سے نہیں ملواتے میں سسرال نہیں جاؤں گی، اس لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔ میں نے بچی کو پیار کیا اور رسم و رواج کے مطابق کچھ نذرانہ بھی پیش کیا۔ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اس کو رخصت کیا۔

جب بارات آہستہ آہستہ روانہ ہو رہی تھی اور لوگ ہاتھ ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے، میں اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عزت اور اس لڑکی کے بچ جانے کی خوشی میں سرشار ایک عجیب سی کیفیت میں تھا۔ روکنے کے

باوجود میری آنکھوں سے برسات برسنے لگی اور وہ بچی میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگئی لیکن میرے دل ودماغ میں آج تک ایک اعزاز کی طرح محفوظ ہے جو اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا ہے۔

اعزاز۔V

۱۹۹۵ء میں میری دختر آنسہ ثمینہ کی شادی پروفیسر ڈاکٹر اصغر ہاشمی کے ساتھ ہونا قرار پائی۔اس شادی میں میرے دوست احباب نے ذوق وشوق سے شرکت فرمائی۔جن میں سے کچھ کی تفصیل کچھ یوں ہے:

کرنل ولائیت حسین اعوان، کمانڈنٹ بھمبور سکاؤٹ، ڈیرہ بگٹی کوئٹہ سے مع فیملی تشریف لائے۔میجر منظور علی عدیم اسلام آباد سے تشریف لائے۔میجر عتیق مقصود عبداللہ لاہور سے تشریف لائے۔مسٹر جسٹس محمد نسیم چوہدری لاہور سے تشریف لائے۔

بہاول پور کے تمام سول ججز، ایڈیشنل سیشن ججز اور دیگر انتظامیہ نے بھی شرکت کی اور میرا دست وبازو بنے رہے۔میری بہت حوصلہ افزائی کی جس کے لیے میں ان دوستوں کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔اِن دوستوں کی وجہ سے نہ صرف شادی کا پنڈال سجا بلکہ جگ مگ کرتا رہا۔

جب بارات آنے کا شور برپا ہوا تو میرے یہ سب دوست بارات کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔میں بھی دولہا کے لیے ہاتھوں میں پھولوں کا ہار لیے آگے بڑھا۔اسی دوران کسی نے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر مجھے پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔میں نے مڑ کر دیکھا تو مسٹر جسٹس محمد نسیم چوہدری مجھے پکڑے کھڑے تھے۔وہ میرے کان میں آہستہ سے بولے۔ادریس! اب یہ میرا بھی داماد ہے۔دولہا کے گلے میں پہلے میں پھولوں کا ہار ڈالوں گا۔میں تشکر بھری نظروں سے انہیں دیکھتا اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔جسٹس صاحب نے ہی دولہا کو سب سے پہلے پھولوں کا ہار پہنایا اور اس کو گلے سے لگایا۔دیگر تمام دوستوں نے بھی بارات کی پذیرائی کی۔اس کے لیے میں اللہ تعالیٰ کے بعد ان کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

نکاح کے وقت نکاح فارم پُر کرتے ہوئے نکاح خواں نے گواہان کے نام پوچھے تو میرے بولنے سے پہلے ہی جسٹس صاحب بول پڑے کہ گواہ کے طور پر میرا نام لکھیں اور جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر نکاح خواں کو دے دیا۔انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا کہ کوئی فکر مت کرو۔تمام مراحل ابھی طے ہو جائیں گے۔میرے دیگر دوستوں نے اپنی نگرانی میں تمام مراحل طے کروا دیئے۔

آج تک میرے کانوں میں جسٹس صاحب کی آواز رس گھولتی ہے کہ ''یہ اب میرا داماد ہے اور نکاح کے گواہ کے طور پر میرا نام لکھو''۔

کبھی کسی Serving Justice کو نکاح کے گواہ کے طور پر میں نے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔

---وَ تُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَن تَشَاءُ-----

چودھواں باب

پرِوازیِ بُغض

(کذابیت پر ایمان رکھنے والے انسان کا رویہ)

اُٹھا کر ایڑیاں چلنے سے قد نہیں بڑھتا
میرے رقیب سے کہہ دو کہ اپنی حد میں رہے

انجینئر راشد اشرف اور زاہد کاظمی دونوں ہی میرے لیے محترم ہیں۔ یہ دونوں حضرات اُردو ادب کے پاسبان اور شیدائی ہیں۔ ان دونوں نے یا دونوں میں سے کسی ایک نے میری تصنیف "فرشتے کی ایف آئی آر" کی ایک کاپی کینیڈا میں مقیم پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی کو بھجوا دی۔ کیونکہ موصوف آپ بیتیوں پر تبصرے فرماتے ہیں۔ ان تجزیوں پر مبنی اُن کی تصنیف پسِ نوشت چہارم میری نظر سے گزری۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ بھی کیا۔ الفاظ کا استعمال عمدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک پروفیسر کے قلم کا شاہکار ہے۔ اپنی اس مایہ ناز اور شاہکار تصنیف میں انہوں نے میری کتاب پر تجزیہ ہی نہیں لکھا بلکہ بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے پروفیسر موصوف اپنی غلط اور مرتدانہ روش کو نہ چھپا سکے۔ جب تجزیہ کتاب کی صورت میں چھپ گیا تو انہیں اس کی ایک complimentary کاپی آگاہی کے طور پر مجھے بھجوانی چاہیے تھی۔ ضابطۂ اخلاق کا یہی تقاضا تھا۔ انہوں نے نہ صرف ایسا نہیں کیا بلکہ انجینئر راشد اشرف کے توسط سے مجھے پیغام بھجوایا کہ آپ کی کتاب پر تجزیہ چھپ چکا ہے اور آپ قیمت ادا کر کے نیاز مانہ پبلی کیشنز سے کتاب منگوا سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کے سینے مذہبی بغض سے سیاہ ہوں اور دنیا بھر میں مرتدانہ تعفن پھیلانے میں مصروف ہوں ان سے ضابطۂ اخلاق کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ البتہ میری کتاب میں دو چار ٹائپ کی غلطیوں اور ایک تاریخی غلطی کی نشان دہی کرنے پر میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اتنی سی بات کا مذاق اڑانے اور اخلاقی حد پار کرنے کو میں مذہبی بُغض ہی کہوں گا۔

پروفیسر موصوف کی تمام لغو باتوں کا جواب میں اس لطیفے کی شکل میں پیش کرتا ہوں کیونکہ اُن کے تجزیے کی مجموعی حیثیت اس لطیفے جیسی ہی ہے۔ ایک اُستاد نے اپنے نوجوان شاگرد کا ایک عشقیہ خط پکڑ لیا۔ اس خط کو ایک بچہ استاد کے گھر اس کی نوجوان بیٹی کو دینے کے لیے لایا تھا۔ استاد نے خط کھولا اور پڑھا۔

دوسرے روز کالج میں اس نوجوان کو طلب کیا اور اس کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ آئندہ تمہارے خط میں ہجے کی غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ میں نے تمام غلطیاں انڈر لائن کر دی ہیں۔

اب قارئین کرام کے لیے ڈاکٹر پرویز پروازی کا تجزیہ پیش کرتا ہوں۔ موصوف پڑھے لکھے قابل آدمی ہیں۔ لکھنے پر دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں میری تحریر کسی شمار میں نہیں آتی۔ لیکن میں صاف اور سچ لکھنے کا عادی ہوں چاہے بات میرے اپنے خلاف ہی ہو۔ لیکن پروفیسر موصوف انگریزوں کے بنائے ہوئے مذہب اور جھوٹے نبی کے پیروکار ہیں۔ اس لیے مذہبی بات پر اشتعال میں آ کر پستی کی گہرائیوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ میں نے ان کی تصنیف پسِ نوشت چہارم کا بغور مطالعہ کیا۔ انہوں نے ہر غیر احمدی کی تصنیف کا مذاق اُڑایا ہے اور ہر احمدی کی تحریر کی تعریف کی ہے۔ اسی لیے میں نے اس مضمون کا نام ''بُغض'' رکھا ہے۔

منیر الدین احمد آف جرمنی نے اپنی تصنیف ''ڈھلتے سائے'' (قوسین پبلشرز۔۔لاہور)، صفحہ نمبر 149 پر پروفیسر موصوف کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ میٹرک سیکنڈ ڈویژن کرنے کے بعد آپ کو ایک سال تک کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔ آپ کو مجبوراً فضلِ عمر ہسپتال ربوہ میں بطور کلرک ملازمت کرنی پڑی۔ وہاں آپ اپنے افسرِ اعلیٰ ڈاکٹر مرزا منور احمد کے جعلی دستخط کرتے ہوئے پکڑے گئے اور فوراً ہی نوکری سے نکال دیے گئے۔ آپ کے ایک اور قریبی ساتھی عبدالحمید ٹنڈے نے بھی اپنے افسر اعلیٰ کے جعلی دستخط کر کے رقم غصب کر لی۔ پکڑے جانے پر اسے بھی نوکری سے نکال دیا گیا۔

جناب منیر الدین صاحب خود مرزائیت سے توبہ تائب ہو کر سُرخرو ہو چکے ہیں۔ وہ آپ کے بچپن کے ساتھی اور ہم سکول ہیں۔ آپ کی برادری اور آپ کے بے حد قریب رہ چکے ہیں بلکہ آپ کے ماموں زاد ہیں۔ ان کی تعلیم بھی ربوہ سے ہی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ڈھلتے سائے کے صفحہ نمبر 50 پر آپ کے نبی اور اس کی پوتی کی جنسی زندگی کے بارے میں بے لاگ لکھا ہے۔ عبدالرحمٰن مصری کے ایک خط کے مطابق جو انہوں نے آپ کے اُس وقت کے خلیفہ کے نام لکھا تھا کہ مجھے علم ہو چکا ہے کہ آپ جنبی حالت میں ہونے کے باوجود نماز پڑھانے آ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ خود ہی بتائیں کہ کیا کوئی نبی کا وارث اس قسم کی عادات و خصائل کا مالک ہوسکتا ہے؟ کیا کسی خلیفہ کی جنسی کہانیاں زبان زدِ عام ہوسکتی ہیں؟ کیا کسی نبی کی پوتی کو کنوارے پن میں حمل

ہونے پر تالاب میں ڈبو کر مارا جا سکتا ہے؟ آپ کے لیے بہتر ہوتا کہ آپ ''ڈھلتے سائے'' نامی کتاب میں لگائے گئے بے شمار الزامات وواقعات کا جواب دیتے۔منیر الدین احمد تو آپ کے اپنے ہیں۔آپ کے لیے کوئی غیر نہیں ہیں۔متذکرہ بالا کتاب آپ لوگوں، آپ کے خلفاء اور آپ ہی کی آل اولاد کے خلاف FIRs اور ضمیموں سے بھری پڑی ہے۔ان کا جواب دیجئے۔آخر میں آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ مرزا غلام احمد کا مطلب ہے ایک شخص مرزا جو احمد کا غلام ہے۔کیا کوئی نبی دوسرے نبی کا غلام بن کر بھی آیا ہے؟

متذکرہ بالا حالات و واقعات اور جناب منیر الدین احمد کی تصنیف ''ڈھلتے سائے'' کی روشنی میں ثابت ہوا کہ آپ نہ صرف علمی کذاب ہیں بلکہ کذابیت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔اس لیے آپ کی اور آپ کے تحریر کردہ خیالات کی ذرہ برابر بھی حیثیت نہیں ہے۔

فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ ''انا خاتم النبین لا نبی بعدی''یعنی ''میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔میرے آقا و مولیٰ نے مزید فرمایا'' قریب ہے کہ میری اُمت میں تیس دجال پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں۔حالانکہ میں خاتم النبین ہوں۔میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' (صحیح مسلم)۔

ڈاکٹر پرویز پروازی قادیانیت حضرت محمد ﷺ سے بغاوت ہے۔حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ مدعی نبوت سے دلیل لینے والا کافر ہو جاتا ہے۔سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک فیصلے کے مطابق ہر قادیانی گستاخِ رسولؐ ہے۔آپ کا دل و دماغ جانتا ہے کہ میں سچ لکھ رہا ہوں مگر قدرت کی طرف سے آپ کے دل و دماغ پر جو مُہر لگ چکی ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔اگر کوئی علاج ہے تو صرف سچے دل سے توبہ ہے اور آنحضرت ﷺ کی ختمِ نبوت پر ایمان رکھنا ہے۔ورنہ شیطان جیسا حال ہوگا۔کیونکہ اس نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بغاوت کی تھی اور آج تک معافی نہیں مانگی۔اگر مانگ لیتا تو کیا خبر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجاتی۔مگر شیطان مردود کو یہ زعم ہے کہ آیت الکرسی کے شکل میں اس کے پاس جنت کی کنجی ہے جس سے وہ جنت کا دروازہ کھول کر جنت میں داخل ہو جائے گا۔لیکن وہ آپ کی طرح کا بیوقوف نہیں جانتا تھا کہ قیامت آنے سے پہلے مناسب وقت پر اس کی روح سے آیت الکرسی نکال لی جائے گی۔پھر وہ بھٹکتا پھرے گا اور جہنم کے شعلے رقص کرتے اسے اپنے حصار میں لے لیں گے اور رقصِ عذاب شروع ہو جائے گا۔

میں قرآنِ پاک کی آیت کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

ترجمہ: اور جو شخص دنیا میں اندھا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔

پروازی صاحب:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اب سنو میرے آقا حضرت محمد ﷺ کے معجزات:

۱۔ آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔

۲۔ آپؐ پر کبھی مکھی نہیں بیٹھی تھی۔

۳۔ آپؐ کو کبھی جمائی نہیں آئی تھی۔

۴۔ آپؐ جیسے آگے دیکھتے تھے ویسے ہی پیچھے دیکھتے تھے۔

۵۔ آپؐ جس بھی جانور پر سوار ہوتے وہ کبھی بدک کر نہ بھاگا۔

۶۔ آپؐ کے پسینے سے خوشبو آتی تھی۔

۷۔ آپؐ جس پانی میں اپنا لعاب ڈال دیتے وہ میٹھا ہو جاتا۔

۸۔ شق القمر کے علاوہ مزید بے شمار معجزات پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۹۔ ایک مرتبہ خاتونِ جنت فاطمہؓ تندور پر روٹیاں لگا رہی تھیں اور ساتھ محمد ﷺ کھڑے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ فرمایا کیا ایک روٹی میں لگا دوں پھر آپ نے ایک روٹی تندور میں لگائی۔ فاطمہؓ نے کہا بابا روٹی تو پک ہی نہیں رہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز کو میں ہاتھ لگا لوں اس پر آگ حرام ہو جاتی ہے۔

پروازی! لوگوں کو تضحیک کا نشانہ بنانے سے بہتر ہے کہ اپنی غلط سوچ کی اصلاح کرو جو کذابیت پر یقین رکھتی ہے اور توبہ تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی ختمِ نبوت کو دل و جان سے قبول کرو۔

مجھے اپنے آقا آنحضرت خاتم النبین و سید المرسلین محمد ﷺ کا غلام ہونے کا فخر ہے۔ اُن کا یہ فرمان ''میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا'' مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ان کے اس فرمان کو دنیا کا کوئی بھی کذاب، لعنتی، جھوٹا شخص غلط ثابت نہیں کر سکا اور نہ ہی تا قیامت کر سکے گا۔ مزید یہ کہ

بحثیت احمدی آپ اس واقعے سے بخوبی واقف ہوں گے۔

کفر یہ مذہب قادیانیت کے وفد نے لندن سے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد کو خط لکھ کر درخواست کی کہ ہمارے خلیفہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔آپ سے التماس ہے کہ ہمارے وفد کا سرکاری مہمان کے طور پر استقبال کریں۔

شاہ فہد نے جواب دیا کہ اگر وفد نبی کریم حضرت محمد ﷺ کا طوقِ غلامی پہن کر آنا چاہتا ہے تو ہم ان کا استقبال دل و جان سے کریں گے لیکن اگر وہ ملعون مرزا غلام احمد قادیانی کا طوقِ غلامی پہن کر آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہمارے پیش روسیّدنا ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ کذاب کے ساتھ کیا تھا۔ یہ جواب سن کر کافر مرزائیوں کا وفد ہکا بکا رہ گیا۔شاہ فیصل مرحوم کے مطابق ختمِ نبوت کا کوئی منکر اپنے کفر یہ عقائد کی بناء پر سعودی عرب میں داخل نہیں ہوسکتا۔

میں نے ڈاکٹر پرویز پروازی کا تجزیہ سید جواد حسین ریٹائرڈ ڈائریکٹر Trade Development Authority of Pakistan ملتان اور نواب اعظم خان خاکوانی ملتان کو ارسال کر کے اُن کی رائے مانگی تھی جو من وعن یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ دونوں حضرات میرے لیے بے حد محترم ہیں۔اُردو شناس اور نہایت ذہین ہیں۔آخر میں صرف اتنا کہوں گا۔

لعنت اللہ علی الکاذبین۔۔لعنت اللہ علی المنافقین۔

آقا ﷺ کا غلام ادریس احمد آفتاب

جواب از طرف جواد حسین صاحب

کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی کتاب ''فرشتے کی ایف آئی آر'' پر آپ کا تجزیہ نظر سے گزرا۔اتفاق کی بات ہے کہ راقم نے بھی یہ کتاب پڑھی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک کسی بھی آپ بیتی میں دو چیزیں ضروری ہیں۔اوّل واقعات کی سچائی، دوئم سادہ و عام فہم زبان میں واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کرنا۔ میں نے ''فرشتے کی ایف آئی آر'' میں ان دونوں خوبیوں کو بدرجہ اُتم پایا۔ یہ اُن کتابوں میں شامل ہے جنہیں قاری ایک بار پڑھنا شروع کر دے تو اس کی دلچسپی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اسے جلد از جلد ختم کر لے۔

لیکن آپ کا تجزیہ پڑھ کر نہ صرف مجھے حیرت ہوئی بلکہ کسی قدر افسوس بھی ہوا کہ آپ جیسے پڑھے لکھے

مصنف اور عالم فاضل شخص نے ایک ایسا تجزیہ لکھا ہے جس کی بنیاد محض ظن وتخمین، تعصب اور جانبداری پر ہے۔ کسی بھی کتاب کے تجزیے یا Review میں کتاب کے بنیادی خدوخال زیرِ بحث لائے جاتے ہیں نہ کہ بہت معمولی جزئیات یا ٹائپ کی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ کام پروفیشنل نقاد، محقق یا متعلقہ شعبے کے استاد کا ہوتا ہے نہ کہ مختصر اور جامع تجزیہ لکھنے والوں کا۔ اکثر مصنفین اس طرح کی غلطیوں کی نشاندہی اور تبصروں کے لیے قارئین سے خود درخواست کرتے ہیں اور نشاندہی پر شکر گزار بھی ہوتے ہیں۔ کتابِ مذکور کے مصنف نے بھی کچھ ایسی ہی درخواست کی ہے۔ اب میں آپ کے تجزیے کے بارے میں کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ا۔ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کے حالاتِ زندگی محیر العقول ضرور ہیں لیکن ناممکن نہیں۔ جو شخص ان سے شناسائی نہیں رکھتا وہ ان کی آپ بیتی کو افسانوی آپ بیتی سمجھے گا۔ اس آپ بیتی کے بیشتر کردار اشاعت کے وقت اور اب بھی بقیدِ حیات ہیں۔ کسی ایک فرد نے بھی اب تک ان واقعات کی تردید نہیں کی۔ دراصل یہ کتاب کی خوبی ہے کہ بظاہر افسانہ لگتی ہے لیکن حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔ محترم تجزیہ نگار کو اس لیے کتاب کے حیرت انگیز واقعات مشکوک لگتے ہیں۔

۲۔ جنات کا وجود ثابت ہے۔ خود قرآنِ کریم اِن کے وجود کی بین دلیل ہے۔ انسانوں کی زندگی میں ان کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے دور میں جنات مختلف امور سرانجام دیتے رہے۔ اگر میں نے جنات کا مشاہدہ نہیں کیا یا مجھے اِن سے واسطہ نہیں پڑا تو مجھے حق نہیں پہنچتا کہ میں دوسروں کے مشاہدات و تجربات کو رد کر دوں۔ میں نے ایٹم کے اجزاء یعنی الیکٹرون وغیرہ کو نہیں دیکھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سائنسدانوں کے تجربات کی نفی کر دوں۔

۳۔ بعض لوگ تو دینِ اسلام کو بھی عقلی دلائل سے پرکھتے ہیں۔ جن کی شرعی طور پر سخت ممانعت ہے۔ دین اور عقل کو زیرِ بحث لانا مصنف کی منشا نہیں ہے۔ بلاشبہ قرآن نے تدبر، تفکر اور تفصّل پر بہت زور دیا ہے۔ لیکن دین کے کچھ امور ایسے ہیں جنہیں آپ عقل کی بنیاد پر نہیں سمجھ سکتے۔ جنت اور دوزخ کی تفصیلات، معجزاتِ قرآنی، غیب پر ایمان، وحی، فرشتے اور جنات کا وجود۔ یہ سب باتیں ماورائے عقل ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ان پر ایمان لانا ہم پر واجب ہے۔ اسی طرح دین میں ہم اس بات پر بحث نہیں کر سکتے کہ نمازِ فجر کی دو رکعتیں کیوں ہیں اور ظہر اور عصر کی چار چار کیوں ہیں۔ بس یہ حکمِ رسولِ کریم ﷺ ہے۔

ہم پر ان کی اطاعت اس طرح واجب ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت۔

۴۔ مصنف کی عربی دانی پر صرف اس وجہ سے اعتراض کرنا کہ ''کل'' کی بجائے ''قل'' لکھا ہے مناسب نہیں۔ یہ ٹائپ کی غلطی ہو سکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ناقد ایسی معمولی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اپنے علمی تجربے کا اظہار کرنا چاہتے ہوں۔

۵۔ مصنف کے والد محترم کے بارے یہ کہنا کہ انھوں نے اپنے بیٹے قدیر کے غلط اقدام کو نظر انداز کیا یا مصنف کی تعلیم و تربیت پر مناسب توجہ نہ دی تو مصنف نے اس امر کا کہیں دفاع نہیں کیا۔ بلکہ حقیقتِ احوال قارئین کے سامنے بیان کر دی ہے۔ تاکہ والدین اپنی کوتاہیوں اور ذمہ داریوں سے آگاہ رہیں۔ اچھے مصنف کا کام تبلیغ کرنا نہیں ہوتا بلکہ حالات و واقعات کو صحیح بیان کرنا ہے۔ یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ اپنے مطالعہ سے عملی زندگی میں کس طرح استفادہ کرتے ہیں، کوئی بھی شریف اور نیک سیرت بیٹا باپ کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کراتا جس کا تقاضا کیا گیا ہے۔ آخر محترم تجزیہ نگار یہ چیز کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ یہ آپ بیتی ایک بیٹے کی ہے جو اپنے والد محترم کا ذکر حدِ ادب میں رہ کر کرتا ہے اور ایسا ہر بیٹے کو کرنا چاہیئے تھا۔

٦۔ یہ کہنا کہ مصنف نے شاید جاسوسی ناول پڑھ رکھے ہیں اور ان کا اثر اس کتاب میں محسوس کیا جا سکتا ہے محض گمان پر مبنی ہے۔ اگر جاسوسی ناول پڑھے بھی ہوں تو جاسوسی ناولوں کا رشتہ اس حقیقت پر مبنی آپ بیتی سے جوڑنا سراسر زیادتی ہے۔ اس بات کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے کہ یہ کتاب بظاہر تخیل کی پیداوار اور طلسماتی داستان محسوس ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت حقائق پر مبنی ہے۔ It is a mythical reality.

اگر کہیں شعر کا حوالہ غلط ہے تو اگلے ایڈیشن میں درست کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مصنف کے ڈاکٹر ہونے پر شک کرنا بلکہ اس کا مذاق اُڑانا ایک سنجیدہ تجزیہ نگار کے شایانِ شان نہیں۔

٧۔ حسین خواتین کا سراپا لکھنا کونسا جرم ہے۔ نہ صرف اُردو شاعری بلکہ دنیا کا بہترین ادب صنفِ نازک کے حُسن کے بیان سے مزّین ہے۔ اگر علامہ اقبال یہ کہیں کہ ''حُسنِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' تو کیا ناقد محترم اُن کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنائیں گے۔ اگر کسی کو ستائشِ عشق سے مسئلہ ہے تو یہ ان کے ذوق یا Asthetic sense کا مسئلہ ہے۔

٨۔ یہ بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ محترم تجزیہ نگار کو کرپشن کا تذکرہ بھی ناگوار گزرا ہے۔ اگر کرپشن،

لوٹ مار، حکمرانوں کی عیاشی کا ذکر ہوا ہے تو یہ باتیں خلافِ واقع نہیں ہیں۔ کرپشن ہمارے ملک کا ناسور ہے۔ اس ملک کی پسماندگی میں کرپشن کا بہت بڑا کردار ہے۔ اس کا نشاندہی کرنا ہر محبِ وطن اور باشعور شہری کا فریضہ ہے۔

۹۔ محترم تجزیہ نگار نے مصنف کی بھٹو صاحب سے ہمدردی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ بات البتہ قابلِ فہم ہے کیونکہ ناقد محترم کا تعلق ایک ایسے مسلک سے ہے جو بوجوہ بھٹو صاحب کو اچھا نہیں سمجھتا۔ قادیانیوں یا احمدیوں کا مسئلہ، پارلیمنٹ اور حکومتِ وقت کی کاروائی اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس ضمن میں اگر کوئی خلافِ واقع حوالے آئے ہیں تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ مصنف محترم کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر لیں۔

۱۰۔ بحثیت مجموعی یہ تجزیہ ہرگز علمی کاوش نہیں ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پسِ پردہ شدید قسم کا ذاتی عناد ہے۔ اچھے اور غیر متعصب تجزیہ نگار کبھی بھی مصنف پر طعن و تشنیع اور جہالت کے الزامات کا سہارا نہیں لیتے۔

۱۱۔ اس تجزیے میں صرف سرورق کو سراہا گیا ہے۔ شکر ہے کتاب تو پسند نہ آئی سرِ ورق تو قابلِ تعریف ٹھہرا۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ وہ مصنف کی کاوش نہیں بلکہ اُن کی بیٹی کی تخلیق ہے۔

سید جواد حسین

ڈائریکٹر TDAP

ملتان

جناب محترم برادرم

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

السلام علیکم۔ مزاج گرامی؟

آپ کی کتاب پر ایک ملعون مرزائی کا تبصرہ جو آپ نے تحریری مواد کی شکل میں مجھے ارسال فرمایا وہ میں نے بغور پڑھا اور آپ کی کتاب کے ان صفحات کو بھی میں نے دیکھا جس پر موصوف نقاد نے بازاری زبان میں تنقید لکھ کر آپ کا دل دکھایا ہے۔ اس زبانِ بد سے بڑھ کر اس نے اپنا خبثِ باطن ظاہر کیا ہے اور اپنی تعریف کرتے ہوئے اس نے اپنے قبیلے کی نشاندہی بھی کی ہے۔

اس ناقص تنقید کے کئی جوابات لکھے جا سکتے ہیں لیکن میری رائے یہی ہے کہ جو شخص اپنے سارے نقاب و

حجاب اتار کر بے لباس سرِ بازار محوِ رقص ہو اور ایک خلق اسے ملامت کر رہی ہو، اس ناعاقبت اندیش کے منہ لگنا سوائے شرمساری کے اور کیا حاصل دے سکتا ہے۔

جواب جاہلاں باشد خموشی! آپ کا بہترین وقار آپ کی خموشی سے مزید طاقتور ہوگا۔ اپنے کالموں کا مجموعہ پیش کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ اس کے مطالعہ کے بعد اپنے ارشادات اور احساسات سے مطلع فرماویں گے۔

اعظم خان خاکوانی، ملتان

Azam Khakwani	Cell: 0343-7114411
Free Lance Generalist	0304-0077227
& Columnisty	Date: 1.2.2016

پروازی مندرجہ ذیل روداد تو تمہیں از بر ہوگی لیکن ہماری نوجوان نسل کی راہنمائی اور تعلیم کے لیے اس کو قندِ مکرر کے طور پر لکھنا بہت ضروری ہے۔ میرے نوجوان بچو! آپ لوگ ناموسِ حضرت محمدؐ کے رکھوالے ہیں۔ اس روداد کو کئی بار شائع کیا جا چکا ہے۔ آپ نوجوانوں کی راہنمائی اور علم میں اضافہ کے لیے آج پھر اس مقدمہ کی تمام تفصیلات آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتا ہوں کیونکہ آئندہ زندگی میں آپ نے ہی نبی پاک ﷺ کے ناموس کی حفاظت کرنی ہے۔

مولوی الٰہی بخش صاحب رہائشی قصبہ مہند تحصیل احمد پور شرقیہ نے اپنی بیٹی غلام عائشہ بی بی کا نکاح اپنے ایک رشتہ دار عبدالرزاق سے کر دیا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ عبدالرزاق مرزائی ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب مرزائی عبدالرزاق نے رخصتی کا مطالبہ کیا تو مولوی الٰہی بخش صاحب نے انکار کر دیا اور 24 جولائی 1926ء کو احمد پور شرقیہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔

غلام عائشہ بی بی کی طرف سے مؤقف اختیار کیا گیا کہ مرزائی عبدالرزاق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کا قائل نہیں ہے۔ اس لیے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا عبدالرزاق مرزائی کے ساتھ اس کا نکاح فسخ کیا جائے۔

ایک سال تک یہ مقدمہ احمد پور شرقیہ کی عدالت میں زیرِ سماعت رہا۔ اس کے بعد مرزائیوں کی درخواست پر دیوان مہتہ اودھو راس، جج چیف کورٹ بہاولپور کے حکم پر مورخہ 27 مئی 1927 کو یہ مقدمہ ڈسٹرکٹ کورٹ بہاولپور منتقل ہو گیا۔

ڈسٹرکٹ کورٹ بہاولپور کے جج صاحب نے شیخ الجامعہ مولانا غلام محمد گھوٹوی جو کہ شیخ السلام کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز تھے کو عدالتی گواہ بننے کی درخواست کی تا کہ آپ اس بہت ہی اہم مقدمہ میں شرعی نقطہ نظر سے عدالت کی راہنمائی کریں۔18 جنوری 1928 کو حضرت مولانہ غلام محمد گھوٹوی شیخ السلام نے اپنا مندرجہ ذیل بیان قلمبند کرایا۔

حضرت مولانا غلام محمد گھوٹویؒ نے عدالت میں اپنا بیان قلمبند کراتے ہوئے قرآن پاک، تفاسیر، احادیث، صحیح، اجماع، علماء لُغت کے حوالہ جات سے ثابت فرمایا کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبین ہیں اور ختم نبوت محمد مصطفیٰ ﷺ اسلام کا بنیادی، اساسی، بدیہی عقیدہ ہے۔جس کا انکار خروج از اسلام ہے اگر کوئی شخص تشریعی، ظلی اور بروزی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اور اس کی جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور اگر کوئی بھی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ مرزا غلام محمد قادیانی نبوت کے منصب پر فائز تھا اور اس پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں ہے اور اگر نکاح ہو چکا ہو تو وہ قائم نہیں رہتا۔ڈسٹرکٹ کورٹ بہاول پور کے جج محمد اکبر خان نے 21 نومبر 1928 کو ہائیکورٹ کی پیروی کرتے ہوئے غلام عائشہ بی بی کے خلاف باامر مجبوری فیصلہ صادر کر دیا۔

چنانچہ چیف کورٹ بہاولپور میں اپیل دائر کی گئی، حضرت مولانا غلام محمد گھوٹویؒ نے مسئلہ ختم نبوت کی نزاکت اہمیت اور اس کے دوررس دینی وملی اور بین الاقوامی اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔نیز آپ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا اولین منصب کلمہ گو اور صاحبِ ایمان کا ہے۔سرکاری منصب کا درجہ اس کے بعد ہے۔اس لیے آپ حضرات اپنے اولین منصب کا بھی لحاظ کریں۔جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونِ اللہ عزوجل اور قانونِ رسول اللہ ﷺ کو برتر سمجھیں اور کسی صورت میں اس کو پامال نہ ہونے دیں۔مسئلہ ختمِ نبوت ضروریات دین میں سے ہے۔یہ اصول اسلام میں سے ایک اصل ہے، اسلامی عقائد میں سے ایک اساس ہے۔یہ مسئلہ دین کی بقا کا ضامن ہے۔

اگر حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی آئے گا تو وہ قرآن مجید میں ترمیم کر سکے گا، احادیث نبویہ پر قینچی چلا سکے گا۔دین کی شکل تبدیل کر سکے گا، اس لیے حقیقت یہ ہی ہے کہ ختمِ نبوت کے انکار میں دین کی تباہی مضمر ہے۔

مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ دیگر مذاہب کی طرح مرزائیت کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ نعوذ باللہ

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے دشمنی کرنے کا نام مرزائیت ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ان مذاہب والا معاملہ نہ کیا جائے بلکہ یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ جسے جڑ سے اکھاڑ نا ضروری ہے ورنہ اپنے ایمان کی خیر منائیں۔

مولانا غلام محمد گھوٹویؒ نے مزید فرمایا کہ قرآن اور حدیث اس قسم کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے علماء دین کے دلائل سماعت کرنے کے بعد ہی اس مقدمہ کا حتمی فیصلہ صادر کیا جائے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مقدمہ کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کیس کو اس کی خصوصی حیثیت کی وجہ سے (ہائیکورٹ لاہور) (ہائی کورٹ پٹنہ) (ہائیکورٹ مدراس) کے نظائر سے مستثنیٰ قرار دلوانے کے لیے اسے دربار بہاولپور یعنی ریاست بہاولپور کی وزارتی کابینہ کے "اجلاسِ خاص" بحیثیت عدالت معلیٰ جسے اس وقت سپریم کورٹ کی حیثیت حاصل تھی)۔ بغرض حصول استثنا خاص منتقل کیا جائے۔

چنانچہ بحمد اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الاسلامؒ کے قوی دلائل سے متاثر اور قائل ہو کر چیف کورٹ بہاولپور بتاریخ 10 جون 1931ء اس مقدمہ کو بغرض حصول استثنا خاص دربار بہاولپور کی طرف بھجوائے جانے کی تجویز شاملِ فیصلہ کرنے پر رضامند ہوگئی۔ چیف کورٹ مندرجہ ذیل اراکین پر مشتمل تھی۔

1۔ چیف جسٹس جناب عبدالقادر

2۔ دیوان مہتہ اودھوداس (ممبر چیف کورٹ)

3۔ مولوی فضل حسین (ممبر چیف کورٹ)

10 جون 1931ء کو جس وقت اس کیس کو دربار معلیٰ بہاولپور میں منتقل کی تجویز بابت حصول استثنا خاص شامل فیصلہ کر کے چیف کورٹ بہاولپور کی طرف اس اپیل کو دیگر ہائیکورٹس کے نظائر کی وجہ سے باامر مجبوری مسترد کیا گیا اور محمد اکبر خان ڈسٹرکٹ جج کے فیصلہ کو برقرار رکھا گیا۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ سخت گرمی کا موسم تھا، گرمی اور تھکن کی وجہ سے کچھ رُفقا چاہتے تھے کہ آج نہیں کل ریاست کے وزیراعظم سردار نبی بخش سے ملاقات کی جائے۔ (ریاست کا وزیراعظم برطانوی حکومت نامزد کرتی تھی) اور ان سے دربار بہاولپور کا اجلاسِ خاص بطور عدالتِ معلیٰ (سپریم کورٹ) طلب کرنے کی استدعا کی جائے۔ مگر حضرت شیخ الاسلامؒ نے فرمایا کہ میں ابھی اور اسی وقت ہی وزیراعظم سے ملاقات کرونگا اور جب تک انہیں قائل نہ کر لوں گھر کا رخ نہ کروں گا۔ حضرت اپنے چند رُفقاء، علما اور شاگردوں کے ہمراہ وزیراعظم کی رہائش گاہ کی

طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وزیر اعظم آرام فرما رہے ہیں۔ آپ نے ملاقات پر اصرار فرمایا اور وزیر اعظم کے پرائیوٹ سیکرٹری شیخ فضل محمد سے ارشاد فرمایا کہ وزیر اعظم تک میرا پیغام پہنچا دو کہ مولوی غلام محمد گھوٹوی شیخ الجامعہ عباسیہ شیخ الاسلامؒ آپ کو بہشت بریں کا سرٹیفکیٹ دینے آئے ہیں۔ چارو ناچار وزیر اعظم تک یہ پیغام پہنچا دیا گیا کہ حضرت الشیخ بغیر ملاقات واپس جانے پر آمادہ نہیں ہو رہے۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ وہ آپ کو بہشت بریں کا سٹیفکیٹ دینے آئے ہیں۔ آخر کار وزیر اعظم کو ملاقات کے لیے آنا ہی پڑا۔ جیسے ہی وہ مہمان خانے میں تشریف لائے آتے ہی فرمانے لگے حضرت کیا آپ مجھے بہشت بریں کا سٹیفکیٹ دینے آئے ہیں؟ کیا آپ نے یوں فرمایا ہے؟ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹویؒ نے فرمایا بے شک میں نے یہ کہا ہے کیونکہ آپ ناموسِ رسالت کا تحفظ کریں گے تو انشاللہ تعالیٰ بفضلِ خدا ضرور بہشت بریں کے حقدار ہونگے۔

ان دنوں نواب آف بہاولپور لندن میں مقیم تھے، وزیر اعظم حضرت شیخ الاسلامؒ کی گفتگو سن کر آبدیدہ ہو گئے اور عرض کیا کہ حضرت یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے لیے منتخب فرما لیا ہے۔ اس کرم پر میں اس ذاتِ کریم کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ وزیر اعظم کی اس ایمان افروز بات پر مولانا بہت ہی مسرور ہوئے اور انہیں دعاؤں سے نوازا۔ آخر کار حضرت مولانا محدث گوٹھویؒ نے دربارِ معلیٰ بہاولپور (کورٹ آف منسٹرز) میں ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر خان کے فیصلے (بابت مقدمہ غلام عائشہ) کے خلاف باقاعدہ اپیل ثانی دائر برائے ''اجلاس خاص'' دائر کر دی، تا کہ ہائیکورٹس کے فیصلوں کے اِستثنا خاص کیا جا سکے۔

عالی جناب وزیر اعظم (اللہ کی ان پر رحمت ہو) کی جانب سے دربار بہاولپور کا اجلاسِ خاص بطور عدالت معلیٰ طلب کر لیا گیا۔ تمام وزرا کو پابند کیا گیا کہ اس اجلاسِ خاص میں حاضر ہوں اور کسی بھی وزیر کو کسی بھی عذر پر اجلاس ہذا میں شرکت سے مستثنیٰ نہ کیا جائے گا تا کہ اس کی حیثیت بطورِ "سپریم کورٹ" متاثر اور مجروح نہ ہو۔ اب فریق مخالف یعنی جماعت احمدیہ نے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں کہ کسی طرح یہ "اجلاسِ خاص" منسوخ یا کم از کم ملتوی ہو جائے تا کہ وہ اپنی بااثر احمدی شخصیات اور اپنی انگریز دوستی کے ذریعے نواب آف بہاولپور تک رسائی حاصل کر سکیں جو ان دنوں موسمِ گرما گزارنے برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں نواب عمر حیات ٹوانہ والدِ محترم خضر حیات ٹوانہ بھی برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ دونوں کی باہم ملاقات میں نواب

آف بہاولپور نے عمر حیات ٹوانہ سے تذکرہ کیا کہ انگریز گورنمنٹ کا مجھ پر بہت دباؤ ہے کہ آپ ریاست بہاولپور میں دائر مقدمہ مرزائیہ کو ختم کرا دیں اور حضرت شیخ الجامعہ العباسیہ کو اس مقدمہ کی پیروی سے منع کر دیں۔اس پر عمر حیات ٹوانہ نے کہا کہ ہم انگریز کے وفادار ضرور ہیں مگر اپنے دین ایمان اور عشق محبت رسالت مآب ﷺ کا تو ان سے سودا نہیں کر سکتے۔اس لیے آپ ڈٹ جائیں اور ان سے کہیں کے عدالت جو چاہے فیصلہ کرے میں حق وانصاف کے سلسلہ میں اس پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا اور نواب آف بہاولپور نے غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دینی اور عدالتی امور میں مداخلت سے صاف انکار کر دیا۔علامہ حافظ عبد الرحمٰن جامی احمد پوری بیان فرماتے ہیں کہ ایک وزیرِ بے تدبیر نے بعض خفیہ وجوہ کی بنیاد پر ''اجلاس خاص'' کے دن کے لیے رخصتِ اتفاقیہ مانگ لی لیکن صد آفرین ہے وزیر اعظم سردار نبی بخش محمد حسین سندھی کے انہوں نے حضرت مولانا غلام محمد گوٹھویؒ شیخ الاسلام کی ایمان افروز گفتگو کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں محفوظ کر لیا تھا اور خلوص نیت، صدق دل، حفاظتِ دین اور دفاع ناموسِ رسالت پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس وزیر کی درخواست برائے رخصت نامنظور کر دی اور حکم صادر کیا کہ "اجلاس خاص" سے غیر حاضری کی صورت میں اسے وزارت سے سبکدوش ہونا پڑے گا، اسی طرح کابینہ کے ایک انگریز وزیر کی درخواست وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ میں موصول ہوئی۔ جس میں اس نے استدعا کی تھی کہ برطانیہ سے میرے مہمان آئے ہوئے ہیں اور میں ''اجلاس خاص'' والے دن ان کے ساتھ ڈیرہ بکھا کی جھیل اور ملحقہ جنگل میں شکار کھیلنے اور سیر و تفریح کا پروگرام بنا رکھا ہے۔

اس لیے مجھے ''اجلاس خاص'' میں حاضر ہونے سے معذور تصور کیا جائے۔مگر جناب وزیر اعظم نے فوری طور پر ایک سرکاری حکم نامہ جاری کیا کہ فلاں۔فلاں "تواریخ" کو مذکورہ جھیل اور ملحقہ جنگل میں داخلہ ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔اس لیے کوئی بھی شخص ادھر جانے کی کوشش نہ کرے۔سردار محمد امیر خان جلوانہ ہوم منسٹر ریاست بہاولپور آپ کے عقیدت مند تھے اور مقدمہ مرزائیہ کے سلسلہ میں انہوں نے خوب کام کیا۔پروفیسر اللہ بخش قادری ازہریؒ نے اپنی تصنیف "حیاتِ ازسری" میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا غلام محمدؒ گھوٹویؒ فاتح قادیانیت ہیں۔آپؒ ہی کی کاوشوں سے مقدمہ مرزائیہ میں اہلِ اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔

آپؒ بنفسِ نفیس "دربارِ بہاولپور" (سپریم کورٹ) میں پیش ہوئے اور آپؒ نے اس اجلاس خاص کے لیے قرآن، احادیث، تفاسیر، کُتب فقہ، علم الکلام، اقوالِ آئمہ، کتب لغتِ عربیہ اور کُتب مرزا قادیانی

کے حوالہ جات پر مشتمل ایک مفصل، مدلل اور پر مغز مضمون تیار کیا جو کہ ایک صد صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں عقیدہ ختمِ نبوت محمد یہ الصلوٰۃ والسلام پر مکمل اور سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور سید الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے خاتم النبین ؐ ہونے یعنی اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہونے پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے حضور پُر نور ﷺ کے بعد نبوت اصلی، ظلی، بروزی، طفیلی، تشریعی وغیرہ وغیرہ سب کا ممتنہ شرعی ہونا ثابت کیا تھا۔

حضرت الشیخ کا ممتنع یہ بیان دس گھنٹوں پر حاوی تھا اور ایک صد صفحات پر مشتمل تھا۔ ریاست ہذا کے وزرا کی تعداد آٹھ تھی لہٰذا حضرتؒ نے ء آٹھ کاپیاں تیار کیں تا کہ ہر ایک وزیر کے سامنے ایک کاپی برائے ملاخطہ موجود ہو۔ علامہ مولانا محمد صادق بہاولپور (راقم الحروف کے مرحوم دوست علامہ حافظ نعمان راشد مرحوم کے والد محترم) علامہ حافظ نصیر الدین چیلاواہنی۔

علامہ حافظ عبد الرحمٰن جامی احمد پور شرقیہ۔ علامہ حافظ صاحبزادہ محمد امیر چیلاواہنی علامہ مولانا ملک عبد اللہ مسن رحیم یار خان، علامہ رحمت اللہ ارشد، مولانا برکت علی، علامہ حافظ محمد امین چیلاواہنی دیگر علما اور حضرت کے ہونہار شاگرد تمام ریکارڈ اور کاپیاں تیار کرنے میں شامل تھے۔ علامہ عبد الرحمٰن مرحوم فرمایا کرتے تھے ہم لوگ دن رات اس مضمون کی کاپیاں تیار کیا کرتے تھے اور مولانا محمد صادقؒ اس سارے کام کے نگران تھے۔

فریقِ مخالف کی ریشہ دوانیوں کے باوجود دربار بہاولپور یعنی کہ سپریم کورٹ کا اجلاسِ خاص 21 دسمبر 1931ء شروع ہوا۔ وزیر اعظم بہاولپور سردار نبی بخش سندھی صدارت کر رہے تھے باقی تمام وزرا بھی حاضر تھے۔ مرزائیوں کی طرف سے بھی جلال الدین شمس اور بیرسٹر اسد اللہ خان حقیقی برادر ظفر اللہ خان پیش ہوئے۔

اہلِ اسلام کی نمائندگی حضرت مولانا غلام محمد گوٹھویؒ شیخ الاسلام فرما رہے تھے آپ کے پیچھے مولانا فاروق احمد انصاری شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور، مولانا محمد صادقؒ، شیخ الفقہ جامعہ عباسیہ بہاولپور اور مولانا عبید اللہ معلمِ اعلیٰ جامعہ عباسیہ بہاولپور موجود تھے۔ حضرت محدث گوٹھویؒ کی طرف سے ان کے بیان کی کاپیاں تمام وزراء میں تقسیم کر دی گئیں۔

وزیر اعظم نے حضرت شیخ الاسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کیا آپ قرآن کریم سے ایسی دوٹوک دلیل پیش کر سکتے ہیں جو ختمِ نبوت بر محمد ﷺ کو ثابت کر دے۔ اس پر شیخ نے فرمایا قرآن کریم کا ہر ورق

ناطق ہے کہ حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر سلسلہ نبوت اور سلسلہ وحی ختم ہو چکا ہے۔ وزیر اعظم نے متاثر ہوتے ہوئے حضرت کو مخاطب کیا اور کہا حضرت اگر ایسا ہے تو آپ ''قرآن کے ورقِ اول سے'' ختمِ نبوت کا مسئلہ ثابت کریں۔ حضرت الشیخ نے اپنی جیبِ خاص سے قرآن مجید کا چھوٹا نسخہ نکالا جبکہ تمام شرکاء اجلاس بہ پاسِ ادب ایستادہ ہو گئے۔ حضرتؒ نے سورۃ بقرہ کے ورق اول کی تلاوت شروع فرمائی ترجمہ:

الف لام میم یہ کتاب اس میں کوئی کھٹکا نہیں۔ یہ اصحابِ تقویٰ کے لیے راہنمائی ہے جو کہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور ہماری عطا میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کہ اس وحی پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اُتاری گئی اور اس وحی پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی نیز دار آخرت پر یقین رکھتے ہیں!

حضرتؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کی دو قسموں پر ایمان لانے کا تذکرہ فرمایا ہے:

1) ایک وہ جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔
2) دوسری وہ جو آپ ﷺ سے پہلے نازل ہوئی۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد نزولِ وحی کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بیان فرماتا اور اس پر ایمان لانے کا ذکر ضرور کرتا۔ لہٰذا اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ بعثِ محمدیؐ کے بعد نبوت کا سلسہ ختم اور نزولِ وحی کا باب بند ہو چکا ہے۔ اب کسی کو نبوت عطا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام شرکاء اجلاس اس پر عش عش کر اٹھے۔ وزیر اعظم اتنے متاثر ہوئے کہ کہنے لگے یہ زبردست استدلال ہے یہ نہایت معقول اور راست طرز اثبات ہے۔ یہاں تک کہ انگریز وزیر کہنے لگا "It is Logic"۔ (یہ ہے حکیمانہ استدلال)

وزیر اعظم نے فریقِ مخالف جلال الدین شمس اور بیرسٹر اسد اللہ خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کیا آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

اسد اللہ خان کہنے لگا:

یہ جو سورۃ البقرہ کی آیت ترجمہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں میں جو آخرت کا لفظ ہے اس سے مراد مرزا غلام احمد قادیانی ہے۔ ''اجلاسِ خاص'' کے تمام تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ وزراء اس بچگانہ اور مضحکہ خیز دلیل پر

حیرت زدہ رہ گئے۔ وزیرِاعظم نے حضرت شیخ کی طرف دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ اندازِ استدلال تحریف معنوی کا عجیب وغریب شاہکار ہے کیونکہ قرآن اپنی تفسیر خود کرتا ہے، آخرت سے مراد، دارِ آخرت یعنی اُخروی جہاں ہے نہ کہ مرزائی نبوت، چنانچہ آئیت قرانیہ۔

ترجمہ: یہ آخرت کا گھر یعنی (جنت) ہم ان لوگوں کے نام کرتے ہیں جو زمین میں گھمنڈ نہیں چاہتے اور نہ ہی فساد۔ عاقبت تو ہے ہی اہل تقویٰ کے لیے۔

مزید یہ کہ آخرت سے مراد اخروی نبوت ہے نہ کہ مرزائی نبوت حضرتؒ کا بیان دس گھنٹوں سے زیادہ پر حاوی تھا جس میں وہ فرماتے ہیں کہ حضور محمد ﷺ کے بعد کسی نئے نبی کی آمد سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ آنحضور ﷺ کی وحی ثانوی درجہ پر آجائے گی اور نئے نبی کی وحی اب اولین درجہ پر براجمان ہو جائے گی۔ آنحضور ﷺ کی وحی پر عملدرآمد مرزا صاحب کی صوابدید پر موقوف قرار پائے گا۔

نئے نبی کی وحی کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہو جائے گی، چنانچہ مرزا صاحب کی وحی حضور محمد عربی ﷺ کی وحی میں ترمیم بھی کر سکے گا۔ اس طرح قرآن کریم اب جدید نبی کے رحم وکرم پر ہوگا اور دین محمدیؐ مقامِ کمال سے محروم ہو جائے گا بلکہ اب اس میں خزف اور اضافہ کی مشق شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ حضور پُرنور محمد مصطفیٰؐ خاتم النبیین نہیں رہیں گے بلکہ مرزا صاحب خاتم النبیین تصور کیے جائینگے (نعوذ باللہ من ذالک)۔ حلال، حرام جائز وناجائز امور کی اب نئی فہرست مرتب ہوگی اور اس طرح دین کا سارا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا۔

حضرت کا یہ بیان یک صد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کا دس گھنٹوں پر مشتمل تفصیلی اور مدلل بیان سن کر تمام وزراء اکرام نہایت مطمئن ہوئے۔ وزیرِاعظم نے فریقِ مخالف کے وکیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے آخرت سے مرزائی نبوت مراد لے کر نہ صرف قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے بلکہ توہینِ عدالت کے مرتکب بھی ہوئے ہو۔ تمہاری سزا تو بہت سخت ہے مگر سرِ دست تمہیں باہر پلاٹ میں تادم تحریر فیصلہ بٹھانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اجلاسِ خاص کا فیصلہ:

ازاں بعد اجلاس خاص، عدالت معلیٰ ریاست بہاولپور کے مئوقر اراکین نے حضرت شیخ الاسلام علامہ غلام محمد محدث گھوٹویؒ کے تحریری بیان کے ضروری اور خاص خاص مقامات کا معائنہ اور مطالعہ کیا گیا پھر باہم

تبادلہ خیالات کے بعد متفقہ فیصلہ صادر کیا کہ ان ہائیکورٹس اور ڈسٹرکٹ کورٹ بہاولپور (مقدمہ کریم بخش مرزائی بنام جندوڈیؒ مصدرہ 22 اگست 1917 اور مقدمہ غلام عائشہ مصدرہ 21 نومبر 1928، نیز چیف کورٹ بہاولپور (اپیل جندوڈی بنام کریم بخش مرزائی) اخراج اپیل بتاریخ 7 مارچ 1923 اور اپیل غلام عائشہ اخراج اپیل بتاریخ 10 جون 1931 کے سابقہ فیصلوں میں کماحقہ تنقیحات اور تحقیقات سے کام نہیں لیا گیا۔ فریقین کے پیش کردہ شواہد اسناد اور دلائل پر سیر حاصل بحث نہیں کی گئی بلکہ غیر متعلقہ سوالات زیر بحث رہے۔

اسلامی بنیادی اصولوں اور ضروریات دین کو موضوع نہیں بنایا گیا اور نہ ہی اس امر میں غور و فکر کیا گیا کہ اصولِ دین سے انحراف موجب ارتداد ہے یا نہ ہے؟

اور اسلامی عقائد سے روگردانی اور انکارِ خروج عن الدین کا باعث ہے یا نہ ہے؟ لہٰذا ان کورٹس کے یہ سابقہ فیصلہ جات اس خاص مسئلہ کے بارے میں مکمل وضاحت اور قطعیت کے حامل نہیں ہیں۔ ان کی پیروی ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ اس قرارداد کے ساتھ یہ مقدمہ (غلام عائشہ بی بی) اس ہدایت کے ساتھ واپس ہو کہ حضرت مولانا غلام محمد محدث گھوٹویؒ شیخ الجامعہ العباسیہ کے بیان سے یہ مسئلہ بخوبی واضح ہو گیا ہے کہ اگر کسی شخص کا قادیانی عقائد کے مطابق یہ ایمان ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی آ گیا ہے اور اس پر وحی نازل ہوئی ہے تو ایسا شخص چونکہ ختمِ نبوت پر آنحضرت محمد ﷺ کا منکر ہے جبکہ ختمِ نبوت کا عقیدہ ضروریاتِ دین اور اساس ہائے ایمان میں سے ہے لہٰذا وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس لیے ''اجلاسِ خاص'' اس مقدمہ اور اس کی خصوصی حیثیت کی بناء پر ہائیکورٹ لاہور، ہائیکورٹ مدراس اور ہائیکورٹ پٹنہ، چیف کورٹ بہاولپور اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ بہاولپور کے سابقہ فیصلوں سے مستثنیٰ کرتے ہوئے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ بہاولپور کو از سرِ نو مجاز بناتا ہے کہ وہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹویؒ شیخ الجامعہ العباسیہ بہاولپور اور ملک کے دیگر علماء اکرام کے دلائل کی روشنی میں اس مقدمہ کی از سرِ نو تنقیح اور تحقیق کرے اور فریقِ مخالف کو بھی بھرپور موقع دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنا موقف پیش کر سکیں۔

تمام اراکین ''اجلاسِ خاص'' (وزراء نے 21 دسمبر 1931) نے اس پر اپنے اپنے دستخط ثبت کیے اور نواب آف بہاولپور نے 25 جنوری 1932ء کو اس پر دستخط فرمائے۔ اوائل 1932ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ

نے بلا امتیاز بریلوی، دیوبندی اور دیگر مسالک کے علماء حضرات کو خطوط لکھے تا کہ وہ یہاں آ کر اپنے اپنے علم کی روشنی میں عدالت کی راہنمائی کر سکیں۔ مولانا محمد صادقؒ نے ان خطوط کو فرداً فرداً پہنچانے کا کام بے حد عمدگی سے انجام دیا۔

جناب مسعود حسن شہاب دہلویؒ اپنی کتاب مشاہیر بہاولپور میں رقمطراز ہیں جناب مولانا غلام محمد گھوٹویؒ مقدمہ مرزائیت میں پیش پیش تھے جب تک ختمِ نبوت کا دفاع مکمل طور پر نہ کر چکے چین سے نہ بیٹھے۔ حضرت کا دولت خانہ پورے ہندوستان سے آئے علماء حضرات اور سرفروشانِ ختمِ نبوت کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ مہمان نوازی کمال عروج پر تھی جو کہ حضرتؒ کا خاندانی وصف تھا رات بھر اجتماع رہتا، کتابیں کھلی رہتیں، تحقیق کا سلسلہ جاری رہتا۔ صبح ہوتے ہی علما کا یہ قافلہ حضرتؒ کی سرپرستی میں نعرۂ تکبیر کی گونج میں عدالت کی طرف روانہ ہو جاتا۔

مقدمہ مرزائیہ کی سماعت مسلسل تین ماہ تک جاری رہی، اس دوران مجاہد اعظم حضرت شیخ الاسلامؒ ہر دم متحرک رہے فیصلہ ہونے تک کسی پل بھی چین نہ کیا اور ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ کرتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی اور 7 فروری 1935ء تک آپؒ نے ایک پل بھی چین سے نہ بیٹھے۔ دوسری طرف فریق مخالف کی طرف سے مقدمہ مرزائیہ کی پیروی کے سلسلے میں جلال الدین شمس اور غلام احمد مجاہد پیش ہوتے رہے۔

جبکہ اہلِ اسلام کی طرف سے جن علماء نے بیان ریکارڈ کرائے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

1) حضرت مولانا غلام محمد محدث گھوٹویؒ شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ بہاولپور آپ کا بیان 21 جون 1932ء کو ہوا۔ آپ نو سال تک عدالتوں میں پیش ہوتے رہے اور آخر کار فاتح قرار پائے۔
2) حضرت مولانا ابو قاسم محمد حسینؒ گوجرانوالا
3) حضرت مولانا محمد شفیعؒ مفتی مدرسہ دیوبند بھارت آپ کا بیان 21 اگست 1932ء کو ہوا۔
4) حضرت مولانا مرتضیٰ حسنؒ چاند پوری بھارت آپ کا بیان 21 اگست 1932ء سے لے کر 25 اگست 1932ء تک ہوا۔
5) حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ آپ کا بیان 25 اگست سے 29 اگست 1932ء تک ہوا۔ آپ نے سترہ دن تک بہاولپور میں قیام فرمایا، آپ نے 29 مئی 1933ء کو وفات پائی۔

6) حضرت مولانا نجم الدینؒ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور آپ کا بیان 30 اگست سے لے کر 31 اگست 1932ء تک ہوا۔

مدعا علیہ عبدالرزاق مرزائی مقدمہ مرزائیہ کا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے ہی مورخہ 10 نومبر 1934ء کو اچانک وفات پا گیا یا مرزائیوں نے موت کی نیند سُلا دیا مرزائی فرقہ نے اس کی موت کا بہانہ بنا کر مورخہ 4 دسمبر 1932ء کو عدالت میں درخواست دائر کر دی کہ مدعا علیہ فوت ہو گیا ہے۔ اس لیے اب فیصلہ صادر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لہٰذا مہربانی فرماتے ہوئے مقدمہ ہذا کی تمام مِثل داخل دفتر کر دی جائے۔

مگر حضرت شیخ الاسلام محدث گھوٹویؒ نے عدالت کی راہنمائی فرماتے ہوئے جواب داخل کیا اور نظائر پیش کر کے ثابت کیا کہ ایک فریق یا دونوں کی موت کے باوجود فیصلہ صادر کرنا از روئے قانون عدالت پر لازم ہے۔ بوجہ اس کے یہ مقدمہ بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔ سارے عالمِ اسلام کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو چکی ہیں، کیونکہ اس مقدمہ کے ذریعے فیصلہ ہو گا کہ آیا ختمِ نبوت کا عقیدہ ضروریات دین اور اساس ہائے ایمان میں سے ہے یا نہیں؟ اور اس عقیدے کے منکر کے ساتھ اہلِ اسلام کے کسی فرد کا نکاح کر دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس لیے یہ مقدمہ کسی آپ ایک فرد کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام کو اس فیصلہ کی ضرورت ہے۔

شکر خدائے ذوالجلال کہ عدالت نے حضرت شیخ الاسلامؒ کے دلائل کو دُرست قرار دیا اور 7 فروری 1935ء کو محمد اکبر خانؒ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے اس تاریخی مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا" ختم نبوت کے منکر کو خارج از اسلام اور مسلمان خاتون کے ساتھ اس کے نکاح کو فسخ قرار دے دیا۔ الحمدُ اللہ رب العالمین۔

تمام عالمِ اسلام بشمول عوام الناس پاکستان اور ریاست بہاولپور نے بے حد خوشیاں منائیں اور ہم سب بحیثیت مسلمان اپنے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلام ہیں اور اپنے آقاؐ کی غلامی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ (آمین)۔

پروازی مندرجہ بالا تمام حالات و واقعات سے تم بہت اچھی طرح واقف ہو اور ان سب واقعات کا آپ کے پاس کوئی جواب بھی نہ ہے۔ اپنے گریبان میں جھانکو، اپنی مُرتدانہ روش کو چھوڑو، میں تمہیں دعوت اسلام دیتا ہوں۔ آپ نبی ﷺ کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں پہنو۔

میرا پیغام نوجوان نسل کے نام

مندرجہ بالا حالات وواقعات کئی کتب میں پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔مگر آج کی نوجوان مسلمان نسل کو ان تمام حالات وواقعات کا قطعی علم نہ ہے اور نہ ہی ہمارے علماء حضرات نے ختمِ نبوت رسالت مآب ﷺ کی اہمیت نوجوان نسل پر واضح کی ہے۔نہ ہی ان میں ناموسِ رسالت کے علم کو جاننے کا ذوق وشوق پیدا کیا ہے۔ میں اپنے اس آرٹیکل کو اپنی نوجوان نسل کے نام کرتا ہوں اور ان سے درخواست کرتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین ہیں، سردار الانبیاء اور خاتم المرسلین ہیں۔

کچھ لوگ کٹر قسم کے مذہبی رجحان تو رکھتے ہیں اور ملا حضرات کی چیختی چلاتی اور چنگھاڑتی روایتی سی تقریریں سن کر بہت متاثر بھی ہوتے ہیں اور مسلمان ہونا تو بڑی بات ہے وہ صرف مسلمان نظر آنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ غلطی بھی نہ تھی مگر دل تھا کہ مان ہی نہ رہا تھا۔ کچھ مسالک ایسے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل دور میں عالمِ وجود میں آئے 1962ء, 1953ء, 1943ء,1936ء,1926ء کچھ مذاہب انگریزوں نے بنائے تاکہ اسلام کو اسلام کے نام پر ہی کشتِ خون کرا کر ختم کر دیا جائے۔ ان کی اس چال نے مذہبی بھیڑیے پیدا کیے جن کے عمل سے اسلام اور پاکستان کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی ان کو فساد فی سبیل اللہ قرار دیا۔ یہاں تک بھی غور طلب بات ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے دور میں کوئی مسلک نہ تھا نہ شیعہ نہ ہی سنی؟ آج کل ملک میں کئی اسلام رائج ہیں ایک اصل اسلام اپنی روح کے ساتھ جو نبی کریمؐ کے فرمان کے مطابق ہے۔ دوسرے اسلام اپنے اپنے مسالک کے مطابق ہیں۔ مرزائیت جس کی ایک روداد بحوالہ میرے پیارے شہر بہاولپور کے پسِ منظر میں تحریر کی گئی ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل کو اپنے اسلاف کے کارناموں اور خدمات سے باخبر رکھا جائے۔ جب میں نے نوجوان نسل کے لیے اس کو لکھنے کا ارادہ کر لیا تو میرے دل اور دماغ کو بہت تقویت ملی اور سب پڑھا لکھا یاد آ گیا کہ

1۔ ہمارا رب تو رب العالمین ہے۔

2۔ قرآن پاک رحمت المسلمین ہے۔

3۔ حضرت محمد ﷺ رحمت اللعالمین ہیں۔

میں پھر عرض کرونگا کہ مولویوں کی چیختی، چنگھاڑتی اور دھاڑتی آوازوں میں اپنے مسلک کو صحیح اور دوسرے مسلک والوں کو کافر قرار دینا۔ روزمرہ کا معمول کسی بھی تنقید پر کسی کو بھی کافر قرار دینا انکے لیے

معمولی بات ہے۔سعودی عرب، ایران، اسرائیل، انگلینڈ اور دیگر ایجنسیوں کے مالی تعاون پر پلنے والے یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے اسلام اور فرمان کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔

جس سے بوجہ غم اور فکر دل و دماغ کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں اس قسم کے عالم پیدا کرنے کے لیے خاص ٹریننگ سینٹر مسجدوں کی شکل میں بنائے گئے ہیں جو کہ بے حد خفیہ رکھے جاتے ہیں۔ وہاں سے جعلی عالم بن کر جو لوگ ملکِ عزیز میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں اس کے نتیجے میں کشتِ خون ہوتا ہے۔لوگ کافر قرار دیئے جاتے ہیں۔ مسالک کا بہت ہی نازک مسئلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ایک دوسرے کی نماز کو غلط قرار دیا جاتا ہے۔اللہ کے گھر کے باہر لکھا ہوتا ہے کہ یہ مسجد فلاں مسلک کی ہے کئی جگہ لکھا دیکھا گیا ہے کہ بغیر داڑھی والے حضرات اس میں نہ آئیں وغیرہ وغیرہ۔اس جہالت کو دیکھ کر دلی اور ذہنی کیفیت بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے اور ہوئی بھی؟ انہی اختلافات اور غلط روش کی وجہ سے غیر مسلم اور مُرتد فائدہ اُٹھاتے ہیں۔اللہ سبحان وتعالیٰ کے واسطے کچھ تو خیال کریں۔

دوپہر تک بِک گیا شہر کا سارا جھوٹ
اور میں سچ لیے شام تک بیٹھا رہا۔

کتابیات

1۔ شخصیت وافکار از شیخ الاسلام محدث مولانا غلام محمد گھوٹویؒ
2۔ فرشتے کی FIR از ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب
3۔ رُموزِ اوقاف از پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عارف
4۔ ڈھلتے سائے از منیر الدین احمد
5۔ پس نوشت چہارم از ڈاکٹر پرویز پروازی
6۔ خزائین الادویہ جلد نمبر 1 تا 6 از علامہ محمد نجم الغنی رام پوری
7۔ فخر العلاج جلد اول ودوئم از شمس الاطباء حکیم وڈاکٹر غلام جیلانی خان
8۔ پریکٹس آف میڈیسن (تاج الحکمت) از ڈاکٹر کلیم ہری چند ملتانی
9۔ کنز المجر بات از استاد الحکما حکیم محمد عبداللہؒ
10۔ تاج العقاقیر جلد 1 تا 10 از ڈاکٹر حکیم ہری چند ملتانی گولڈ میڈلسٹ میڈیکل ریسرچ سکالر
11۔ المخرات من القلق الی الاسبتقا د ڈاکٹر محمد محمد الھواری (قطر)
12۔ لا ثانی لغات الادویہ از پنڈت ٹھاکر داس شرما
13۔ میڈیکل گائیڈ از ڈاکٹر عزیز الرحمٰن
14۔ صحت زندگی از خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی انڈیا
15۔ دیہاتی معالج حکیم محمد سعیدؒ بانی ہمدرد یونیورسٹی۔ ہمدرد فاؤنڈیشن۔ کراچی
16۔ مزاج العلاج از حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی خان
17۔ آبِ حیات از مولانا محمد حسین آزاد
18۔ آثار الصنادید از سرسید احمد خان
19۔ تحفۃ المومنین از حکیم مومن خان مومن
20۔ تُزک جہانگیری از شہنشاہ جہانگیر
21۔ اغذایہ از جالینوس

22۔ خوابوں کی جنت از بودلیئر (Bavdelaire)

23- Foods Those are Killing you slowly but steadily by K.M.Guptta

24- Punjab Castes by Sir Denzil Abbetson

25- Home Remedies by Dr. K.H. BAKRO

مصنف کی دیگر تصانیف

فرشتے کی ایف آئی آر (حصہ اول)　　(سال اشاعت 2011ء)

مصنف کی زیر تصنیف کتب:

1۔ فرشتے کی ایف آئی آر　　(حصہ دوئم)
2۔ سفرنامہ افریقہ　　(نام زیر تجویز ہے)
3۔ حسینائیں
4۔ Angel in Hell

تعارف کتاب

فرشتے کی ایف آئی آر (حصہ اول 2011) از ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

فرشتے کی ایف آئی آر، آٹو بائیوگرافی کے میدان میں نام سے لے کر اسلوب، پیشکش کتاب میں موجود چلتے پھرتے، گرتے پڑتے، چہکتے مہکتے، چیختے چلاتے، ہانپتے کانپتے، منفرد بلکہ مافوق الفطرت کرداروں سے براہ راست شرفِ ملاقات کا نا صرف موقع فراہم کرتی ہے بلکہ ان افسانوی کرداروں سے مل کر اپنی کہی ہوئی بات کی تصدیق کا کھلا چیلنج بھی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ مصنف ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی زندگی ہما ہمی، رنگا رنگی اور جہدِ مسلسل سے اٹی پڑی ہے۔ جہاں تگ ودو کا تسلسل جمالیاتی حس کے ساتھ موجود ہو تو وہاں ہر شے میں رومان اور رومانوی حقائق افسانہ در فسانہ اور کبھی یہی واقعات ایک حقیقت ایک افسانہ بن کر اپنا جاہ وجلال لیکن کمال کی بلندیوں کے ساتھ دیکھی اور پرکھی جاسکتی ہیں۔ آج ان سے مختصر ملاقات حبس زدہ موسم میں تازہ ہوا کا جھونکا بن کر ہمارے ذہن کے پھیپھڑوں کی سیچوریشن کو خوشگوار بنانے کا موجب بنی۔

معروف اور منفرد اسلوب سے مزین خودنوشت کے مصنف، ادیب ودانشور ڈاکٹر ادریس آفتاب نے اپنے چیدہ احباب کے اعزاز میں نہایت دلفریب، دل نشیں ودلکش، قدرت کی صناعی سے آراستہ ماحول میں پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا تو اس دلفریب ماحول کو کیمرہ کی یاداشت میں پرونے میں خواجہ صابر نے چپکے چپکے کوشش کر ڈالی۔ بصورت دیگر یہ دل ہی میں رہ جاتا۔ فی زمانہ فقط دوستوں کو اکٹھا کر لینا ہی ایک معرکہ کہلائے گا اور جو انداز ہمارے نہایت شفیق اور محبتوں کے امین زندہ دل دوست ڈاکٹر ادریس آفتاب کر گزرتے ہیں وہ پٹھانوں کی روایتی تاریخی مہمان نوازی سے بھی آگے بہت آگے کی روشن مستقبل بینی ہی کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ہم سب اپنے اپنے بکھیڑوں میں اس قدر کھب چکے ہیں بلکہ گوڈے گوڈے دھنس چکے ہیں کہ اگر ادریس آفتاب و ماہتاب جیسے دو چار نا ہوں تو یہ سسکتی، ہچکیاں کھاتی روایات اب تک دم توڑ چکی ہوتیں۔ ڈاکٹر ادریس آفتاب کے سینہ میں اللہ کا بنایا ہوا زندہ وجاوید دل دھڑکتا ہے۔ ان کا خون معاشرہ کی خوشیوں پہ جھومتا بھی ہے اور منافقوں کے بازار میں کڑھتا بھی ہے۔ وہ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت

بھی رکھتے ہیں کھلی آنکھ سے دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند نہیں کرتے۔

خودنوشت " فرشتے کی ایف آئی آر" کے مصنف ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب نے گزشتہ شب مثلِ بہشت اپنی قیام گاہ جسے برملا طور پر باغِ عدن بھی کہا جا سکتا ہے، میں احباب کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں میرے یعنی ڈاکٹر محمد شہزاد کے علاوہ ڈاکٹر سہیل بلوچ، ڈاکٹر ذوالفقار رحمانی، ڈاکٹر شیر زمان، ڈاکٹر شوکت مامون سمیت کچھ اور معالجین اور دو تین افسران نے لذت کام و دہن کے ساتھ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب صاحب کی دل نشیں گفتگو سے حظ اٹھایا۔ انہوں نے اپنی آئندہ آنے والی کتاب کے کچھ مندرجات بھی بیان کیے۔ ڈاکٹر ادریس کی یہ کتاب اختتامی ابواب میں ہے جوں ہی یہ تکمیل کو پہنچے گی اسے زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کے لیے پریس بھیج دیا جائے گا۔ یہ کتاب ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ متصور ہو گی۔ کیونکہ اس میں ڈاکٹر ادریس کے وہ تجربات، مشاہدات اور اسفار ہیں جو ان کی پہلی تصنیف میں شامل نہیں۔ احباب کو اس کتاب کا شدت سے انتظار ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا

تعارف کتاب

جادونگری میں اذان (2021) از محمد اکبر خان اکبر

میرے لہجے میں جی حضور نہیں ہوتا
اس کے علاوہ میرا کوئی قصور نہیں ہوتا

جناب محمد اکبر خان اکبر کی تصنیف ''جادونگری میں اذان'' بذریعہ پوسٹل سروس موصول ہوئی۔ کتاب جاذبِ نظر ہے۔ مناسب کاغذ پر فیروزسنز لمیٹڈ لاہور سے شائع کی گئی ہے۔ ٹائٹل معنی خیز اور بدھ مَتی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ کتاب کی پشت پر مصنف کا مختصر تعارف مع تصویر موجود ہے۔

کتاب کے پہلے صفحے پر مصنف نے اپنے دستِ قلم سے میری تعریف میں چند جملے لکھے ہیں جو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ میں موصوف کا بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ میں اس قابل بھی ہوں۔ جب خود سے ان القابات کے بارے میں سوال کرتا ہوں تو جواب نفی میں ملتا ہے۔ جناب محمد اکبر خان اکبر سے پہلی بالمشافہ ملاقات ان کے دورہ بہاولپور کے دوران ہوئی۔ وہ اپنی اہلیہ محترمہ اور بہت پیارے بچوں کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ اُن سے پہلے بلوچستان میں باوجود خواہش وحسرت میرا کسی سے دوستانہ نہیں تھا۔ میں ان سے بہت چاہت سے ملا۔

جناب اکبر خان اکبر ایک شریف النفس، سادہ طبیعت اور بے لوث انسان ہیں۔ بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں رہنے کے باوجود علم دوست، مہذب اور اُردو ادب کے شیدائی ہیں۔ چٹانی لہجے کے باوجود نرم دل اور دل آویز شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا سفر نامہ ان کی شخصیت کی سادگی، شرافت اور نفاست کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

''جادونگری میں اذان'' بہت منفرد، ذومعنی اور پرکشش الفاظ میں لکھی گئی ہے۔ یہ سفر نامہ سری لنکا کی پوری تاریخ وجغرافیہ پر مبنی ہے اور قاری کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لیے پھرتا ہے۔ مساجد کا ذکر جگہ جگہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ مصنف بھولے سے بھی کولمبو کے ڈاؤن ٹاؤن میں نہیں گیا اور نہ ہی وہاں کی بودوباش کا ذکر کیا۔ دنیا کے قدیم ترین بزنس، آدم کی پہاڑی، انگریز، ولندیزی اور پرتگالی اپنی اپنی تہذیب کے جواَن مِٹ نشان چھوڑ کر گئے ہیں اُن کے اچھے برے اثرات کا ذکر بھی نہیں ہے۔ جافنا اور ہمسایہ ملک کی شاطر چالوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں جو احسانات پاکستان نے سری لنکا پر کیے ان کا بھی سرسری ذکر ہونا چاہیے تھا۔

قاری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ سری لنکا کی حسیناؤں کا ذکر بالکل نہیں کیا حالانکہ سری لنکا میں برگِ گل جیسے ہونٹوں کی مالک حسینائیں جن کے قاتل خمِ ابرو، شبِ ہجر جیسے لمبے بال، آنکھوں کی چمک جیسے کندن میں نگینے جڑے ہوں، گلے میں ایسے بانہیں ڈالیں جیسے عشقِ پیچاں کی بیل لیکن بے مروتی طوطے کی آنکھ جیسی۔

جناب اکبر خان اکبر نے اپنی پوری تصنیف میں انگریزی کا ایک بھی لفظ استعمال نہ کر کے اُردو کی لاج رکھ لی۔ گو کہ اُردو ایک لشکری زبان ہے جو کئی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اب اس میں ایک اور زبان کا اضافہ ہو گیا جو انگلش کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ مگر مصنف اس کی پروانہ کرتے ہوئے اس کو شکست دیتے ہوئے آگے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ بے حد نپے تلے الفاظ میں اس کتاب کو ایک منفرد انداز عطا کیا ہے جس سے اکبر خان اکبر کی مہارت، اُردو شناسی اور شریف النفسی کا معیار مزید بلند ہو گیا۔

آخر میں عوام الناس کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ یہ ایک نہایت ہی informative سفر نامہ ہے۔ اسے ضرور پڑھیے۔

بقول شاعر:

کس قدر مشکل ہے یہ زندگی کا سفر
خدا نے مرنا حرام کیا لوگوں نے جینا

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

eenets@yahoo.com